اللہ اکبر

خدا کی خدائی کا نغمہ، خدا کی عظمت کا بیان

مولانا وحید الدّین خاں

اللّٰہ اکبر

خدا کی خدائی کا نغمہ، خدا کی عظمت کا بیان

مولانا وحید الدّین خاں

Goodword Books

First published 1986
This ediditon published 2025
This book is copyright free

English version: *Living in God's Glory*

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, Delhi NCR, India
Tel. +91 120 4131448, Mob. +91 8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, India
Mob. +91-9999944119
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Center for Peace and Spirituality USA
2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA
Cell: 617-960-7156
email: kkaleemuddin@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

خدا کا وجود

خدا کو پانے والا 8
خدا کا وجود 9
عجیب کرشمہ 10
خدا کا عقیدہ 11
خدا سب کچھ 13
خدا کی موجودگی کا تجربہ 14
خدا کا ثبوت 16
کائناتی مشین 17
کائناتی وحدت 18
فطرت کی پکار 19
کائنات مشین نہیں 20
معبود کی طلب 22
خدا کی تلاش 23
توہم پرستی 24
مشینی تعبیر 26
خدا کا بندہ 27
فطرت کی تصدیق 28
خدا کی نشانیاں 30
خلائی تہذیب 31
یہ ماہرین 32
محبت کا نذرانہ 33
قیمت جو ادا نہیں کی گئی 35
قومی ہیرو 37
فطرت کی تلاش 38
یہ انسان 39

خدا کی عظمت

شرک اور کبر 44
عقیدۂ خدا 45
عظمت خداوندی 46
کارخانہ کائنات 48
تقویٰ کیا ہے 49
خرابی کی جڑ 51
خدا سے غافل 52
تضاد ختم ہو گیا 53
خدا کی نشانیاں 55
قدرتی مناظر 56
شناختی کارڈ کے بغیر 58
جب پردہ اٹھے گا 59
جھوٹی بڑائی 60
خدا کی نشانی 62
خدا کا فیضان 63

خدا اور فطرت

دینِ فطرت 66
کائنات کی معنویت 67
انسان کی بے چارگی 68
انسان کی تلاش 69
انسان کی کمائی 71
کچھ سے کچھ 72
محرومی 73
یہ بھی ممکن ہے 74
عجز کی تلافی 76
کائناتی نمونہ 77
ضمیر کے خلاف 78
اژدہا بھی 80
خدا پرستی 81
زندگی کا مسئلہ 82
زلزلہ درکار ہے 83

خدا کی معرفت

خدا کی یافت 86
معرفت 87
توحید اور شرک 88
دریافت 89
سب کچھ عجیب ہے 91
خدا سے نسبت 92
حق کی پہچان 94
پانے والا 95
دریافت کی لذت 98
سچائی کو پانے والا 99
گروہی اعتراف 100
حق کو پانا 102
خدا کو پانے والے 103
انکشاف خداوندی 105
ایمان میں اضافہ 106
ہر چیز عجیب 107
نفی ذات 109
اللہ کا ذکر 110
کھونے والا پاتا ہے 111

خدا کا فیصلہ

فیصلہ کے دن 114
اس دن کیا ہو گا 115
دولت کا فریب 116
گھاٹے والا 117
انسان کا المیہ 119
موت کا حملہ 120
پانچ سکنڈ کا فاصلہ 121
ناتمام کہانی 122
موت کو یاد کرو 124
جب موت ذہنی طلسم کو توڑ دے گی 125
ساٹھ کیلومیٹر 127

کیسا عجیب 128
موت کا مرحلہ 130
موت کے دروازے پر 131
سب سے بڑا بھونچال 133
موت ہر چیز کو باطل کر دے گی 134
کل کو یاد رکھیے 136
آہ یہ انسان 138
زبان والے بے زبان ہو جائیں گے 139
کیسا عجیب 140
جب حقیقت کھلے گی 142

خدا اور آخرت

چھوڑنے کے لیے 146
کہاں سے کہاں تک 147
قریب مگر دور 149
دنیا کی حقیقت 150
بے خبر انسان 151
انسان ذمہ دار وجود ہے 153
انسان کا المیہ 154
چالیس سال بعد 156
31 دن کے لیے 157
سب سے بڑی خبر 158
کل کو جانیے 160
آنے والا طوفان 162
اس وقت کیا ہوگا 163
نامعلوم مستقبل 165
الٹا رُخ 166
انجینئرنگ کافی نہیں 167
دنیا اور آخرت 169
کچھ کام نہ آئے گا 170
ہر طرف فریب 172
کامیابی کی فہرست 174
چھت گر پڑی 175
خدا کی دنیا 177
خدا کی دنیا 178
ہم خدا کے ملک میں ہیں 179
ایک موت 181
زندگی کا انجام 182
کہاں سے کہاں 183
یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں 185
زیادہ نازک 186
خدا سے ڈرو 188
کائنات بیان دے گی 189
کیسی عجیب محرومی 191
سب چلے گئے 192
21 واں منٹ 194
آرزوؤں کی دنیا 195
ہر چیز میں سبق 196
خرچ سے اضافہ 198
جب پردہ کھلے گا 199
جھوٹی عظمت 201

خدا اور انسان

آنے والا دن 204
عجیب یادگار 205
یہ سونے والے 206
خدا اور انسان 208
انسان کی غلطی 209
انسان کی تلاش 211
دو قسم کی روحیں 212
مقبول بندے 214
خوراک 215
کم سمجھنا 216
خدا سے بغاوت 218
اہلیت 219
پانے کے باوجود محروم 220
امتحان گاہ 223
قانون کی حد 224
دلیل اور شخصیت 226
کائنات کا دسترخوان 227
صرف "کرنا" کافی نہیں 228
الفاظ کم ہو جاتے ہیں 230
امتحان 232
کوئی فرق نہیں 233
پچپن سال کے بعد 234

خدا کی عبادت

پرستش کیا ہے 238
اللہ سے ڈرنے والے 239
دین داری 241
محسوس پرستی 242
محبت کا نذرانہ 244
خدا کی نصرت 245
دل کا سکون 246
شکر کی اہمیت 248
خدا کی یاد 249
مومن کا ذہن 250
خدائی کارخانہ 252
صبر کا بدلہ 253
جنت والے 254
اپنا احتساب 256
ثواب 257
نمائشی حق پرستی 259
زندہ قبرستان 260
اسم اعظم کیا ہے 261
جھوٹی دھوم 263
لطیف تجربات 265
دعا 266

خدائی اخلاقیات

کائنات کی شاہراہ 270

حسن سلوک 271
سرسبز درخت 272
چڑیا اور انسان 273
جنت صبر کے اُس پار ہے 275
عمل کا فرق 276
پلاسٹک کے پھل اور پھول 277
دونوں ایک سطح پر 279
جانور سے بدتر 280
امتحان کا کام 281
عمل کے بغیر 283
دنیا کی خاطر عمل کرنے والے 284
شکار کرنے والے 286
دو قسم کے انسان 287
آپریشن 288
یہ جہنمی قافلے 290
دوسرے درجہ پر 291
دو قسم کی غذائیں 293
خدا کی قدرت 294

خدا کی طرف سفر

جب سفر ختم ہوگا 298
25 واں گھنٹہ 299
آخری منزل 300
موت کے دوسری طرف 302
آخرت تک جانا ہے 304
موت کی طرف 305
موت سے قریب 307
قبر نہیں دروازہ 309
موت کا سبق 310
زندگی کا سفر 311
کیسا عجیب 313
جنازہ کو دیکھ کر 314
روپیہ سے راکھ تک 315
جہنم کا خطرہ 316
گڑھے میں پاؤں 318
کتنا سنگین 319
الفاظ ختم نہیں ہوتے 320
آہ کس قلم سے لکھا جائے 322

خدا کا قانون

قانون کی زد 326
خدا کی دنیا میں 327
تولے جانے سے پہلے تول لو 328
آج بونا کل کاٹنا 329
موجودہ دنیا ناکافی 331
عقیدۂ آخرت 332
راکھ کی گواہی 334
انسان کا المیہ 335
موت کے آگے 336
عقل مند کون 338
ناکام موت 339
کوئی بچا نہ سکے گا 340
رات کے بعد دن 342
سب سے بڑا فریب 343
آخرت کے بغیر 344
جاننے کے بعد 346
آزمائش کا قانون 347
موت جب آتی ہے 348
یہ بے قیمت انسان 350

خدائی منصوبہ

خدا کا منصوبہ 353
مستقبل کا یقین 354
حقیقت انسانی 355
یہ تضاد کیوں 356
کائناتی منصوبہ بندی 358
تخلیق کی حکمت 359
زندگی کا اسٹیج 360
اندھیرا ختم ہوگا 362
تاریکی میں سفر 363
دونوں ایک سطح پر 364
حادثات کیوں 366
حقیقت سے بے خبری 367
ظاہر فریبی 368
تضاد فکری 371
کائنات کو پڑھیے 372
معیاری دنیا 373
غلط استعمال 374
کامیاب زندگی 376
امتحان 377
دو قسم کے بیج 378
اگلا پیراگراف 379

خدا کی پکار

خدا کا داعی 382
کرنے کا کام 383
مقبولیت کا راز 384
داعی کون 385
داعیانہ اخلاق کی ضرورت 386
رہنما کی ضرورت 388
داعی بننا 389
غلط فہمی 391
حق کی دعوت 392
آخرت کی پکار 393
نازک سوال 395
داعی بننے کے لیے 396
حق کی پکار 397
یہ انسان 399

خدا کا وجود

خدا کو پانے والا

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی زلزلہ خیز دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو ہلا دیتی ہے۔

وہ ایک ناقابل بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے۔ وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ نئے رخ پر چلنے لگتی ہے۔ اس کا عمل کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے۔ اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو دیکھ لے۔ جو قیامت کی ترازو کھڑی ہونے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت کی ترازو پر کھڑا ہوا محسوس کرنے لگے۔

مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن پر جو کچھ قیامت میں گزرنے والا ہے وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ غیر مومن جو کچھ آخرت میں دیکھے گا وہ مومن اسی دنیا میں دیکھ لیتا ہے۔ غیر مومن کل کے دن جو کچھ مجبور ہو کر مانے گا اس کو مومن آج کے دن کسی مجبوری کے بغیر مان لیتا ہے۔

خدا کا وجود

خدا کے وجود کا سب سے بڑا ثبوت انسان کا خود اپنا وجود ہے۔ خدا جیسی ہستی کو ماننا جتنا مستبعد ہے اتنا ہی مستبعد یہ بھی ہے کہ انسان جیسی ہستی کو مانا جائے۔ اگر ہم ایک انسان کو مانتے ہیں تو ایک خدا کو ماننے میں بھی ہمارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے انسان کے اندر اپنی روح پھونکی (الحجر، 15:29)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کی صفات کا ایک بشری نمونہ ہے۔ وجود، زندگی، علم، قدرت، ارادہ، اختیار اور دوسری صفات کمال جن کا حقیقی مظہر صرف خدا کی ذات ہے۔ ان کا ایک عکس (نہ کہ حصہ) انسان کو ودیعت کیا گیا ہے۔ انسان کسی بھی اعتبار سے خدا کا جزء نہیں مگر وہ اپنی ذات میں اس خدا کی محسوس دلیل ہے جس کو غیبی طور پر ماننے کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کے اندر وہ ساری خصوصیات شہود کے درجہ میں موجود ہیں جن خصوصیات کے ساتھ ایک خدا کو غیب کے درجہ میں ماننے کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

انسان کا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ دیکھنے اور سننے اور بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے اور منصوبہ بناتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادہ کے تحت حرکت کرتا ہے۔ وہ مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعہ خلائی مشین کو چلاتا ہے۔ وہ اپنی ذات کا شعور رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "میں ہوں" انہیں صفات کی کامل ہستی کا نام خدا ہے۔

انسان اور خدا میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا وجود غیر حقیقی ہے اور خدا کا وجود حقیقی۔ یہ مخلوق ہے اور وہ خالق۔ یہ محدود ہے اور وہ لامحدود۔ یہ بے اختیار ہے اور وہ بااختیار۔ یہ فانی ہے اور وہ غیر فانی۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ عطیہ ہے جب کہ خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کا ذاتی ہے، وہ کسی دوسرے کا دیا ہوا نہیں۔

انسان کو ماننا بلاتشبیہ "چھوٹے خدا" کو ماننا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے وہ "بڑے خدا" کو نہ مانے ہر شخص جو خدا کو نہیں مانتا وہ یقیناً اپنا اقرار کرتا ہے۔ وہ انسانی وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ جو شخص انسان کو مان رہا ہو اس کے لیے خدا کو نہ ماننے کی کوئی دلیل نہیں۔ انسان کے وجود کا اقرار کر کے وہ خدا کے وجود کا بھی اقرار کر چکا ہے، خواہ وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کا انکار خود اپنا انکار ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنا انکار کر سکے۔

عجیب کرشمہ

انسان کا جسم چند مادی چیزوں سے مل کر بنا ہے پانی، کاربن، آکسیجن اور کچھ مزید کیمیائی عناصر۔ ظاہری تجزیہ کے اعتبار سے انسان بس اسی قسم کی چند چیزوں کا مجموعہ ہے۔ رابرٹ پیٹیسن (R. Pattison) نے انسانی جسم کے ان مادی عناصر کا حساب لگایا تو اس نے پایا کہ بازار کی شرح کے لحاظ سے ان کی کل قیمت ساڑھے چھ ڈالر ہے یعنی ہندستانی سکہ میں تقریباً ستر روپیہ۔

مگر اسی "ستر روپیہ" کے سامان سے اللہ تعالیٰ نے ایسا انمول آدمی بنایا ہے جو اتنا قیمتی ہے کہ سکہ میں اس کی قیمت مقرر نہیں کی جاسکتی۔ ستر کھرب روپئے بھی ایک انسان کی قیمت نہیں ہو سکتے۔

انسان کے انتہائی قیمتی ہونے کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا کوئی عضو اس سے چھن جائے۔ انسان کا ایک ہاتھ کٹ کر اس سے جدا ہو جائے تو اربوں ڈالر ادا کر کے بھی دوبارہ ویسا ہاتھ اس کو نہیں مل سکتا۔ انسان کی آنکھ اگر بے نور ہو جائے تو ساری دنیا کی دولت بھی اس کو وہ آنکھ نہیں دے سکتی جس سے وہ دوبارہ دیکھنے لگے۔ انسان کی زبان اگر جاتی رہے تو کوئی بھی قیمت ادا کر کے وہ بازار سے ایسی چیز نہیں پا سکتا جس سے وہ بولے اور اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔

کیسی عجیب ہے خدا کی کاریگری کہ وہ بے قیمت چیزوں سے انتہائی قیمتی چیز بناتا ہے۔ وہ مردہ چیز کو زندہ چیز میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ بے شعور مادہ سے باشعور مخلوق وجود میں لاتا ہے۔ وہ نہیں سے ہے کی تخلیق کرتا ہے۔

کسی جادوگر کی چھڑی سے ایک پتھر کوئی آواز نکالے تو اس کو دیکھ کر سارے لوگ حیران رہ جائیں گے۔ مگر خدا بے شمار انسانوں کو مادّہ سے بنا بنا کر کھڑا کر رہا ہے۔ اور وہ نہایت بامعنی الفاظ میں کلام کررہے ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر کسی پر حیرانی طاری نہیں ہوتی۔ کیسے اندھے ہیں وہ لوگ جن کو جادوگر کے کرشمے دکھائی دیتے ہیں، مگر خدا کے کرشمے دکھائی نہیں دیتے۔ کیسے بے عقل ہیں وہ لوگ جو جھوٹے کرشمے دکھانے والوں کے سامنے سراپا عقیدت مند بن جاتے ہیں، مگر جو ہستی سچے کرشمے دکھارہی ہے اس کے لیے ان کے اندر عقیدت ومحبت کا جذبہ نہیں امنڈتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر خدا کو پالے تو وہ اس کے کمالات میں گم ہوجائے۔ خدا کے سوا کسی دوسری چیز کا اس کو ہوش نہ رہے۔

خدا کا عقیدہ

میں نئی دہلی میں انڈیا گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ انڈیا گیٹ تعمیر اور سنگ تراشی کا بے حد حسین نمونہ ہے۔ وہ مشاہدہ کی زبان میں بتا رہا ہے کہ انسان کیسی انوکھی صلاحیتوں کا مالک ہے وہ " انڈیا گیٹ " جیسی ایک چیز کو پیشگی طور پر سوچتا ہے۔ وہ اس کا منصوبہ بناتا ہے اور پھر عملاً اس کو وقوع میں لاتا ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اگر تمام ستاروں اور سیاروں اور تمام درختوں اور جانوروں سے کہا جائے کہ وہ ایک "انڈیا گیٹ" بنادیں تو سب مل کر بھی اس کے جیسی ایک عمارت نہیں بنا سکتے۔

یہی دوسرے تمام انسانی واقعات کا حال ہے۔انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کی انتہائی نادر استثنائی خصوصیت ہے۔معلوم کائنات میں کوئی بھی دوسری مخلوق اس قسم کے کام کو انجام نہیں دے سکتی جس کو انسان اپنی عقل اور اپنے ہاتھ پاؤں کو استعمال کر کے انجام دیتا ہے۔خواہ وہ ایک انڈیا گیٹ کو بنانا ہو یا ایک پیچیدہ مشین کو چلانا۔

انسان سے خدا کو یہ مطلوب تھا کہ وہ خدا کی شعوری معرفت حاصل کرے۔وہ اپنی عقل سے خدا کو پہچانے۔اس لیے اس نے انسان کو ایسی ممتاز تخلیق کے ساتھ پیدا کیا۔جس طرح انسان ساری کائنات سے ممتاز ایک ہستی ہے،اسی طرح خدا انسان کے مقابلہ میں ایک ممتاز تر ہستی ہے۔انسان اگر اس فرق پر غور کرے، جو اس کے اور بقیہ کائنات کے درمیان ہے تو اسی پر وہ اس فرق کو قیاس کر سکتا ہے جو اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔خدا اِسی امتیازی فاصلے کی آخری اور انتہائی شکل ہے جس کا آدمی اپنے اور کائنات کے درمیان فاصلہ کے ذریعہ تجربہ کر رہا ہے۔خدا کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا اپنے آپ کو سمجھنا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایک مانی ہوئی چیز کو ماننا ہے۔خدا کو دیکھنا ایک دیکھی ہوئی چیز کو دیکھنا ہے۔انسان جس واقعہ کا ہر آن تجربہ کر رہا ہے۔اسی واقعہ کی توسیع کا دوسرا نام خدا کا عقیدہ ہے۔انسان اس کائنات میں "فل اسٹاپ" نہیں۔پھر اگر کائنات کے آگے انسان کا درجہ ممکن ہے تو انسان کے آگے خدا کا درجہ کیوں ممکن نہیں۔

خدا سب کچھ

ممتاز ریاضی داں سر مائیکل فرانسس اتیا (1929-2019) حال میں بمبئی آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ خدا ایک ریاضی داں ہے۔ خدا کو ریاضی داں قرار دینے کا نظریہ نیا نہیں ہے۔ تقریباً 50 سال پہلے سر جیمس جینس (1877-1946) نے کہا تھا کہ کائنات ایک ریاضی داں کا عمل ہے۔ اس سے بھی صدیوں پہلے فیثا غورث (570BC -495BC) نے کہا تھا کہ تمام چیزیں دراصل گنتیاں ہیں۔ پکاسو کے نزدیک خدا ایک آرٹسٹ ہے۔ اس نے کہا خدا فی الواقع دوسرا آرٹسٹ ہے۔ اس نے زرافہ ایجاد کیا۔ اس نے ہاتھی بنایا۔ اس نے بلی بنائی۔ آئن سٹائن (1879-1955) نے کہا تھا کہ خدا لطیف ہے اور اگرچہ وہ کسی کا بُرا چاہنے والا نہیں مگر وہ بہت ہوشیار ہے:

The distinguished mathematician, Sir Michael Francis Atiyah, who was recently in Bombay, said that "God was a mathematician." The idea of God being a mathematician is not new. About 50 years ago, Sir James Jeans suggested that the universe was the handiwork of a mathematician. And centuries before him, Pythagoras said, "All things are numbers." To Picasso, God was an artist. "God is really another artist," he said. "He invented the giraffe, the elephant, and the cat." Einstein has said that the Lord is subtle and, though not malicious, very clever.

جو شخص بھی کائنات کو زیادہ گہری نظر سے دیکھتا ہے اس کو ایک چیز کا یقینی احساس ہوتا ہے — یہاں کوئی اور ہے جو سب سے بڑا ہے اور خود اس کی اپنی ذات سے بھی۔ ریاضی داں کو کائنات میں ایسی اونچی ریاضی نظر آتی ہے جہاں اس کو اپنی ریاضی بھول جاتی ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدا بہت بڑا ریاضی داں ہے۔ ایک آرٹسٹ جب کائنات کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے تو یہاں اس کو اتنا اعلیٰ آرٹ نظر آتا ہے کہ اس کا اپنا آرٹ اس کی نگاہ

میں ہیچ ہوجاتا ہے۔ اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدا سب سے بڑا آرٹسٹ ہے۔ ایک عقل والا آدمی جب کائنات کی حکمتوں پر نظر ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ یہاں کوئی اور ہے جو تمام عقلوں سے زیادہ بڑی عقل والا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا سب سے بڑا ریاضی داں، سب سے بڑا آرٹسٹ، سب سے بڑا عاقل ہے اور اسی کے ساتھ وہ مزید بہت کچھ ہے۔ جو شخص کائنات میں خدا کے نشان کو نہ دیکھے وہ اندھا ہے اور جو شخص دیکھ کر بھی اس کو نہ مانے وہ مجنون ہے۔

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو 15 (Apollo 15) میں امریکا کے جو تین خلاباز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز ارون (James Irwin) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست 1972 کا وہ لمحہ میرے لیے بڑا عجیب تھا جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's Presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لیے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون 27 اکتوبر 1972)۔

کرنل جیمز ارون کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد وپیش جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہوجاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہوجاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور

چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں سب کا سب حددرجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگرایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا اور پہلی بار وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامہ میں اس کے خالق کوموجود پایا۔ ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں یہاں بھی "خدا کی موجودگی" کا تجربہ اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح چاند پر پہنچ کر کرنل ارون کو ہوا۔مگرلوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگرہم اپنی دنیا کواس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس "خدا کی موجودگی" کا تجربہ ہو۔ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگرہم ایک اعلیٰ درجہ کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینئر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگرہم دنیا کو اوراس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔خالق ہم کو اس طرح نظر آئے گا کہ ہم خالق اور تخلیق کوایک دوسرے سے جدا نہ کرسکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرلے۔اگرآدمی کا احساس زندہ ہوتو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمسِ ربانی کا تجربہ ہوگا۔اپنی ہتھیلی اوراپنی پیشانی کوزمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔خدا ہر جگہ موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہوجائے۔

خدا کا ثبوت

اگر ایک انسان کا وجود ہے تو ایک خدا کا وجود کیوں نہیں ہوا اور پانی ، درخت اور پتھر ، چاند اور ستارے موجود ہیں تو ان کو وجود دینے والے کا وجود مشتبہ کیوں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی موجودگی عمل تخلیق کا ثبوت ہے اور انسان کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک ایسا خالق موجود ہے جو دیکھے اور سنے ، جو سوچے اور واقعات کو ظہور میں لائے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ پھر خدا کو ماننے کے لیے دیکھنے کی شرط کیوں ضروری ہو۔

آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ وہ ستاروں کو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ خالص علمی اعتبار سے یہ صحیح نہیں۔ جب ہم ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ہم ستاروں کو براہ راست نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ستاروں سے جدا ہو کر کروروں سال کے بعد ہماری آنکھوں تک پہنچے ہیں۔

یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز جس کو انسان "دیکھ" رہا ہے۔ وہ صرف بالواسطہ طور پر اسے دیکھ رہا ہے۔ براہ راست طور پر انسان کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ اور نہ ہی اپنی موجودہ محدودیت کے ساتھ کبھی دیکھ سکتا۔

پھر جب دوسری تمام چیزوں کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر مانا جاتا ہے تو خدا کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر کیوں نہ مانا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اتنا ہی ثابت شدہ ہے جتنا کہ اس دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس دنیا کی ہر چیز بالواسطہ دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز اپنے اثرات کے ذریعہ سے پہچانی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی نوعیت خدا کے وجود کی بھی ہے۔

خدا یقیناً براہ راست ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر خدا اپنی نشانیوں کے ذریعہ یقیناً دکھائی دیتا ہے۔ اور بلاشبہ خدا کے علمی ثبوت کے لیے یہی کافی ہے۔

کائناتی مشین

1965 میں دوملکوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ایک کے پاس کمتر ہتھیار تھے۔ دوسرے کے پاس بہتر ہتھیار۔ ایک کے وجینت ٹینک (Vijayant tanks) کے مقابلہ میں دوسرے کا برطانی ساخت کا پیٹن ٹینک (Patton tanks) زیادہ اعلیٰ تھا۔ ایک طرف معمولی نیٹ جہاز تھے اور دوسری طرف فرانسیسی سیبر جٹ (Sabrejet) جو زیادہ طاقت کے ساتھ وار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر بھی اوّل الذکر کے مقابلہ ثانی الذکر ہار گیا۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اوّل الذکر کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے تھے۔ وہ ان کو استعمال کرنے کی پوری مہارت رکھتا تھا۔ جب کہ ثانی الذکر کے ہتھیار بیرونی ملکوں کے بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ثانی الذکر ملک کے سپاہی ان کو مہارت کے ساتھ استعمال نہ کر سکے اور ہار گئے۔

ایک جنگی تبصرہ نگار نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> Even the most sophisticated technology of warfare is handled ultimately by men engaged in the profession of soldiering. Its use in combat depends therefore greatly on their skill, training, morale and ingenuity. The doctrine of the supremacy of the man behind the gun thus remains valid even in this age of push button wars.

جنگ کی انتہائی پیچیدہ مشینری بھی آخر کار متعلقہ فوجی آدمیوں ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہے۔ اس لیے جنگ میں ان کا استعمال بڑی حد تک ان کی مہارت، تربیت، جرأت اور تدبیر پر منحصر ہوتا ہے۔ قدیم اصول کے مطابق بندوق کا استعمال کرنے والے آدمی کی اہمیت آج بھی باقی ہے، حتی کہ اس بٹن دبانے والے دور میں بھی (ٹائمس آف انڈیا، 2 فروری 1984ء)۔

مذکورہ قسم کے واقعات کائنات کی مشینی تعبیر کی تردید ہیں۔ ہماری مشینوں کو چلانے کے لیے ہمیشہ ایک "انسان" درکار ہوتا ہے۔ پھر کیوں کر کہا جا سکتا ہے کہ کائنات کی عظیم مشین کسی چلانے والے کے بغیر چل رہی ہے۔ اس قیاس کے لیے کوئی نظیر موجود نہیں۔ کائنات ایک سائنس داں کے الفاظ میں بالفرض ایک "گریٹ مشین" (Great Machine) ہو تب بھی اس کو چلانے کے لیے ایک "گریٹ مائنڈ" (Great Mind) چاہیے۔ انسان مجبور ہے کہ خدا کو مانے، خواہ مذہبی زبان میں خالق و مالک کی حیثیت سے یا سائنسی الفاظ میں مشین کو چلانے والے انجینئر کی حیثیت سے۔

کائناتی وحدت

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پوری کائنات ایک مرکز کے گرد گھوم رہی ہے۔ ایٹم کا ایک نیوکلیس ہے۔ اور ایٹم کا پورا ڈھانچہ اس نیوکلیس کے گرد گھومتا ہے۔ شمسی نظام کا مرکز سورج ہے اور اس کے تمام سیارے اور سیارچے مسلسل اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اسی طرح کہکشاں کا ایک مرکز ہے اور کہکشاں کے اربوں ستارے اس مرکز کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری کائنات کا ایک مرکز ہے اور پوری پھیلی ہوئی کائنات اپنی ذیلی حرکتوں کے ساتھ اس آخری مرکز کے گرد حرکت کر رہی ہے۔

سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ کائناتی مرکز ایک روز اپنے گرد کی تمام چیزوں کو کھینچنا شروع کرے گا اور پھر یہ ناقابل قیاس حد تک پھیلی ہوئی عظیم کائنات اپنے مرکز کی طرف سمٹنا شروع ہو گی اور بالآخر وہ وقت آئے گا کہ سارے کائناتی اجسام اس طرح سمٹ کر ایک مرکزی گولے کی صورت اختیار کر لیں گے جیسے بکھری ہوئی کیلوں کے درمیان مقناطیس لایا جائے اور سب کیلیں سمٹ سمٹ کر اس سے جڑ جائیں — كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (21:104)۔

اس طرح کائنات گویا دین توحید کا عملی مظاہرہ بن گئی ہے۔ وہ عمل کی زبان میں بتا رہی ہے کہ انسان کی زندگی کو کیسا ہونا چاہیے۔ انسان کی زندگی کو ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا صرف ایک مرکز ہو۔ اور وہ ایک خدا ہو۔ آدمی کے جذبات، اس کی سوچ، اس کی سرگرمیاں، اس کا سب کچھ خدا کے گرد گھومنے لگیں۔

آدمی اگر اپنی زندگی کا مرکز و محور اپنی ذات کو بنائے تو کائنات بزبان حال اس کو رد کر رہی ہے۔ اسی طرح اگر وہ اپنی ذات کے باہر کسی کو اپنی توجہات کا مرکز ومحور بنائے تو موجودہ کائنات کے ڈھانچہ میں وہ قابل رد قرار پا رہا ہے۔ کائنات کا موجودہ ڈھانچہ ایک ہستی کے سوا کسی دوسرے کی مرکزیت کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

کائنات زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ — "ایک" کو اپنا مرکز توجہ بناؤ نہ کہ ایک کے سوا "کئی" کو۔

فطرت کی پکار

برٹرینڈرسل (1872-1970) ایک انگریز مفکر ہے۔ وہ موجودہ زمانہ کا بہت بڑا ملحد سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کی سوانح عمری بتاتی ہے کہ انسان بظاہر خواہ کتنا ہی بڑا ملحد ہو جائے وہ اپنے آپ کو خدائی فطرت سے آزاد نہیں کر سکتا۔

برٹرینڈرسل 1952ء میں یونان گیا۔ اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ یہ یونان کا میرا پہلا سفر تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے لیے بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ ایک پہلو سے تو مجھے خود تعجب ہوا۔ وہ عظیم اور ٹھوس کامیابیاں جن کو دیکھ کر ہر شخص متاثر ہوتا ہے میں بھی متاثر ہوا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے چرچ میں پایا۔ یہ اس وقت کی یادگار تھا جب کہ یونان بازنطینی سلطنت کا حصہ تھا۔ مجھے

سخت حیرانی ہوئی جب میں نے دیکھا کہ اس سے میں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ مانوس پایا جتنا کہ میں یونان کی قبل مسیح دور کی یادگاروں سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ مسیحی نقطہ نظر میرے اوپر اس سے زیادہ غالب ہے جتنا کہ میں نے سمجھا تھا۔ یہ غلبہ عقائد پر نہیں تھا بلکہ میرے احساسات پر تھا:

> To my astonishment,I felt more at home in this little church than I did in the Parthenon or in any of the other Greek buildings of Pagan times. I realised then that the Christian outlook had a firmer hold upon me than I had imagined. The hold was not upon my belief, but upon my feelings. (P.561)

یہ الفاظ اس شخص کے ہیں جس کی ملحدانہ کتابوں میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا نام ہے: میں عیسائی کیوں نہیں (*Why I Am Not A Christian*) حقیقت یہ ہے کہ برٹرینڈ رسل کے الفاظ اس کی فطرت کی پکار ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں خدا اور مذہب کا شعور ابدی طور پر پیوست ہے، وہ چاہے بھی تو اس کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحد اور منکر بھی اندر سے اپنے الحاد وانکار پر غیر مطمئن رہتے ہیں۔ وہ خاص لمحات میں بے تابانہ طور پر اسی چیز کی طرف دوڑ پڑتے ہیں جس کا بظاہر وہ اپنی زبان سے انکار کر رہے تھے۔

کائنات مشین نہیں

موجودہ زمانہ میں مشینی انسان بنائے گئے ہیں جن کو عام طور پر روبوٹ (robot) کہا جاتا ہے۔ روبوٹ بظاہر بالکل آدمی کی شکل کا ہوتا ہے۔ وہ چلتا ہے، وہ بولتا ہے، وہ کام کرتا ہے۔ مگر حقیقتۃً وہ ایک مشین ہوتا ہے نہ کہ کوئی شعور۔ وہ اسی طرح میکانکی انداز میں عمل کرتا ہے جیسے انسان کی بنائی ہوئی دوسری تمام مشینیں۔

لندن کے ایک دفتر میں ایک روبوٹ رکھا گیا تاکہ وہ چپراسی (office boy) کے طور پر کام کرسکے یہ روبوٹ جب تیار ہوکر دفتر میں آیا تو دفتر کی خاتون سکرٹیری مس جینی سیف (Jennie Seff) نے اس کو آزمائشی حرکت (Trial Run) دینا چاہا۔ وہ روبوٹ کی بیٹری جانچ رہی تھیں کہ روبوٹ حرکت میں آ گیا۔ وہ سکرٹیری کے پیچھے چلنے لگا۔ اب یہ صورت ہوئی کہ خاتون سکرٹیری آگے آگے بھاگ رہی ہیں اور آہنی مشین ان کو پیچھے سے دوڑا رہی ہے۔ روبوٹ اس طرح چل رہا تھا گویا اس نے کنٹرول قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں نیا ٹائپ رائٹر ٹکرا کر زمین پر گر پڑا اور ٹوٹ گیا۔ بالآخر بڑی مشکل سے روبوٹ کو قابو میں لایا گیا (ہندستان ٹائمس، 30 جون 1981ء)۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ خدا کو نہیں مانتے ان کا کہنا ہے کہ کائنات اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بہت بڑی مشین ہے۔ وہ بس اسی طرح چل رہی ہے جس طرح کوئی "روبوٹ" میکانکی طور پر چلتا ہے۔ مگر کائنات کا کھرب ہا کھرب سال سے انتہائی منظم طور پر یکساں حالت میں چلنا اس مفروضہ کی تردید کر رہا ہے۔ اگر کائنات محض ایک میکانکی مشین ہوتی جیسے روبوٹ، تو یقیناً اس میں بار بار اسی قسم کے ٹکراؤ ہوتے جیسا کہ لندن کے آفس میں مذکورہ بالا واقعہ کی صورت میں ہوا۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرادی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کرسکتی۔ ہر ایک اپنے خاص دائرہ میں گردش کرتے ہیں (36:38-40)۔ قرآن کا یہ بیان موجودہ زمانہ میں ایک ثابت شدہ انسانی مشاہدہ بن چکا ہے اور یہی واقعہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ یہاں ایک باشعور ہستی ہے جو کائنات کو کنٹرول کر رہی ہے۔ اس کے بغیر کائنات کے اندر یہ تنظیم اور یہ باقاعدگی اتنی کامل صورت میں ممکن نہ ہوتی۔

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف (1929-2004ء) اگست 1962 میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو 21 اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا:

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لیے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لیے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآوری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لیے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لیے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے۔ یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لے نثار کردے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پا کر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہیے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی

مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لیے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لیے۔

خدا کی تلاش

ایک بے حد ذہین شخص تھا۔ وہ مستقل طور پر اسی احساس میں مبتلا رہتا تھا کہ میں زندگی میں اپنے واقعی مقام کو نہ پاسکا۔ بالآخر اس نے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنی خودکشی کی تحریر میں لکھا تھا:

"میں اپنی زندگی کو ختم کر رہا ہوں۔ کیوں کہ میں شاید ایسی دنیا میں بھٹک آیا جس کے لیے میں پیدا نہیں کیا گیا تھا"۔

کمی کا یہ احساس اکثر ان لوگوں کا پیچھا کیے رہتا ہے جو فطرت سے غیر معمولی ذہن لے کر پیدا ہوئے ہوں۔ وہ یا تو مایوسی اور ناکامی کی زندگی گذار کر طبعی موت مرتے ہیں یا خودکشی کر لیتے ہیں۔ کم تر ذہن رکھنے والوں میں ایسے لوگ کافی مل جائیں گے جو بظاہر مطمئن زندگی گذارتے ہوں۔ مگر برتر ذہن رکھنے والوں میں مشکل ہی سے کوئی شخص ملے گا جو مطمئن زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔

اس کی وجہ انسان کی معیار پسندی ہے۔ ہر انسان فطری طور پر آئیڈیل کی تلاش میں ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں آئیڈیل کو پانا اتنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثل بن گئی ہے کہ معیار کبھی حاصل نہیں کیا جاسکتا:

Ideal cannot be achieved

اب ہوتا یہ ہے کہ کم تر درجہ کا ذہن رکھنے والوں میں چونکہ شعور بہت زیادہ بیدار نہیں ہوتا۔وہ آئیڈیل اور غیر آئیڈیل کے درمیان بہت زیادہ فرق نہیں کر پاتے۔وہ اپنے موٹے ذوق کی وجہ سے غیر آئیڈیل میں بھی اس طرح مشغول ہوجاتے ہیں جیسے کہ وہ ان کا آئیڈیل ہو۔مگر جولوگ زیادہ ذہین ہیں وہ آئیڈیل اور غیر آئیدیل کے فرق کو فوراً محسوس کر لیتے ہیں اور اس بنا پر آئیڈیل سے کم کسی چیز پر اپنے کو راضی نہیں کر پاتے۔

انسان کا آئیڈیل ایک ہی ہوسکتا ہے اور وہ اس کا خالق اور رب ہے۔اعلیٰ ذہن کے لوگ جس چیز کی تلاش میں ہیں وہ ربانی مشن کے سوا اور کچھ نہیں۔خدا کا وجود ہی آئیڈیل وجود ہے اور خدا کے مشن میں اپنے کو مشغول کر کے ہی ہم اس چیز کو پا سکتے ہیں جو ہماری پوری ہستی کو تسکین دے اور آئیڈیل کے بارے میں ہمارے ذہنی معیار پر مکمل طور پر پورا اترے۔

انسان کا آئیڈیل اس کا خدا ہے،مگر وہ اپنے اس آئیڈیل کو ناکام طور پر غیر خدا میں تلاش کر رہا ہے۔

توہم پرستی

امریکا کی ری پبلکن پارٹی (Republican Party) کے ایک عہدیدار مسٹر سیلر (1921-2021ء) نے بتایا کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن (1911-2004) ہر وقت اپنی جیب میں ایک چھوٹی سی سونے کی نعل رکھتے ہیں۔یہ نعل ان کو صدر بننے سے تقریباً پانچ سال پہلے ان کے ایک دوست نے دی تھی۔صدر ریگن کو یقین ہے کہ اس سنہری نعل میں طلسماتی اثرات چھپے ہوئے ہیں۔وہ ان کو ہر آفت سے بچاتی ہے۔چنانچہ مارچ 1981ء میں جب ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تو ان کے خیال کے مطابق اسی نعل نے ان کو اس سے محفوظ رکھا تھا۔

یہ نعل ہر وقت صدر ریگن کے ساتھ رہتی ہے۔ جون 1981ء کی ایک ملاقات میں مسٹر سیلر نے ان سے پوچھا: کیا آپ اب بھی اس نعل کو اپنی جیب میں رکھتے ہیں۔ صدر ریگن نے کہا ہاں ضرور:

I sure do

اس کے بعد انھوں نے اپنی بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا اور مذکورہ نعل نکال کر دکھائی (ٹائمس آف انڈیا، 24 جون 1981)۔

یہ بلا شبہ توہم پرستی (Superstition) ہے۔ مگر اس توہم پرستی کا ایک معلوم سبب ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ ایسے پر اسرار ہوتے ہیں کہ آدمی پوری طرح ان کی توجیہ نہیں کر پاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چھپے ہوئے عوامل ہیں جو کسی کو کامیاب اور کسی کو ناکام کر دیتے ہیں۔

کوئی شخص ایک نتیجہ سے دو چار ہوتا ہے اور کوئی شخص دوسرے نتیجہ سے۔ اور دونوں میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں نہیں بتا سکتا کہ اس کے ساتھ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ ایک بار میں نے ایک بڑے تاجر سے پوچھا کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ آخر میں کہا کہ "قسمت" اگر کوئی شخص اس کا تین سبب بتائے تو میں کہوں گا کہ — قسمت، قسمت، قسمت۔

یہ پر اسراریت اس لیے ہے کہ سب کچھ کرنے والا خدا ہے۔ مگر انسان چوں کہ غیبی خدا کو دیکھ نہیں پاتا اس لیے وہ کسی نہ کسی دکھائی دینے والی چیز کو اپنا خدا بنا لیتا ہے۔ خواہ وہ سونے کی ایک نعل ہو یا پتھر کی ایک انگوٹھی۔

انسان مجبور ہے کہ وہ کسی کو اپنا معبود بنائے۔ خدا کو یا خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو۔

مشینی تعبیر

جولائی 1983 میں امریکی بحریہ نے فوجی مشقیں کی تھیں۔ یہ فوجی مشقیں سان فرانسسکو (San Francisco) کے ساحل پر ہوئیں۔ یہ پورا عمل کمپیوٹروں کے ذریعہ ہورہا تھا۔ اس دوران میں بحریہ کے توپ خانہ کو فائر کرنا تھا۔ فائرنگ کے دوران کمپیوٹر میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپیوٹر عقب کی جانب گولے برسانے لگا۔ یعنی جس طرف فائرنگ مطلوب تھی اس کے بالکل الٹی طرف۔

ابتدائی پروگرام کے مطابق اس مشقی گولہ باری میں امریکی بحریہ کے توپ خانہ کے گولے دور سمندر میں جا کر گرتے مگر توپوں کا رخ الٹا ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گولے میکسکو کے ایک مال بردار جہاز کے پاس جا کر گرنے لگے۔

کمپیوٹر میں اس طرح کے لطیفے بار بار پیش آتے ہیں جن کی اطلاع اخبارات و رسائل میں آتی رہتی ہے۔ کمپیوٹر کے عمل میں ایسی غلطیاں کیوں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کمپیوٹر صرف ایک مادی مشین ہے۔ اس کے پاس عقل نہیں ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کائنات اگر ایک مادی مشین ہوتی جیسا کہ جدید ملحدین کا دعویٰ ہے۔ تو وہ کبھی اس طرح انتہائی درست طور پر نہ چل سکتی جیسا کہ وہ چل رہی ہے۔ ایسی حالت میں زمین اور اس کی آبادیاں اسی طرح برباد ہوچکی ہوتیں جس طرح زلزلہ کے بعد زلزلہ کا مقام برباد ہوجاتا ہے۔ کائناتی حادثات کے نتیجہ میں کائنات بھی تباہ ہوچکی ہوتی اور وہ انسان بھی جو کائنات کی مادی تعبیر کرنے کی کوشش کررہا ہے۔

" کائنات کا کوئی خدا نہیں، وہ صرف ایک مادی مشین ہے " یہ جملہ گرامر کے لحاظ سے بظاہر درست ہے مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ درست نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر داخلی تضاد پایا جاتا ہے۔

یہ جملہ اس وقت صحیح ہوتا جب کہ ایسی کوئی مادی مشین ہوتی جو کسی بنانے والے کے بغیر بن جائے اور کسی چلانے والے کے بغیر چلنے لگے۔ ہم جن مشینوں سے واقف ہیں ان کو "انسان" بناتا اور چلاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ یہ مشین نقص سے خالی نہیں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ کائنات جیسا بے عیب کارخانہ اپنے آپ وجود میں آجائے اور اپنے آپ نہایت درست طور پر مسلسل چلتا رہے۔

خدا کا بندہ

بجلی کے بلب کا کنکشن ایک پاور ہاؤس سے جُڑ نا کوئی عام قسم کا واقعہ نہیں۔ یہ ایک غیر روشن چیز کا ایسی چیز سے جڑنا ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرنے کی غیر معمولی طاقت رکھتی ہے۔ اس ک فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک "مردہ" بلب "زندہ" بلب بن جاتا ہے۔ ایک تاریک بلب میں روشنی کا فوارہ پھوٹ پڑتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ بندے اور خدا کے تعلق کا بھی ہے۔

خدا ہماری دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اسی لیے خدا کو پانا محض سادہ واقعہ نہیں۔ یہ نفسیات انسانی میں پیش آنے والا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ یہ ایک بھونچال ہے جس سے آدمی کا پورا وجود ہل جاتا ہے۔ یہ ایک سیلاب ہے جس سے آدمی کی پوری شخصیت نہا اٹھتی ہے۔ خدا کو پانے کے بعد کوئی شخص ویسا نہیں رہتا جیسا وہ خدا کو پانے سے پہلے تھا۔ خدا کا مومن وہ ہے جو اس کے بعد ایک نیا انسان بن جائے۔

خدا کو پانا جس کو شریعت کی اصلاح میں ایمان کہا جاتا ہے، کسی انسان کے لیے اس کی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ ہے۔ خدا پر ایمان یہ ہے کہ ایمان آدمی کو اس طرح ملے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ وہ ایسی روشنی ہو جس سے اس کا پورا وجود چمک اٹھے۔ وہ ایسا رنگ ہو جس میں اس کے سارے معاملات رنگے ہوئے نظر آئیں۔

ایمان خدا کی موجودگی کو پالینے کا دوسرا نام ہے۔ایمان یہ ہے کہ آدمی خدا کی عظمتوں میں گم ہوجائے۔ وہ احساس خداوندی میں سرشار ہوجائے۔ایمان آدمی کے جذبات کا حمد خداوندی میں ڈھل جانا ہے۔ یہ دنیا میں رہتے ہوئے خدا تک پہنچ جانا ہے۔

ایمان ایک زلزلہ ہے جو خدا کی معرفت سے آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ایمان ایک سیلاب ہے جو خدا کے فیضان کو پا کر آدمی کے سینہ میں بہہ پڑتا ہے۔ایمان خدا کو پالینا ہے اور خدا کو پاناسب کچھ کو پانا ہے۔ پھر کیا چیز ہے جو خدا کو پانے کے بعد آدمی کو نہ ملے۔

فطرت کی تصدیق

"پتھر اور لکڑی کو کوٹ پیس کر ملا دو تو وہ پٹرول بن جائے گا"۔اس قسم کی بات بظاہر بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً انسان اس طرح کا کوئی واقعہ ظہور میں لانے پر قادر نہیں۔مگر اسی قسم کے اس سے زیادہ عجیب واقعات اس دنیا میں ہر دن ظہور میں آرہے ہیں۔قدرت کی کیمسٹری ہر دن ایسے بے شمار واقعات ظہور میں لاتی ہے جو انسان کے لیے صرف ایک ناقابل فہم عجوبہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آکسیجن اور ہائڈروجن دو گیسیں ہیں۔قدرت ان کو ایک خاص تناسب سے ملاتی ہے تو ان کا مجموعہ پانی جیسے سفید سیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔کاربن اور ہائڈروجن مخصوص حالات میں باہم ملتے ہیں تو تیل جیسی قیمتی چیز وجود میں آتی ہے۔کاربن کے ساتھ کچھ نمکیات اور معدنیات جمع ہوتی ہیں تو زندگی وجود میں آجاتی ہے۔

مقناطیسی فیلڈ اور حرکت کو یک جا کیا جاتا ہے تو بجلی جیسی حیرت ناک طاقت پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح مقناطیسی فیلڈ اور بجلی کو اکھٹا کیا جاتا ہے تو انتہائی تیز حرکت وجود

میں آجاتی ہے۔ایک بیج کو مٹی میں ملا دیا جاتا ہے تو اس سے لکڑی اور پتی اور پھول اور پھل کا ایک مجموعہ نکل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اس قسم کے بے شمار کرشمے کائنات میں ہر لمحہ ظاہر ہو رہے ہیں۔انسان ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ نہ خود ان چیزوں میں اپنے آپ کو ظہور میں لانے کی طاقت ہے اور نہ انسان اس پر قادر ہے کہ وہ بطور خود کسی واقعہ کو پیدا کر سکے۔"پھر یہ سب کیسے ہو رہا ہے"اس سوال کے جواب میں وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خدا کا انش ہے۔یہ خود خدا ہے جو اَن گنت صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔

قرآن اس قسم کے جواب کو گمراہی قرار دیتا ہے۔قرآن کے نزدیک یہ چیزیں خدا کا انش نہیں بلکہ خدا کا حکم ہیں۔خدا نے اپنی قدرت سے ان کو پیدا کیا ہے۔نہ کہ خود خدا ان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

"ستارے" قدیم زمانہ سے شعراء کے حسین تخیلات کا مرکز رہے ہیں۔"چاند" کو انسان دیوتا کے روپ میں دیکھتا رہا ہے۔مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ستارے ہیبت ناک آگ کے شعلے ہیں اور چاند اور دوسرے سیارے محض خشک چٹانیں جن پر پانی کا ایک قطرہ یا درخت کا ایک پتہ بھی نہیں۔کائنات انتہائی وسیع ہونے کے باوجود انسان جیسی مخلوق کے لیے انتہائی طور پر غیر موافق ہے۔ساری معلوم کائنات میں صرف زمین ہی ایک ایسا کرہ ہے جہاں انسان زندہ رہتا ہے اور تمدن کی تعمیر کرتا ہے۔بے حد وسیع کائنات میں زمین کا استثناء واضح طور پر ایک ذی شعور ہستی کے وجود کا ثبوت ہے جس نے بالارادہ زمین پر استثنائی حالات پیدا کیے۔

خدا کی نشانیاں

ستمبر 1984ء کی سات تاریخ تھی۔ میں افریقہ کے ایک پہاڑی علاقہ میں درخت کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ درخت میرے لیے نیا تھا۔اس سے پہلے میں نے اس قسم کا درخت نہیں دیکھا تھا۔

درخت اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی نشانی معلوم ہو رہا تھا۔اس کی ہر چیز میری نظر میں عجیب تھی، اس کا نازک پھول، اس کا ترشا ہوا پھل، ریاضیاتی کاریگری کے ساتھ بنی ہوئی اس کی پتیاں تمام چیزیں پکار رہی تھیں کہ وہ اپنے آپ نہیں اگ آئی ہیں بلکہ کسی بنانے والے نے ان کو بنایا ہے۔اس دنیا کا ہر درخت خدا کی صنعت گری کا نمونہ ہے۔مگر مذکورہ درخت پہلی بار میرے سامنے آیا اس لیے وہ خصوصی طور پر میرے لیے اثر انگیز ثابت ہوا۔

افریقہ کے اس عجیب اور حسین درخت کو دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائیں ان میں سے ہر چیز پر اس نے یہ لکھ دیا— خدا کا بنایا ہوا:

Made by God

خدا نے چیزوں پر یہ لکھا اور اس کے بعد اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپا لیا۔تا کہ لوگ مخلوق کو دیکھ کر خالق کو پہچانیں، تا کہ غیب کے باوجود اس دنیا میں خدا کی موجودگی کو پالیں۔

ایک شخص جو مشینوں کا ماہر ہو وہ ایک مشین کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ مشین روس کی بنی ہوئی ہے یا امریکا کی، برطانیہ کی بنی ہوئی ہے یا جاپان کی۔یہی کائنات کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں بے شمار قدرتی مشینیں موجود ہیں

اور ہر ایک مسلسل اپنا کام کر رہی ہے۔ان "مشینوں" پر بظاہر ان کی ساخت کا ٹھپہ نہیں لگا ہوا ہے، مگر اپنی غیر معمولی بناوٹ اور نا قابل بیان حد تک ممتاز کارکردگی کی وجہ سے وہ اپنی ساخت کا آپ اعلان ہیں۔مخلوقات خود اپنے خالق کو بتا رہی ہیں۔

کائنات کی کسی چیز کے اوپر لفظوں میں یہ نہیں لکھا ہوا ہے کہ اس کو کس نے بنایا۔مگر معنوی طور پر ہر ایک کے اوپر لکھا ہوا موجود ہے۔اگر دیکھنے والی نگاہ ہو تو آدمی ہر چیز کو دیکھ کر پکار اٹھے گا: بلا شبہ یہ خدا کی بنائی ہوئی ہے۔کوئی دوسرا اس کو بنا نہیں سکتا۔

خلائی تہذیب

مغربی دنیا پچھلے 20 سال سے ایک انوکھی تحقیق میں مشغول ہے۔یہ ہے خلا میں زندہ مخلوقات کی آواز کو سننا:

Listening for life in space

بظاہر اس تلاش کا محرک جدید علماء کا وہ مفروضہ ہے جس کو ارتقاء کہا جاتا ہے۔مغربی علماء نے زندگی کی جو ارتقائی توجیہ کی ہے، اس کے مطابق لازم آتا ہے کہ وسیع خلا میں دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح زندگی کی انواع موجود ہوں جس طرح وہ ہماری زمین پر پائی جاتی ہیں۔خلا میں سفر کا ایک خاص مقصد ان زندگیوں سے ملاقات ہے۔اس مفروضہ پر ان کو اتنا یقین ہے کہ اس کا ایک خاص نام بھی دے دیا گیا ہے۔یعنی بالائے خلا تہذیب (Extraterrestrial civilisation)۔

اس کے علاوہ امریکا میں اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں خاص طرح کے بہت بڑے بڑے اینٹینا (Antenna) لگائے گئے ہیں جن کو عام زبان میں ریڈیائی کان (Radio ears) کہتے ہیں۔ان مشینوں سے بالائے خلا میں سگنل بھیجے جاتے ہیں اور حساس قسم کے آلات ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ اوپر سے آنے والے متوقع سگنل کو سن سکیں۔

ایک مبصر نے ان کوششوں پر تبصرہ (ٹائم میگزین 21 مارچ 1983) کرتے ہوئے اس کی روح کو ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے: اگر تم واقعۃً وہاں ہو تو اپنے دوستوں سے بولو:

If you are really there, please call your friends.

زمین پر زندگی اور شعور کا وجود ساری معلوم کائنات میں ایک انتہائی نادر اور مستثنیٰ واقعہ ہے۔ چونکہ یہ شعور اپنا خالق آپ نہیں۔ اس لیے اس کا وجود لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ یہاں زندگی اور شعور کا ایک اور خزانہ زیادہ بڑی سطح پر موجود ہو جو زمین کی زندگی اور شعور کا سرچشمہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندہ انسان کی موجودگی زندہ خدا کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ جدید انسان اس امکان کو بالواسطہ انداز میں تسلیم کرتا ہے۔ البتہ وہ اس وجود کو خلائی زندگی قرار دے کر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ یہ وجود ہماری ہی طرح کا ایک وجود ہے نہ کہ ہم سے برتر کوئی وجود۔ وہ محض ایک تہذیب ہے نہ کہ کوئی خالق اور مالک خدا۔

یہ ماہرین

پروفیسر راج کرشنا (1925-1985) ہندستان کے پچاس انتہائی اعلیٰ اذہان میں شمار ہوتے تھے۔ علم اقتصادیات میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے وہ بین اقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ ملک کے بڑے بڑے معاشی عہدوں پر فائز رہے۔ آخر عمر میں وہ ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن) کے ایک پروجیکٹ کے تحت تین مہینہ کے لیے روم (اٹلی) گئے تھے۔ ابھی وہ اپنے کام کی تکمیل نہیں کر سکے تھے کہ 21 مئی 1985ء کو اچانک حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف 89 سال تھی (ٹائمس آف انڈیا، 22 مئی 1985ء)۔

پروفیسر راج کرشنا زرعی اقتصادیات کے ایک مانے ہوئے اکسپرٹ تھے۔ انھوں نے اس مسئلہ کا اختصاصی مطالعہ کیا تھا کہ تیسری دنیا کے غربت کے ماحول میں روزگار کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے:

He was an acknowledged expert in agricultural economics and had specialised in the study of employment conditions of poverty in the third world.

کیسے عجیب ہوں گے مسائل عالم کے وہ ماہرین جن کو خود اپنے مسئلہ کی خبر نہ ہو۔

انسان کا حال بھی کیسا عجیب ہے۔ وہ اپنے کل کو نہیں جانتا اور دوسروں کے مستقبل پر ریسرچ کرتا ہے۔

وہ خود فکری افلاس میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کے معاشی افلاس پر تقریر کے کارنامے دکھاتا ہے۔ مسائل عالم کی مہارت پر اس کو بڑے بڑے خطابات دئے جاتے ہیں۔ مگر جب تجربہ ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے قریبی مسئلہ سے بھی ناآشنا تھا کیسا عجیب ہے لوگوں کا جاننا اور کیسا عجیب ہے ان کا نہ جاننا۔

محبت کا نذرانہ

قرآن کی ایک آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اور بعض انسان وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنا چاہیے۔ اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ ہی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگر یہ ظالم اس وقت کو دیکھ لیں جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے" (2:165)۔

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور اس کے لیے اعتماد و یقین کی بنیاد ہو، کسی کو اس حیثیت سے اپنی زندگی میں شامل کرنا اس کو معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لیے خاص ہوجاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ کسی سے حُبِّ شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حبّ شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لیے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو دراصل خدا کو دینا چاہیے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے اور پھر وہ ڈھیرے ڈھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ اس طرح ان کے گرویدہ ہوجاتے ہیں جیسا گرویدہ انہیں صرف خدا کا ہونا چاہیے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لیے تھا کہ اس کو خدا سے پُر کیا جائے وہاں کسی غیر خدا کو بٹھا لیا جاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لیے جو سب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی با کمال ہستی کو پائے اور اس کی خدمت میں محبت سے کم تر درجہ کی کوئی چیز پیش کرے۔ محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتا اور نہ کسی انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔ اپنی چیزوں میں کم تر چیز کا ہدیہ خدا کو پیش کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کو اس کے جلال و کمال کے ساتھ پایا ہی نہیں۔

قیمت جوادا نہیں کی گئی

بائبل میں ہے "میں نے بانسری بجائی، تو نے رقص نہ کیا" (متی، 11:17)۔ کائنات ایک عظیم نمائش گاہ ہے۔ وہ قدرت اور حکمت اور معنویت کا ایک اتھاہ کارخانہ ہے۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ اس کے حسن کو کسی بھی طرح لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کائنات اپنے تمام جلووں کے ساتھ خدا کی ابدی طرب گاہ ہے۔ تاہم معلوم کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جو اس طرب گاہ کو سمجھ سکتا ہے اور اس کو دیکھ کر اس کے جمال و کمال پر رقص کرسکتا ہے۔ مگر وہی واحد مخلوق جس کو خدا نے اپنے دست خاص سے اس لیے بنایا تھا کہ وہ کائنات کی بے پناہ فن کاریوں کو دیکھے اور اس سے بے خود ہو کر رقص کرنے لگے، وہی سب سے زیادہ اس سے اعراض کرتا ہے۔ انسان سب کچھ کرتا ہے مگر وہی کام نہیں کرتا جس کو اسے سب سے زیادہ کرنا چاہیے۔

تمام مخلوقات میں صرف انسان کو اس قسم کا احساس وشعور دینا ظاہر کرتا ہے کہ انسان سے اس کے خدا کو کیا مطلوب ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ خدا کے "طرب پر رقص کرے"۔ وہ کائنات میں خدا کے کرشموں کو اس طرح پالے کہ اس پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوجائے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھے: فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (23:14)۔ یعنی، کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ انسان کی اصل قیمت یہی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو گویا وہ اس کائنات میں اپنے آپ کو بے قیمت کر رہا ہے۔ وہ اپنے وجود کو بے معنی بنا رہا۔ خدا نے ایک عظیم آفاتی اسٹیج بنایا اور اس میں اپنے بہترین جلووں کے ساتھ ظاہر ہوا اور یہ سب کچھ جس کے لیے کیا گیا وہ وہی تھا جس کو انسان کہا جاتا

ہے۔ ایسی حالت میں انسان اگر اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلے، اگر اس کی طرف سے حمد کا ظہور نہ ہو تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی جو سزا بھی دی جائے وہ کم ہوگی۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ وہ جنت کی فضاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ خدا کے جمال وکمال کا آئینہ ہے۔ مگر انسان اس کے حُسن کو دیکھ نہیں پاتا۔ انسان کے جہنمی سائے نے اس کو ڈھانپ رکھا ہے۔ کائنات کو اس کے جنتی روپ میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بنائے ہوئے جھوٹے خول سے باہر آئے۔ وہ "انسانی دنیا" سے اوپر اٹھ کر خدائی دنیا میں جھانک سکے۔ انسان اپنے خول سے باہر نکلنے پر تیار نہیں ہوتا، اس لیے وہ خدا کی دنیا کو دیکھ بھی نہیں پاتا۔

وہی انسان انسان ہے جو تمام دیکھی جانے والی چیزوں سے زیادہ کائنات کو دیکھے۔ کائنات کے آئینہ میں اس کو خدا کا جلوہ نظر آنے لگے جب کسی بندۂ خدا پر یہ تجربہ گزرتا ہے تو اس کا وہ حال ہوتا ہے جس کو انسانی لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی زبان خدا کی حمد وثنا میں تر رہنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے نور میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں۔ اس کا شدت احساس آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلتا ہے۔ خدا کی خدائی کے اعتراف میں اس کا پورا وجود خاکستر ہوجاتا ہے۔

انسان اپنے آپ میں اتنا مشغول ہے کہ اس کو خدا کی خدائی کی خبر نہیں۔ وہ اپنی "مصنوعات" میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ اس کو خدا کی مصنوعات دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جلووں میں اتنا گم ہے کہ اس کو خدا کے جلوے نظر نہیں آتے۔ انسان کی سب سے بڑی محرومی یہی ہے اور جو شخص دنیا میں محروم ہو وہ آخرت میں پانے والا کس طرح بن سکتا ہے۔

قومی ہیرو

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ناظم دینیات کے دفتر میں بی ایس سی کا ایک مسلمان طالب علم داخل ہوا "یہ مسلم یونیورسٹی ہے" اس نے پرجوش انداز میں کہنا شروع کیا۔ "یہاں آپ دینی امور کے ذمہ دار ہیں۔ میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ یہاں کی آزاد لائبریری میں انگریزی کی ایک کتاب ہے جس میں ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصویر ہے۔ آپ اس کتاب کو فوراً لائبریری سے ہٹوا دیں ورنہ..."۔

ناظم دینیات نے کہا "تم جانتے ہو کہ آزاد لائبریری بہت بڑی لائبریری ہے۔ یہاں دنیا کے مختلف اداروں سے کتابیں آتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں ایسی کتابیں بھی آسکتی ہیں جن میں اللہ میاں کا مذاق اڑایا گیا ہو۔ کیا تم ایسی سب کتابوں کو دیکھ کر مشتعل ہوتے رہو گے"۔

"سر اللہ میاں تو سب کے ہیں اور رسول اللہ تو ہمارے ہیں" (احتساب، علی گڑھ، 15 مئی 1984ء)۔

مسلمان طالب علم کو کیوں خدا سب کا نظر آیا اور رسول صرف اپنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے رسول کو اپنا قومی ہیرو سمجھ لیا۔ ہر قوم کا اپنا الگ ایک ہیرو ہوتا ہے جس پر وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں فخر کرتی ہے۔ خدا میں اشتراک ممکن ہے مگر قومی ہیرو میں اشتراک ممکن نہیں۔ یہی قومی نفسیات تھی جس کی وجہ سے مسلمان طالب علم خدا کے خلاف بات پر نہیں بھڑکا مگر رسول اللہ کے خلاف بات کو دیکھ کر بھڑک اٹھا۔

مذکورہ طالب علم کا واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان کبھی "جشن خداوندی" نہیں مناتے۔ البتہ وہ "جشن محمدی" خوب

دھوم کے ساتھ ساری دنیا میں مناتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنی قومی نفسیات کی بنا پر انہیں خدا میں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ کیونکہ خدا میں وہ اپنے لیے ذاتی فخر کا سامان نہیں پاتے۔ البتہ "محمد" تاریخی طور پر چوں کہ ان کے ہیرو یا ان کا قومی فخر بن چکے ہیں۔ اس لیے ان کے نام پر خوب دھوم مچاتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے اپنے پر فخر قومی جذبات کی تسکین حاصل کر سکیں۔

آج ہر طرف الحاد کا غلبہ ہے مگر مسلمانوں کے اندر یہ جوش نہیں ابھرتا کہ وہ الحاد کے فکری غلبہ کو ختم کر کے توحید کا فکری غلبہ قائم کریں۔ البتہ پیغمبر کی تصویر دیکھ کر وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہ یقینی طور پر ہیرو پرستی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

فطرت کی تلاش

ایک آدمی جس کے پاس دولت اور اقتدار ہو اس کے گرد پر رونق ساز وسامان جمع رہتے ہیں۔ باہر سے دیکھنے والوں کو وہ اپنے سے مختلف بڑی چیز دکھائی دیتا ہے مگر خود اس شخص کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ جب اپنی تنہائیوں میں جاتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی ویسا ہی ایک کمزور انسان ہے جیسا کہ دوسرے انسان۔

امریکا کی مشہور فورڈ کمپنی کے موجودہ وارث مسٹر الفرڈ فورڈ (پیدائش 1950) بے پناہ دولت کے مالک ہیں۔ مگر ان کی روح کوئی اور چیز پانے کے لیے بے چین تھی۔ اس دوران ان کا تعارف ہرے کرشنا موومنٹ سے ہوا جس کے مراکز امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں میں موجود ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی روح یہاں تسکین پا سکتی ہے۔ وہ اس میں شریک ہو گئے۔ مسٹر فورڈ نے 27 دسمبر 1984ء کو کرشنا موومنٹ کی ایک ہندولڑکی

شرمیلا بھٹاچاریہ (39) سے شادی کرلی۔شادی کی یہ رسم ہرے کرشنا موومنٹ کے آسٹریلیا کے ایک مرکز میں انجام پائی۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم جنوری 1985ء) کی ایک تصویر میں مسٹر فورڈ سادھوؤں جیسے بغیر سلے ہوئے کپڑے میں ملبوس نظر آتے ہیں۔اے پی کے نامہ نگار نے اس سلسلہ میں جو رپورٹ دی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

Mr. Alfred Ford said he was only a Ford by name. "I'm not a car. I'm a spirtual soul, just like anyone else," he said.

مسٹر فورڈ نے کہا کہ وہ بس نام کے اعتبار سے فورڈ ہیں۔"میں ایک کار نہیں ہوں۔ میں ایک روحانی وجود ہوں ویسے ہی جیسے کہ کوئی دوسرا شخص (ہندستان ٹائمس، 28 دسمبر 1984ء)۔

کسی آدمی کو دولت اور اقتدار کی خواہ کتنی ہی بڑی مقدار حاصل ہو جائے ، وہ اس کی ہستی کا جزء نہیں بنتی۔ساز وسامان کے ہجوم میں وہ اپنے آپ کو اکیلا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔اس کے باوجود وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کی ہستی میں شامل ہوجائے۔جس کو وہ اپنے داخلی وجود کی سطح پر اپنا بنا سکے۔اس تلاش کا جواب صرف وہ کامل اور برتر خدا ہے جو انسان کا خالق اور مالک ہے۔مگر انسان جب حقیقی خدا کو نہیں پاتا تو وہ غیر خدا میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ وہ مصنوعی طور پر اپنے اس مطلوب کو حاصل کر سکے جس کو وہ حقیقی طور پر نہ پاسکا۔

یہ انسان

لوگوں کو دیکھیے تو وہ یا تو "ملت" کے مسائل پر باتیں کرتے ہوئے ملیں گے یا زیادہ سے زیادہ دین کے ظاہری پہلوؤں پر۔دین کے معنوی پہلوؤں پر بات کرنے والا کوئی نظر نہیں

آتا۔اس کی وجہ شاید انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صرف دکھائی دینے والی چیزوں میں اپنی توجہ لگا پاتا ہے۔جو چیز دکھائی نہ دے اس میں توجہ لگانا اس کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام رہا ہے۔ماضی میں بھی اور آج بھی۔

انسان ان چیزوں کو اپنا معبود بناتا ہے جو اس کو دکھائی دیتی ہیں اور جو چیز دکھائی نہیں دیتی، اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح اس کو اپنا معبود بنائے۔وہ ان کاموں میں بآسانی مشغول ہوجاتا ہے جو دکھائی دیں مگر جو کام بظاہر دکھائی نہ دیتے ہوں ان میں مشغول ہونا وہ نہیں جانتا۔جو چیز محسوس طور پر سامنے موجود ہو اس کی اہمیت کو وہ خوب جان لیتا ہے مگر جو چیز محسوس طور پر اس کے سامنے موجود نہ ہو اس کو وہ اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے۔جیسے وہ اس کو جانتا ہی نہیں۔

یہ ظاہر پرستی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔اس کمزوری کا آخری اظہار وہ ہے جس کو شرک کہا جاتا ہے۔نیز اس کمزوری کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ آدمی دین پر ایمان لانے کے باوجود دین میں ترقی نہیں کرتا۔

مشرک وہ ہے جو نہ دکھائی دینے والے خدا کو مانتے ہوئے کچھ دکھائی دینے والی چیزوں کو بھی خدا بنالے۔ملحد وہ ہے جو یہ کہہ کر سرے سے کسی خدا کا انکار کر دے کہ وہ اس کو دکھائی نہیں دیتا۔یہ گمراہی کی زیادہ سنگین قسمیں ہیں۔

مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو اپنے انجام کے اعتبار سے کم اہم نہیں۔وہ ہے ایمان کے باوجود ایمان کا بے اثر رہنا۔ایسا اس وقت ہوتا ہے جب آدمی خدا پر ایمان لائے مگر وہ خدا کو دیکھ نہ سکے۔وہ خدا کو مانے مگر اس نے گہرائی کے ساتھ اس کا ادراک نہ کیا ہو۔وہ خدا کا معتقد ہو مگر محسوسات سے بلند ہو کر وہ خدا کو اپنا مرکز توجہ نہ بنا سکے۔

مزید یہ کہ غیر محسوس خدا کو نہ پانا گویا چھپی ہوئی معنویت کو نہ پانا ہے۔ ایسا شخص انھیں انسانوں کو پہچان پاتا ہے جو اپنے گرد ظاہری اشیاء کا ڈھیر جمع کیے ہوئے ہوں۔ جو انسان اپنے اندر معنویت کا خزانہ لیے ہوئے ہو وہ اس کے لیے لامعلوم رہتا ہے۔ خدا کو کھونے والا بالآخر معنویت کو بھی کھو دیتا ہے۔

خدا کی عظمت

شرک اور کبر

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا (4:48)۔ یعنی، بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے سوا جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اس نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا۔

وَقَالَ رَسُول اللّٰه صلى اللّٰه عَلَيْهِ وَسلم لَا يدْخل الْجنَّة من كَانَ فِي قلبه مِثْقَال ذرة من كبر قيل فَمَا الْكبر يَا رَسُول اللّٰه قَالَ أَن تسفه الْحق وَتغمض النَّاس أَي تحقرهم (صحیح مسلم، حدیث نمبر 91)۔ یعنی، رسول اللہ نے فرمایا کہ جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کہ کبر کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ خلاف واقعہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو بڑائی کا درجہ دیا جائے۔ یہی خدا کے نزدیک سب سے بڑا جرم ہے۔ آدمی اگر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لے تو یہ کبر ہے اور اگر وہ کسی دوسرے کو بڑا قرار دے تو اسی کا نام شرک ہے۔

خدا کی معرفت خدا کے سوا دوسری تمام عظمتوں کو ڈھا دیتی ہے بشمول اپنی عظمت کے۔ خدا کے سوا دوسروں کی عظمت ماننے کا نام شرک ہے اور اپنی عظمت ماننے کا نام کبر۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لیے یہاں ہر قسم کے لوگوں کو بسنے کے مواقع ملے ہوئے ہیں۔ مگر آخرت کی دنیا آئیڈیل دنیا ہوگی۔ وہاں صرف وہی لوگ عزت کا مقام پائیں گے جنھوں نے موجودہ آزمائشی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ حقیقت واقعہ کی سطح پر جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کبر اور شرک کی سطح پر جینا غیر حقیقی سطح پر جینا ہے۔ اس لیے جو لوگ کبر اور شرک کی سطح پر زندگی گزاریں گے وہ آخرت کی ابدی دنیا میں بسنے کے لیے سراسر نااہل ٹھہریں گے۔

جنت ان اعلیٰ انسانوں کے لیے ہے جو خدا کی بڑائی میں جیتے ہوں۔ جہنم ان پست لوگوں کا مقام ہے جو غیر خدا کی بڑائی میں جئیں، خواہ یہ جینا خود اپنی بڑائی میں ہو یا اپنے سوا کسی دوسرے کی بڑائی میں۔

عقیدۂ خدا

شیر کو دیکھنے کی صورت یہ ہے کہ آپ اس کو مردہ عجائب خانہ میں دیکھیں۔ اور دوسرا شیر وہ ہے جو کھلے جنگل میں نظر آتا ہے۔ مردہ عجائب خانہ میں شیر کی کھال کے اندر بھس وغیرہ بھر کر اس کو کھڑا کر دیتے ہیں۔ بظاہر وہ شیر کی مانند ہوتا ہے مگر وہ صرف شیر کی صورت ہوتی ہے، نہ کہ فی الواقع شیر۔ ایسے شیر کو لوگ صرف تفریح کے طور پر دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اس سے ڈرنے یا بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مگر جنگل کا شیر ایک زندہ شیر ہے وہ ناقابل تسخیر قوت کا نشان ہے۔ وہ جب چلتا ہے تو سارا جنگل سہم اٹھتا ہے۔ وہ جب دھاڑتا ہے تو جانور دہشت زدہ ہو کر گر پڑتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر جنگل میں زندہ شیر کو دیکھ لے تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے تمام ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں۔ وہ ویسا نہیں رہتا ہے جیسا وہ اس کو دیکھنے سے پہلے تھا۔

اس مثال سے خدا کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خدا پر عقیدہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے خدا پر تقلیدی عقیدہ۔ دوسرا ہے خدا پر زندہ عقیدہ۔

خدا پر تقلیدی عقیدہ ایک بے جان عقیدہ ہے۔ ایسا عقیدہ آدمی کی روح کو نہیں تڑپاتا۔ وہ اس کی رگوں میں بجلی بن کر نہیں دوڑتا۔ وہ آدمی کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کرتا۔ خدا کے تقلیدی عقیدہ میں خدا کو ماننا ہوتا ہے۔ مگر خدا سے ڈرنا نہیں ہوتا۔

مگر خدا پر زندہ عقیدہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ خدا پر زندہ عقیدہ خدا کو اس کی اتھاہ قوتوں کے ساتھ اس کو دیکھ لینے کا نام ہے۔ جو شخص اس طرح خدا کو پالے وہ پانے کے بعد ویسا نہیں رہ سکتا جیسا کہ وہ پانے سے پہلے تھا۔ خدا کو پانے کے بعد اس کے سارے وجود کے اندر بھونچال آجاتا ہے۔ خوف کی شدت سے اس کی روح سہم اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن سے تمام دوسرے مسائل حذف ہوجاتے ہیں۔ وہ صرف ایک ہی مسئلہ کو جانتا ہے اور وہ خدا کا مسئلہ ہے۔

خدا کا زندہ عقیدہ اور خدا کا خوف دونوں ناقابل تقسیم ہیں۔ آپ خدا کے زندہ عقیدہ سے خدا کے خوف کو الگ نہیں کر سکتے۔ جہاں یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوں وہاں سمجھ لیجیے کہ خدا کا زندہ عقیدہ نہیں بلکہ صرف تقلیدی عقیدہ ہے اور تقلیدی عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں۔

عظمت خداوندی

ہر ایک کے پاس اپنی عظمت کی داستانیں ہیں، خدا کی عظمت کی داستان کسی کے پاس نہیں۔ ایک آدمی اپنی محبوب شخصیت کے حق میں لمبا نثری قصیدہ پڑھے گا جس میں یہ خبر دی جائے گی "آپ کی ذات گرامی کے آفتاب سے گوشے گوشے جگمگا رہے ہیں" مگر طویل تحریر میں کہیں بھی یہ محسوس نہ ہوگا کہ کہنے اور سننے والے خدا کی عظمت وجلال کے احساس سے لرز رہے ہیں اور رب العالمین کے بے پایاں کرشموں کو دیکھ کر محو حیرت ہیں۔ البتہ خاتمہ کلام پر یہ فقرہ ادا کر دیا جائے گا: **وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔** کلام کے پورے مجموعہ میں دیکھیے تو عربی کا یہ فقرہ ایک بے جوڑ سا فقرہ معلوم ہوگا۔ جس کلام میں انسانی عظمت کے آبشار برسائے جارہے ہوں وہاں "تمام تعریف صرف اللہ کے لیے ہے" کہنے کا کیا مقام۔ اس قسم کا فقرہ ہمیشہ رسمی ہوتا ہے نہ کہ حقیقی۔ انسان کی عظمت کا

طویل قصیدہ پڑھنے کے بعد یہ مختصر عربی فقرہ حقیقۃً اللہ کی حمد کے جذبہ سے نہیں نکلتا بلکہ صرف تبرک یا رسم کی خانہ پری کے لیے ہوتا ہے۔ کسی دوسرے مذہب کا آدمی ہو اور وہ اپنی محبوب شخصیت کا قصیدہ پڑھے تو وہ اپنے کلام کے آخر میں اپنے مذہب اور روایات کے لحاظ سے کوئی فقرہ بول دے گا اور مسلمان اپنے مذہب اور روایات کے لحاظ سے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ ایک فقرہ "اسلامی" فقرہ ہے اور دوسرے کا "غیر اسلامی" فقرہ مگر جس نفسیاتی حالت کے تحت یہ فقرے نکلے ہیں، اس کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اندرونی کیفیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ایک شخص اپنی روایتی تسکین کے لیے عربی فقرہ کا تلفظ کر رہا ہے، دوسرا کسی غیر عربی فقرہ کا۔

جو لوگ اپنے ان مشغلوں پر خوش ہیں اور ان کو کارنامہ سمجھتے ہیں وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان کی یہ سرگرمیاں خدا کی نظر میں اس سے بھی زیادہ بے قیمت تھیں جتنا کہ مٹی کے ڈھیر میں ایک چیونٹی کا رینگنا۔ یہ زمین کسی کے "اکابر" کی جلوہ گاہ نہیں۔ یہ خدا کی تجلیات کا ظہور ہے۔ جب بھی خدا کے سوا کسی اور کی تعریف اس زمین پر کی جاتی ہے تو وہ سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے جو کوئی شخص بولتا ہے۔

انسانی عظمت کے قصیدے جب پڑھے جاتے ہیں تو زمین و آسمان کی ہر چیز پڑھنے اور سننے والوں پر لعنت بھیجتی ہے مگر جب خدا کی عظمت کا چرچا کیا جائے تو زمین و آسمان اس کے ہم آواز ہو جاتے ہیں۔ انسانی عظمت کے قصیدے جھوٹی زبانوں سے نکلتے ہیں اور جھوٹے کانوں سے سنے جاتے ہیں۔ مگر جب کسی کو خدا کی عظمت بیان کرنے کی توفیق ملتی ہے تو یہ ایک ملکوتی کلام ہوتا ہے جو فرشتوں کے ہم نشینی سے کسی کی زبان سے ابلتا ہے۔ جو لوگ کسی انسان کی عظمت سے مسحور ہوں وہ اس کی شان میں الفاظ کے دریا بہاتے ہیں جب کہ خدا کی عظمت سے مسحور ہونے والے شخص پر چپ لگ جاتی ہے۔ انسانی عظمت کے چرچے پُر رونق مجلسوں اور عمدہ چھپے ہوئے کاغذوں میں ہوتے ہیں اور اللہ کی عظمت کا چرچا

ایک بندۂ خدا کے قلب میں ابلتا ہے اور صرف اس کی تنہائیوں کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس کو سنیں اور دیکھیں۔ خدا کی عظمتوں میں جینے والے اور انسان کی عظمتوں میں جینے والے میں وہی فرق ہے جو خود خدا اور انسان میں۔

کارخانہ کائنات

آپ کسی انسانی کارخانہ میں داخل ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں ہر چیز کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ اس کے ہر شعبہ میں تعارفی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ آدمی کھڑا ہوا ہے جو آپ کے ہر سوال کا پورا جواب دیتا ہے۔ کارخانہ کی طرف سے آپ کو ایسا تعارفی لٹریچر بھی دیا جائے گا جس میں ضروری معلومات درج ہوں۔

کائنات تمام کارخانوں سے زیادہ بڑا کارخانہ ہے۔ مگر یہاں نہ کہیں کوئی تعارفی بورڈ نظر آتا اور نہ کوئی گائڈ۔ یہاں منصوبہ بندی بھی ہے اور تعمیرات بھی۔ یہاں پیداوار بھی ہے اور پیکنگ اور سپلائی کا انتظام بھی۔ یہاں رسد اور طلب میں تناسب کا لحاظ بھی کیا جا رہا ہے اور صنعتی فضلات کو دوبارہ استعمال میں لانے کا اہتمام بھی۔ یہاں ضبط اور توازن کا نظام بھی ہے اور خام سامانوں کی مسلسل فراہمی کا بندوبست بھی۔ یہ سب کچھ ہے مگر نہ کہیں کوئی اعلان کرنے والا ہے اور نہ بتانے والا۔

پہاڑوں کی بلندیاں کائناتی اسٹیج کی مانند نظر آتی ہیں مگر وہاں کوئی بولنے والا نہیں۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید کسی بات کی خبر دے رہی ہیں مگر ان کی بولی سمجھ میں نہیں آتی۔ بجلی چمکتی اور بادل گرجتے ہیں تو گمان ہوتا ہے کہ شاید یہ کائنات کا آلۂ مکبر الصوت ہے جس کے ذریعہ کچھ اعلان کیا جا رہا ہے مگر اس کے الفاظ آدمی کے لیے قابل فہم نہیں ہوتے۔

”ایمان“ کسی آدمی کے اندر اسی خلا کو پُر کرتا ہے۔ وہ آدمی کو کائنات کے بھیدوں کا رازداں بناتا ہے۔ مومن ایک قسم کا سائنس داں ہے۔ سائنس داں بکھرے ہوئے کُرّوں میں نظام شمسی کا پتہ لگاتا ہے وہ مادہ کے اندر چھپی ہوئی توانائی کو دریافت کرتا ہے۔ وہ غیر متحرک دھات میں متحرک مشین کو دیکھ لیتا ہے۔ اسی طرح مومن عالَم ظاہر میں عالَم غائب (غیب) کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ مخلوقات میں اس کے خالق کو پالیتا ہے۔ وہ نظم کو دیکھ کر اس کے ناظم کا پتہ لگالیتا ہے۔

ایمان جب اپنی آخری انتہا کو پہنچتا ہے تو وہ دعوت بن جاتا ہے۔ دعوت دوسرے لفظوں میں کائنات کے غیر ملفوظ نغمہ کو الفاظ کی صورت دینا ہے۔ داعی خدا کی خاموش نشریات کو باآواز اعلان میں منتقل کرتا ہے۔ وہ خدائی پیغام کو سن کر اسے انسانوں تک پہنچاتا ہے دعوت خدا کی دنیا میں خدا کی نمائندگی ہے۔

تقویٰ کیا ہے

ہٹلر کی حکومت کے زمانہ میں جرمنی میں جب یہودی پکڑے جانے لگے تو وہاں بہت لطیفے مشہور ہوئے۔ ایک لطیفہ یہ تھا کہ شہر کی ایک سڑک پر ایک یہودی بھاگا جا رہا تھا۔ دوسرے یہودی نے اس کو دیکھ کر پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو۔ اس نے کہا: ”تم بھی بھاگو“ اس نے دوبارہ پوچھا ”آخر کیوں“ بھاگنے والے یہودی نے جواب دیا: ”چڑیا گھر سے ایک بھیڑیا بھاگ نکلا ہے اور اس کو گولی مارنے کا حکم ہوا ہے۔ دوسرے یہودی نے حیران ہو کر کہا: ہم کو کیا ڈر ہے، ہم بھیڑئے تو نہیں ہیں، پھر ہم کیوں بھاگیں“ پہلے یہودی نے جواب دیا: ہاں ہم بھیڑئے نہیں ہیں۔ مگر کیا ہم اس کو ثابت کر سکتے ہیں۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈر کی نفسیات سے جو انسان بنتا ہے وہ کیسا انسان

ہوتا ہے۔ وہ مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ کیوں کہ اس کو ڈر رہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں
میں نہ پکڑ لیا جاؤں۔ کسی سے ڈرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اس کے مقابلہ میں اپنے کو
کمزور پا رہا ہے۔ وہ فیصلہ کا سرا دوسرے کے ہاتھ میں سمجھتا ہے۔ اور جب بھی فیصلہ کا سرا
دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو لازماً ایسا ہوگا کہ آدمی اندیشہ میں مبتلا رہے گا۔ اس کو یہ ڈر لگا
رہے گا کہ کہیں میں ہی مجرم نہ قرار دے دیا جاؤں۔ ایک بکری جو مجھ سے بہت دور فرات
کے کنارے مری ہو، اگر اس کے مرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے تو میرے پاس
کیا جواب ہوگا۔ اور میں کس طرح اپنے کو بری الذمہ ثابت کرسکوں گا۔

اللہ تمام طاقتوں سے بڑھ کر طاقت ور ہے۔ تمام فیصلوں کا سرا اسی کے ہاتھ میں
ہے۔ ایسی حالت میں جو شخص اللہ کو پالے وہ اس کی طرف سے مستقل اندیشہ میں مبتلا ہو جا تا
ہے۔ ہر معاملہ میں وہ سوچنے لگتا ہے کہ خدا کی عدالت میں کہیں مجھ کو اس کا ذمہ دار نہ قرار
دے دیا جائے۔ اپنے کو بچانے کا جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ لوگوں سے معاملہ کرنے میں وہ
حد درجہ محتاط رہے، لوگوں کے ساتھ وہ ہمیشہ فیاضی کا سلوک کرے، وہ لوگوں کے حق سے
زیادہ انہیں دے۔ اس کا کوئی ساتھی یا اس کا ماتحت اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس کا خطرہ
وہ اپنے اوپر محسوس کرتا ہے، کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ خدا اگر قیامت میں کہہ دے کہ تمہاری
وجہ سے اس کو یہ جرأت ہوئی تو میرے پاس کیا عذر ہوگا۔ اس کی لاعلمی میں ظلم کا ایک واقعہ
ہو تب بھی وہ کانپ جاتا ہے کہ اگر خدا کے یہاں یہ کہا جائے کہ تم عوامی قائد بنے ہوئے تھے
تو تم اس سے باخبر کیوں نہ ہوئے تو میں خدا کو کیا جواب دوں گا۔ اس کے دائرہ میں کوئی
شخص کسی کو ستاتا ہے تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ ڈر جاتا ہے اگر خدا یہ کہے کہ تم
نے اپنی کارروائیوں سے جو ماحول بنایا اس کی وجہ سے ایسا واقعہ ممکن ہو سکا تو میں کس طرح
اپنے کو بری الذمہ ثابت کروں گا۔ کوئی شخص اس کو مدد کے لیے پکارتا ہے اور وہ ایک عذر
کرکے آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ لرز اٹھتا ہے۔ کیوں کہ یہ احساس اس کو پریشان کر دیتا

ہے کہ قیامت میں اگر خدا یہ کہہ دے کہ تم نے اپنے جس کام کو عذر بنایا اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ تم اس کو چھوڑ کر میرے بندے کا ساتھ دیتے تو میں کیا کہہ کر چھوٹ سکوں گا۔

خرابی کی جڑ

ہر آدمی حق کا نام لیتا ہے، اس کے باوجود دنیا میں ہر طرف بگاڑ کیوں ہے۔ اس کی وجہ قرآن کے لفظوں میں الحاد (انحراف) ہے۔ یعنی بات کو صحیح رخ سے غلط رخ کی طرف موڑ دینا۔

الحاد کی ایک صورت جو موجودزمانہ میں بہت زیادہ رائج ہے، وہ ہے — انفرادی حکم کا رخ اجتماعیات کی طرف کر دینا۔ جس حکم کا خطاب آدمی کی اپنی ذات سے ہے اس کا مخاطب دوسروں کو بنا دینا۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:3-4) یعنی، اپنے رب کی بڑائی کر اور اپنے اخلاق کو پاک کر"۔

اس آیت میں اگر وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کو وَثِيَابَ غيرِكَ فَطَهِّر (اور دوسروں کے اخلاق کو پاک کر) کے معنی میں لے لیا جائے تو سارا معاملہ الٹ جائے گا۔ جو آیت ذاتی اصلاح کا سبق دے رہی ہے وہ صرف دوسروں کے خلاف اکھاڑ پچھاڑ کے ہم معنی بن کر رہ جائے گی۔

اسی طرح تمام احکام کا حال ہے۔ ہر حکم جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے اس کا سب سے پہلا خطاب آدمی کی اپنی ذات سے ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے انقلابی دینداروں نے تمام احکام کا رخ دوسروں کی طرف کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین ومذہب کے نام پر بے شمار ہنگاموں کے باوجود کوئی اصلاح نہیں ہوتی۔

ہر قسم کی اصلاح اور ہر قسم کے بگاڑ کا خلاصہ دو لفظ میں یہ ہے:

1۔ خدا بڑا ہے، اس لیے میں بڑا نہیں ہوں۔

2۔ خدا بڑا ہے ، اس لیے تم بڑے نہیں ہو۔

"پہلا جملہ "اللہ اکبر" کے کلمہ کو صحیح رخ سے لینا ہے اور دوسرا جملہ "اللہ اکبر" کے کلمہ کو غلط رخ سے اختیار کرنا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ "خدا بڑا ہے اس لیے میں بڑا نہیں ہوں" تو آپ کے اندر اپنی ذات کے بارے میں ذمہ داری کا احساس جاگے گا۔ آپ کے اندر سے گھمنڈ نکلے گا اور سنجیدگی اور ذاتی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوگا۔ آپ کے اندر تواضع ابھرے گی جو تمام بھلائیوں کی جڑ ہے۔

اس کے برعکس، جب آپ کا نعرہ یہ ہو کہ "خدا بڑا ہے اس لیے تم بڑے نہیں ہو" تو اس سے گھمنڈ کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور توڑ پھوڑ اور دوسروں کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کی سیاست ابھرتی ہے۔ اصلاح کے نام پر ایسا فساد ظہور میں آتا ہے جو کسی حد پر رکنے والا نہ ہو۔

خدا سے غافل

کسی شخص سے اس کے عزیز بیٹے کا ذکر کیجئے تو اس کے پاس اپنے بیٹے کے بارے میں کہنے کے لیے اتنی زیادہ باتیں ہوں گی جو کبھی ختم نہ ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا تذکرہ کیجئے تو وہ اس طرح غیر متحرک بنا رہے گا جیسے کہ اس کے پاس خدا کے بارے میں کہنے کے لیے کوئی بات ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ خدا کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں۔

کسی شخص کو اس کے خاندانی بزرگ کی یاد دلا دیجیے تو وہ اس قدر پر جوش طور پر بولنے لگے گا جیسے کہ اس کے تمام اندرونی احساسات جاگ اٹھے ہوں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا ذکر کیجئے تو وہ جذبات سے اس طرح خالی نظر آئے گا جیسے کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ خدا کے بارے میں کیا کہا جائے۔

کسی شخص کے سامنے اس کے جماعتی اکابر کا نام لے لیجیے۔ اچانک الفاظ کا دریا اس کی زبان سے بہہ پڑے گا۔ وہ اس وقت تک چپ نہ ہوگا جب تک آپ مداخلت کر کے موضوع کو بدل نہ دیں۔ مگر اسی شخص کے سامنے خدا کا نام لیجیے تو اس کے اندر کوئی جوش پیدا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے اس کے پاس خدا کے بارے میں بولنے کے لیے کوئی چیز ہی نہیں۔

ایک شخص کے سامنے اس کے قومی ہیرو کا چرچا کر دیجیے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ اچانک وہ بادشاہ سخن بن کر ظاہر ہوگیا ہے۔ مگر اس کے سامنے خدا کا چرچا کیجئے تو وہ ایسا نظر آئے گا جیسے کہ اس کے اندر خدا کا نام سن کر کوئی ہلچل ہی پیدا نہیں ہوئی جو اس کو بولنے پر مجبور کر دے۔

آہ وہ لوگ جن کے پاس رجال کی تعریف کے لیے الفاظ ہوں مگر خدا کی تعریف کے لیے ان کے پاس الفاظ نہ ہوں۔ انسانوں کے بارے میں وہ معلومات کا خزانہ بنے ہوئے ہوں مگر خدا کے بارے میں ان کے پاس کوئی معلومات نہیں جو ان کے زبان یا قلم سے جاری ہو۔ کیا سینوں میں ایمان کے سوتے خشک ہوگئے۔

کیا لوگوں نے خدا کی عظمت کو محسوس نہیں کیا جس کو وہ لوگوں سے بیان کریں۔ کیا لوگوں کو خدا کے کمالات کا کوئی مشاہدہ نہیں ہوا۔ کیا انہیں صرف مخلوقات کی خبر ہے، خداوند ذالجلال کی انہیں کوئی خبر نہیں۔

تضاد ختم ہوگیا

میں آبادی سے دور ایک پہاڑ کے کنارے کھڑا تھا۔ سرسبز درخت میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی بولیاں کانوں میں آرہی تھیں۔ مختلف قسم کے جانور چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوپر عجیب تاثر ہوا۔ کیسا عظیم اور کیسا کامل ہوگا وہ

خدا جس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور پھر اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے نقشہ کی انتہائی پابند رہتے ہوئے حرکت کرے۔

کتنی حسین اور کتنی معصوم ہے یہ دنیا۔ یہاں چڑیاں وہی آوازیں نکالتی ہیں جو ان کے خالق نے انھیں سکھایا ہے۔ یہاں بلّی اور بکری بالکل اسی طرح اپنا اپنا رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہاں درخت عین اسی منصوبہ کے مطابق اُگتے اور بڑھتے ہیں جو ازل سے ان کے مالک نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔ یہاں دریا ٹھیک اسی قانون کے مطابق رواں ہوتا ہے جو اس کے لیے ابدی طور پر مقدر ہے۔ خدا کی کائنات انتہائی کامل مجموعہ ہے اور یہاں کی ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر عین اسی طرح عمل کرتی ہے جس کا حکم اس کے خدا نے اسے دے رکھا ہے۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے منہ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جس کی اجازت اس کے خدا نے اسے نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو اپنا رزق بناتا ہے جس سے اس کے مالک نے اس کو روک رکھا ہے۔ وہ اپنے سفر حیات کے لیے ایسے راستے اختیار کرتا ہے جہاں کاتب ازل نے پیشگی طور پر اس کے لیے لکھ دیا ہے کہ "یہاں سے گزرنا منع ہے" انسان خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ مگر وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے، وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔

یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دینا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموعہ میں بے آہنگی کا جوڑ لگانا ہے۔ یہ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ ڈالنا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں ناقص چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دینا ہے۔

خدا کی قدرت اور اس کے حسنِ ذوق کا ثبوت جو عظیم تر کائنات میں ہر لمحہ نظر آتا ہے وہ اس گمان کی تردید کرتا ہے کہ یہ صورت حال اسی طرح باقی رہے۔ خدا کی قدرت یقینا اس ظلم

کی اجازت نہیں دے سکتی۔ خدا کا حسن ذوق ہرگز اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ضروری ہے کہ وہ دن آئے جب کائنات کا یہ تضاد ختم ہو، خدا کی مرضی انسانی دنیا میں بھی اسی طرح پوری ہونے لگے جس طرح وہ بقیہ دنیا میں پوری ہو رہی ہے۔

خدا کی نشانیاں

میکسویل (1831-1879ء) وہ شخص ہے جس نے فطرت میں برقی مقناطیسی تعامل کے قوانین کو انتہائی کامیابی کے ساتھ ریاضیاتی مساوات میں بیان کیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عظیم جرمن سائنسداں بولٹز مین (1844-1906) نے اس کو دیکھا تو اس نے تعجب کے ساتھ کہا کہ کون وہ خدا ہے جس نے یہ نشانیاں لکھ دیں:

Maxwell put the laws of electromagnetic interactions into equations so marvellous that when the great German physicist, Boltzmann, saw them he exclaimed, Who was the God who wrote these signs?

کائنات کا مطالعہ کرنے والے کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ہر مطالعہ بالآخر ایک ایسی چیز پر ختم ہوتا ہے جو انتہائی پر اسرار طور پر حکیمانہ ہوتی ہے۔ کائنات اپنے آخری مطالعہ میں ایک حد درجہ منظم واقعہ ہے نہ کہ کوئی بے ترتیب انبار۔ یہ حقیقت ہر واقف کار کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ کائناتی واقعات کے پیچھے کوئی برتر ذہن کام کررہا ہے۔

آئن سٹائن (1879-1955) ایک خالص سائنسی مزاج کا آدمی تھا۔ تاہم اس نے اقرار کیا ہے کہ میں طبیعیات داں سے زیادہ ایک فلسفی ہوں۔ کیونکہ میرا یقین ہے کہ ہمارے باہر بھی ایک حقیقت ہے:

I am more a philosopher than a physicist, for I believe there is a reality outside of us.

The World As I See it.

آئن سٹائن اپنے اس ذہن کی وجہ سے کہتا ہے کہ اس معنی میں میں بھی ایک پکا مذہبی آدمی ہوں:

In this sense, I belong to the ranks of devoutly religious men.

کائنات خدا کی نشانی ہے۔ وہ مخلوق کے روپ میں خالق کی تصویر دکھاتی ہے۔ جو شخص کھلے ذہن کے ساتھ کائنات کو دیکھے گا وہ اس کے اندر اس کے خدا کو پالے گا۔ البتہ جن کے ذہن میں ٹیڑھ ہو وہ عین روشنی کے درمیان بھی اندھیرے میں رہیں گے، وہ خدا کے قریب کھڑے ہو کر بھی خدا کو نہ پائیں گے۔

قدرتی مناظر

مسٹر یو۔ کے موکھا پادھیائے لندن گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک معمر انگریز سے ہوئی جو پچاس سال پہلے برٹش راج کے زمانہ میں رائل ایرفورس کے افسر کی حیثیت سے ہندستان میں مقیم تھا۔ اس نے مسٹر موکھا پادھیائے سے بہت دل چسپی کے ساتھ ہندستان کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ اس کا قیام زیادہ تر بمبئی اور پونہ میں تھا۔ اس نے عجیب محویت کے انداز میں بتایا کہ بمبئی اور پونہ کے درمیان ٹرین کا سفر اس کو بہت پسند تھا۔ یہ پورا سفر دریاؤں، جنگلوں اور قدرت کے مناظر کے درمیان ہوتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں دوبارہ ہندستان جانا چاہتا ہوں تا کہ ان مناظر کو دیکھ کر خوشی حاصل کروں۔

مزید سوالات کے درمیان مسٹر موکھا پادھیا نے مذکورہ انگریز کو بتایا کہ اب پونہ

پہلے جیسا پونہ نہیں ہے۔اب وہ پونے کہا جاتا ہے۔ اس کی آبادی دس گنا بڑھ گئی ہے۔نئی نئی سڑکیں اورروشنیوں کے انتظام نے اس علاقہ میں قدرتی مناظر سے زیادہ مشینی مناظر کاماحول پیدا کردیا ہے یہ سن کر اچانک اس انگریز کا سارا شوق ختم ہو گیا۔اس نے کہا:

NO. I don't think I will go to India

My India probably does not exist

نہیں، میں نہیں سمجھتا کہ مجھے انڈیا جانا چاہیے۔ میراانڈیااب غالباً موجود نہیں (ٹائمس آف انڈیا، 3 فروری 1984)۔

مشینی مناظر دیکھنے سے "انسان" یاد آتا ہے اورقدرتی مناظر کو دیکھنے سے "خدا" یاد آتا ہے۔ مشینی مناظر میں انسان کی کاریگری کادھیان آتا ہے اورقدرتی مناظر میں خدا کی کاریگری کا۔ مشینی مناظر انسان کو انسان سے ملاتے ہیں اورقدرتی مناظر انسان کو خدا سے ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشینی مناظر میں انسان کو وہ سکون نہیں ملتا جو قدرتی مناظر میں اس کو ملتا ہے— أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔سنو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

قدرتی مناظر کیا ہیں۔وہ خدا کی صفات کا آئینہ ہیں۔آسمان کی وسعت خدا کی بے پایاں ہستی کا تعارف ہے۔سورج خدا کے سراپا نور ہونے کا اعلان کررہا ہے۔دریا کی روانی خدا کے جوش رحمت کی گویا ایک تمثیل ہے۔ پھولوں کی مہک اورخوبصورتی خدا کے حسن کی ایک دور کی جھلک ہے۔اگر دیکھنے والی آنکھ ہوتو اس کو قدرتی مناظر میں خدا کا جلوہ دکھائی دے گا۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی ”تمہارا شناختی کارڈ“۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کرسکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہوری تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لیے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کیے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہو رہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا ”شناختی کارڈ“ لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لیے سب سے زیادہ پُر کیف منظر یہ ہوگا کہ

وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لیے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لیے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکا دے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لیے ہوگا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے خدا کی نظر عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لیے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہو جائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لیے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن (1911-2004) 30 مارچ 1981 کو پر اعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شان دار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین و آفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی بلیٹ پروف لیموزین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کیے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکا کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr. Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips.

مسٹر ریگن جیسے سن ہوگئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہوگی (ٹائمس آف انڈیا، 31 مارچ 1981)۔ یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہوگی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہوکر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آ گیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموزین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوجاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہیے۔

جھوٹی بڑائی

حضرت عمر فاروق رضؓ بحیثیت خلیفہ مدینہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ ایک شخص اٹھ کر کہتا ہے کہ خدا کی قسم اگر ہم تمہارے اندر کوئی ٹیڑھ پائیں گے تو ہم تم کو تیر کی طرح سیدھا کر

دیں گے: لَو فَعَلت ذَلِكَ قَوَّمْنَاكَ تَقْوِيمَ القِدْحِ (کنز العمال، حدیث نمبر 14197) ۔ بظاہر یہ نہایت سخت تنقید ہے اور بڑی گستاخی کی بات ہے مگر نہ عمر فاروق اس کو برا مانتے اور نہ سارے مجمع سے کوئی ایک شخص اٹھ کر یہ کہتا کہ تم نے ایسا کیوں کہا۔ اس طرح کے تنقیدی واقعات صحابہ کے دمیان روزانہ پیش آتے تھے۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں بھی یہ صورت حال باقی رہی۔ مگر کبھی کسی نے اس کو برا نہ مانا۔ اگر کہا تو صرف یہ کہا کہ جو بات کہو تحقیق کے ساتھ کہو، نہ کہ بے تحقیق باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف رائے زنی کرنے لگو۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ انسانوں کی عظمت میں نہیں جیتے تھے بلکہ صرف ایک خدا کی عظمت میں جیتے تھے۔ ان کے دل پر اس سے چوٹ نہیں لگتی تھی کہ کوئی شخص کسی انسان پر کیوں تنقید کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ بڑائی کا سارا حق صرف خدا کو دئے ہوئے تھے۔ اور انسانوں پر تنقید کرنے سے خدا کی بڑائی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کے برعکس، موجودہ زمانہ میں اگر کسی شخصیت پر تنقید کر دیجیے تو خواہ وہ تنقید کتنی ہی علمی اور تحقیقی کیوں نہ ہو، اس کے معتقدین فوراً برہم ہو جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانوں ہی کو اپنا بڑا بنائے ہوئے ہیں پھر وہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی بڑائی کا مینار گر جائے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ نماز اور اذان میں وہ اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کہتے ہیں مگر یہ صرف الفاظ ہیں جن کو لوگ زبان سے ادا کرتے ہیں ورنہ حقیقتہً لوگ جس بڑائی میں جی رہے ہیں وہ انسان کی بڑائی ہے نہ کہ خدا کی بڑائی۔

لوگوں کو جاننا چاہیے کہ غیر اللہ کی بڑائی میں جینے کا موقع صرف اس وقت تک ہے جب تک امتحان و آزمائش کی مدت ختم نہ ہو۔ اس کے ختم ہوتے ہی اس کا موقع بھی ختم ہو جائے گا۔ پھر جن لوگوں کی غذا انسان کی جھوٹی بڑائی ہو۔ وہ اس وقت کس چیز کو اپنی غذا

بنائیں گے جبکہ تمام دوسری بڑائیاں ختم ہوجائیں گی اور خدا کی سچی بڑائی کے سوا کوئی بڑائی نہ ہوگی جس کو آدمی اپنی غذا بنائے اور جس کے بل پر وہ جی سکے۔

خدا کی نشانی

إِنَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِلْمُؤْمِنِينَ. وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (45:3-5)۔ یعنی، بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور تمہارے اور حیوانات کو پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا دیا ہے نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے اتارا ہے پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہونے کے بعد اور ہواؤں کے چلنے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔

قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کائنات میں سوچنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان سے جن معنوی حقیقتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ان کی مادی تمثیلات اس نے کائنات میں ہر طرف قائم کردی ہیں۔ تاکہ آدمی کے لیے ان حقیقیوں کو سمجھنا آسان ہوجائے۔ تاکہ وہ دکھائی دینے والی چیزوں کے آئینہ میں نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

سورج اور چاند خدا کی روشن ہستی کا تعارف ہیں۔ چڑیاں اور جانور خدا کی خدائی کے معصوم نمائندے ہیں آسمان خدا کی عظمت وقدرت کا اعلان ہے۔ پانی اور ہوا خدا کی رحمت وشفقت کا ایک نمونہ ہیں۔ درخت اور پہاڑ خدا کے لامحدود حسن کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔

انسان اگر دنیا میں اس طرح رہے کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہوں۔ وہ دیکھنے والی چیزوں کو دیکھ رہا ہو تو ساری دنیا اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔ وہ ہر چیز میں خدا کا نور پائے گا۔ ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت کو دریافت کرے گا۔ کائنات اس کے لیے ایک خدائی سمندر بن جائے گی۔ جس میں وہ نہائے۔ زمین و آسمان اس کے لیے خدا کی جلوہ گاہ بن جائیں گے جہاں وہ اپنے رب سے ملاقات کرے۔

خدا کا فیضان

ہمارے گھر میں پہلے ایک میٹر بینڈ کا معمولی ٹرانسسٹر تھا۔ وہ صرف دہلی ریڈیو اسٹیشن پکڑتا تھا۔ ہم اس سے دہلی کی خبریں سن لیتے تھے۔ مگر دوسرے ملکوں کی نشریات سننا اس کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔ کئی سال تک یہی چھوٹا ٹرانسسٹر ہمارے ریڈیائی نشریات سننے کا ذریعہ بنا رہا۔

اس کے بعد ہم نے چار میٹر بینڈ ریڈیو سٹ خریدا۔ یہ ریڈیو سٹ دنیا بھر کے تمام ملکوں کے ریڈیو اسٹیشن کو پکڑتا تھا۔ اس کے ذریعہ جب ہم نے بی بی سی اور دوسرے بیرونی اسٹیشنوں کو سنا تو معلوم ہوا کہ ہم کتنی بڑی دولت سے محروم تھے۔ ہر روز مختلف ممالک نہایت قیمتی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان کو سننے سے زبردست فکری اور معلوماتی فائدے ہوتے ہیں۔ مگر اس علمی خزانہ سے مستفید ہونا ہمارے لیے اس وقت تک ممکن نہ ہو سکا جب تک کہ ہم نے بڑا ریڈیو سٹ اپنے لیے حاصل نہ کیا۔

خدا اور بندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ خدا کا فیضان گویا ایک لامحدود نشر گاہ ہے۔ اس سے ہر لمحہ رزق رب کا مینھ برستا رہتا ہے۔ مگر آپ اس سے کتنا پائیں، اس کا انحصار آپ کے اپنے "ریڈیو سٹ" پر ہے۔ اگر آپ کا ریڈیو سٹ چھوٹا ہے تو آپ بہت کم چیزیں

اخذ کرسکیں گے اور اگر آپ کا ریڈ یوسٹ بڑا ہے تو آپ کے اوپر اتنا زیادہ خدا کا فیضان برسے گا گویا کہ آپ خدائی فیضان کے اتھاہ سمندر میں نہا اٹھے ہیں۔

آج کل ہر آدمی محدودیت کا شکار ہے۔ کوئی شخص ہے جو کسی گروہی خول میں بند ہے۔ کوئی اپنے آپ کو حقیر مفادات میں اس طرح گم کیے ہوئے ہے کہ اس کو آگے پیچھے کی کوئی خبر نہیں۔ کسی کی سطحیت اس کو گہری حقیقتوں کا ادارک کرنے میں مانع بنی ہوئی ہے کسی کی تنگ نظری نے اسس کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ وسیع تر دائرہ کی معرفت حاصل کر سکے۔

بند کوٹھری میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اسی طرح بند ذہن خدا کا فیضان پانے سے محروم رہتا ہے۔ خدا کا فیضان اسی کو ملتا ہے جو اپنے ذہن کے دروازے کھولنے پر راضی ہو جائے۔

خدا اور فطرت

دینِ فطرت

اگر ایک آدمی کو سمندر میں سفر کرنا ہوتو وہ ایسا نہیں کرتا کہ جس طرح سے وہ خشک زمین پر چلتا ہے اسی طرح وہ اپنے پیروں پر چلتا ہوا سمندر میں داخل ہوجائے۔ بلکہ اس وقت وہ ایک کشتی تیار کرتا ہے اور کشتی میں بیٹھ کر سمندر میں اپنا سفر جاری کرتا ہے۔

جب ایک آدمی ایسا کرتا ہےتو وہ گویا اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہے جس کے خود اپنے قوانین ہیں۔ وہ مجبور ہے کہ خدا کی اس خارجی دنیا سے کامل مطابقت کرے۔ آدمی اگر دنیا کو اپنی بنائی ہوئی دنیا سمجھتا تو وہ سمندر میں بھی اسی طرح چلنے لگتا جس طرح وہ خشکی پر چلتا ہے۔

عالم فطرت سے مطابقت کا یہ طریقہ تمام انسان اپنی زندگی کے "50 فی صد" حصہ میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ اس سے ذرا بھی انحراف نہیں کرتے۔ مگر زندگی کے بقیہ "50 فیصد" حصہ میں وہ اِس کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ اسلام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دعوت دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے دوسرے نصف حصہ میں اسی طریقہ کو اختیار کرلے جس کو وہ اپنی زندگی کے پہلے نصف حصہ میں عملاً اختیار کیے ہوئے ہے۔

انسان کی زندگی کا ایک پہلو طبیعی ہے اور دوسرا پہلو اخلاقی۔ انسان زندگی کے طبیعی پہلو میں اسی طرح خدا کا مطیع ہے جس طرح بقیہ چیزیں خدا کی پوری طرح مطیع ہیں۔ مگر اپنی زندگی کے اخلاقی پہلو میں وہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر اپنی رائے پر چلتا ہے، وہ اطاعت کے بجائے بغاوت کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اس تضاد کو ختم کردے۔ وہ صدفی صد خدا کا مطیع وفرماں بردار بن جائے۔

مادی دنیا میں قانون فطرت سے انحراف کا نتیجہ چوں کہ فوراً سامنے آجاتا ہے اس لیے آدمی مادی پہلوؤں میں اس سے انحراف نہیں کرتا۔ مگر اخلاقی دنیا میں اس کے حقیقی نتائج فوراً نہیں نکلتے اس لیے یہاں آدمی خلاف ورزی کرتا ہے۔

ایک کسان فصل بونے کے وقت قانون زراعت کی پیروی نہ کرے تو فصل کاٹنے کے دن وہ محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں جو آدمی اخلاقی قوانین کی پیروی نہ کرے اس کے حصہ میں آخرت کے دن محرومی اور شرمندگی کے سوا کچھ نہ آئے گا۔

کائنات کی معنویت

آرتھر کوئسلر (1905-1983) نے البرٹ آئن سٹائن (1879-1955) کا ایک قول نقل کیا ہے۔ اس نے کہا: "میں یہ مانتا ہوں کہ سائنسی تحقیق میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ اعلیٰ محرک جو چیز ہوتی ہے وہ کائناتی مذہبیت ہے۔ ایک معاصر سائنسی داں نے بجا طور پر کہا ہے کہ ہمارے موجودہ مادی دور میں بھی سنجیدہ علمی تحقیق کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو گہرا مذہبی آدمی ہو" (ٹائمس آف انڈیا، 5 اکتوبر 1980)۔

I maintain that cosmic religiousness is the strongest and most noble driving force of scientific research. A contemporary has said, not unrightly, that the serious research scholar in our generally materialistic age is the only deeply religious human being.

Einstein as quoted by Koestler in Janus.

مذکورہ قول میں مذہبی ہونے کا مطلب ان دیکھی معنویت پر یقین کرنا ہے۔ سائنس داں جب اپنی تلاش میں نکلتا ہے تو اس وقت جو چیز اس کی رہنما بنتی ہے وہ اس کے اندر چھپا ہوا عقیدہ ہوتا ہے کہ کائنات میں وحدت اور معنویت ہے۔ اگر وہ اس یقین سے خالی ہو تو کبھی وہ اپنی تلاش میں سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔

گویا باعتبار حقیقت ایک سائنس داں اور ایک مذہبی انسان میں کوئی فرق نہیں۔ ایک مذہبی انسان کچھ اعمال کرتا ہے۔ ان اعمال کا مقصد خدا کو خوش کرنا یا آخرت کی دنیا

میں اس کا انعام پانا ہے۔ مذہبی انسان خدا کو نہیں دیکھتا اور نہ آخرت کو۔ مگر وہ انتہائی انہماک کے ساتھ اپنے عمل میں مشغول رہتا ہے۔ اس انہماک کی وجہ نہ دکھائی دینے والی حقیقتوں پر اس کا کامل عقیدہ ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ سائنسداں کا ہے۔ وہ ساری عمر کسی حقیقت کی جستجو کرتا ہے۔ یہ حقیقت نامعلوم دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ تاہم سائنس داں پیشگی طور پر یہ یقین قائم کرلیتا ہے کہ جو چیز وہ چاہتا ہے وہ کائنات کے اندر چھپی ہوئی موجود ہے۔ اگرچہ ابھی تک وہ اس کے علم میں نہیں آئی۔

مذہب کی اصل کائنات کا معنویت پر یقین کرنا ہے۔ ایسی معنویت جو بظاہر ہم کو اپنی آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ سائنسی کھوج کی نوعیت بھی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے۔ اس دنیا میں ایک سائنس داں بھی ٹھیک اسی مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں ایک مذہبی انسان — اس دنیا میں تمام اعلیٰ حقیقتیں چھپی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ اس لیے وہ شخص زیادہ سنجیدگی کے ساتھ کسی اعلیٰ تحقیقی کام میں مصروف ہوگا جو چھپی ہوئی حقیقت پر یقین رکھنے والا ہو۔

انسان کی بے چارگی

بنگلہ دیش بے شمار چھوٹے چھوٹے جزائر کا مجموعہ ہے۔ یہاں اکثر شدید طوفان آتے ہیں اور انسانی آبادیوں کو غیر معمولی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اب تک کے ریکارڈ کے مطابق 1876ء میں یہاں سخت ترین طوفان آیا جس میں تقریباً تین لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوگئیں۔ دیگر نقصانات اس کے علاوہ ہیں۔

مئی 1985 میں یہاں پھر طوفان آیا۔ طوفانی ہوائیں 150 کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے تقریباً ایک ہزار جزیروں کے علاقہ میں داخل ہوگئیں۔ دوسری طرف سمندر کی چار میٹر سے

بھی زیادہ اونچی لہروں نے جزائر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تقریباً ایک لاکھ انسان اس کے آگے بے بس ہو کر ہلاک ہو گئے۔ سیکڑوں بستیاں تنکوں کی طرح طوفانی لہروں میں بہہ گئیں۔ ایک اخبار کے رپورٹر نے اپنا عینی مشاہدہ ان الفاظ میں بیان کیا:

Urir Char....looks like it has been bombed relentlessly. Not a single structure, save the concrete forest office stands erect. In fact so fierce has been the force of the gale and tidal waves that not only the houses, but even the building materials were washed away, leaving behind just mounds.

ایک انگریزی اخبار (29 مئی 1985) نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مہلک طوفان جو قدرت کے غصہ کے سامنے انسان کی بے چارگی کو بے نقاب کرتا ہے:

—murderous cyclones which expose man's helplessness before nature's fury.

حادثات انسان کو حقیقت واقعہ کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ خدا کی قدرت اور انسان کے عجز کا واقعاتی اعلان ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ خدا کل کے دن انسان کو پکڑے گا جس طرح آج اس نے انسان کو پکڑا ہے۔ موجودہ عارضی دنیا میں انسان اپنے عجز کو بھگتتا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا انسان کا حال اگر وہ آخرت کی ابدی دنیا میں اپنے گناہ کو بھگتے۔

انسان کی تلاش

فلپ جان بائر (1781-1717) امریکا کا ایک بڑا تاجر تھا۔ وہ کویکر اسٹیٹ ریفائننگ کمپنی (Quaker State Refining Co.) کا بانی تھا۔ اس کے یہاں صرف ایک لڑکا تھا۔ لڑکا مرا تو اس نے بھی صرف ایک لڑکی چھوڑی جس کا نام الینر رٹشی (Eleanor Ritchey) تھا۔ الینر رٹشی کے پاس بے پناہ دولت تھی مگر وہ انسانوں سے اس قدر متنفر تھی کہ اس نے

شادی نہیں کی اورتمام عمر اکیلی رہی۔ 14 اکتوبر 1968ء کو اس کا انتقال ہواتواس کی عمر 58 سال تھی۔ انسانوں سے بے رغبت ہوکر اس نے اپنی دل چسپی کے لیے عجیب وغریب عادتیں بنارکھی تھیں۔ مثلاً وہ کثرت سے جوتے خریدتی۔ مگر ہر جوتے کو وہ صرف ایک بار پہنتی تھی۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد اس کے گھر میں 1706 جوڑے جوتے موجود تھے۔ اسی طرح اس کے گھر میں اسٹیشنری کے 1344 بکس پائے گئے۔ وغیرہ

اس کی سب سے عجیب دل چسپی کتے تھے۔ وہ جب اپنی کار سے باہر نکلتی اور کوئی آوارہ کتا اس کو نظر آتا تو وہ پکڑوا کر اس کو اپنے گھر لاتی اوران کو خصوصی اہتمام سے پالتی۔ اس طرح اس کے یہاں 150 کتے جمع ہوگئے۔ اس کا گھر کتوں کی اس فوج کے لیے ناکافی معلوم ہواتواس نے اولاً بارہ ایکڑ اوراس کے بعد 180 ایکڑ زمین صرف اس لیے خریدی کہ وہاں کتوں کو خصوصی اہتمام کے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا جاسکے۔

الینر رٹشی نے موت سے پہلے ایک وصیت نامہ تیار کرایا۔ اس وصیت میں اس نے لکھا کہ میری دولت میرے پالتو کتوں کے لیے وقف ہے۔ جب ایک ایک کرکے تمام کتے مرجائیں تو میری پوری دولت الباما (امریکا) کے مدرسہ حیوانات (School of Veterinary Science) کو دے دی جائے۔

اب اس کے کتوں میں صرف آخری کتا رہ گیا ہے جس کا نام مسکٹیر (Musketeer) ہے۔ یہ 23 سالہ کتا اتنا کمزور ہوچکا ہے کہ جب وہ چلتا ہے تو اس کا پاؤں کانپتا ہے اور جب وہ چھینکتا ہے تو زمین پر گر پڑتا ہے۔ یقینی طور پر وہ بہت جلد مرجائے گا۔ اس کے بعد مذکورہ مدرسہ حیوانات کو بارہ ملین ڈالر کی رقم اچانک حاصل ہوجائے گی (ٹائمس آف انڈیا، 2 جنوری 1984)۔

آدمی کو اگر آئڈیل انسان نہ ملے تو اس کو آئیڈیل نظریہ تلاش کرنا چاہیے۔ الینر رٹشی

اگر ایسا نظریہ پالیتی تو انسان اس کے لیے محبت کا موضوع بن جاتا نہ کہ نفرت کا موضوع۔

انسان کی کمائی

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ (46:20) یعنی، اور جس دن انکار کرنے والے لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے۔ تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم ذلت کا عذاب بدلے میں پاؤ گے اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق گھمنڈ کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم نافرمانی کرتے تھے۔

دنیا میں آدمی کو جو اسباب ملتے ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت، ذہانت، مال۔ عہدہ، وسائل اور مواقع یہ سب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے دئے جاتے ہیں کہ ان سے آدمی اپنے لیے کمائی کرے۔

اس کمائی سے مراد نفسیاتی کمائی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کو آیت میں کبر اور فسق کہا گیا ہے۔ دوسری کمائی وہ ہے جو اس کے برعکس ہے۔ یعنی تواضع اور شکر۔ آدمی اگر ان اسباب کو پا کر گھمنڈ میں مبتلا ہوجائے۔ وہ ان کو ذاتی برتری حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے۔ وہ ان کو شہرت اور لیڈری حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے۔ تو گویا کہ اس نے اپنے مواقع کو ضائع کردیا۔ اس کو جو سامانِ عمل دیا گیا تھا، اس کا انجام اس نے اسی آج کی دنیا میں لے لیا۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس کو اسباب حیات ملے تو اس نے ان کو خدائی چیز سمجھ کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔ اس نے ان کو خدا کا عطیہ مان کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے ان اسباب کو اپنی

ذات کے راستہ میں استعمال کرنے کے بجائے خدا کے راستہ میں استعمال کیا۔ یہ شخص وہ ہے جس نے ان مواقع کے ذریعہ آگے کا ذخیرہ فراہم کیا۔اس نے اپنے دینوی سامان کے ذریعہ آخرت کی کمائی کی۔ایسا شخص موت کے بعد اپنے بہترین ذخیرہ کو پائے گا۔اس کی کمائی جنت کے ابدی باغوں کی صورت میں اُس کی طرف لوٹادی جائے گی — موجودہ زندگی میں ہرآدمی کو یکساں طور پر مواقع دیے گئے ہیں۔کوئی ان مواقع سے طیّبات دنیا کمارہا ہے اور کوئی طیباتِ آخرت۔

کچھ سے کچھ

دیوی سنگھ ایک مشہور ڈاکو تھا جو جنوری 1984ء میں پولیس کے ساتھ ایک مقابلہ میں مارا گیا۔مسز امرت پریتم کی ایک اتفاقی ملاقات مذکورہ ڈاکو سے سیورا گاؤں میں ہوئی۔ اس موقع پر دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی اس کی دل چسپ روداد ہندستان ٹائمس (22 جنوری 1984) میں شائع ہوئی ہے۔

دیوی سنگھ نے بتایا کہ میں نے اب تک تقریباً ایک سوڈاکے ڈالے ہیں۔ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ حکومت کے باغی ہیں۔ہم مال لوٹتے ہیں مگر ہم نے آج تک کسی لڑکی کی عصمت نہیں لوٹی۔ ہمارا ایک سخت قسم کا اخلاقی اصول ہے۔ ہمارا کوئی آدمی اس کے خلاف کرے تو ہم فوراً اس کو گولی مار دیتے ہیں۔

امرت پریتم نے کہا کہ دیوی سنگھ جی، یہ بتائیے کہ آپ کی ٹولی (گینگ) میں کل کتنے آدمی ہیں، دیوی سنگھ نے کہا کہ سات آدمی، اور آٹھواں خدا:

Seven men, and the eighth God.

بظاہر یہ جملہ، معمولی فرق کے ساتھ، قرآن کی اس آیت کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے پانچ آدمی جہاں ہوتے ہیں وہاں چھٹا خدا ہوتا ہے (المجادلہ،

58:7) پھر کیا ڈاکو کی بات انہیں معنوں میں ہے جن معنوں میں وہ قرآن میں آئی ہے۔ظاہر ہے کہ ایسانہیں ہے۔دونوں کے درمیان لفظی مشابہت کے سوا کوئی اور چیز مشترک نہیں۔

ڈاکو نے کس معنی میں یہ بات کہی ، وہ خود مذکورہ انٹرویو میں موجود ہے۔اس نے کہا کہ ہم لوگ ڈاکہ کے ذریعہ جو کچھ حاصل کرتے ہیں اس کو ہم ٹولی کے درمیان بانٹتے ہیں۔مثال کے طور پر میری ٹولی میں سات افراد ہیں تو ہم لوٹے ہوئے مال کے آٹھ حصے بناتے ہیں۔سات حصے اپنے افراد کے لیے اور ایک حصہ خدا کے لیے۔خدا کا جو حصہ ہے اس کو ہم کسی غریب کو دیدیتے ہیں۔آمدنی کا ایک حصہ مذہب کے نام پر خدا کو دینا یہ تمام ڈاکوؤں کا طریقہ ہے۔

قرآن کا خدا خوف پیدا کرتا ہے اور ڈاکوؤں کا خدا بے خوفی۔ خدا اس لیے تھا کہ وہ آدمی کو ڈاکہ بازی سے روکے۔مگر ڈاکوؤں نے خدا کا حصہ لگا کر اس کو اپنے ڈاکہ کا چوکیدار بنا یا لیا۔گویا جب وہ سات مل کر ڈاکہ ڈالیں تو خدا ان کا آٹھواں بن کر ان کی حفاظت کے لیے موجود رہے۔

محرومی

فرانس میں سحر ونجوم تیزی سے پھیل رہے ہیں۔اندازہ کیا گیا ہے کہ 1984ء میں فرانس کے جن شہریوں نے ساحروں اور جوتشیوں سے رجوع کیا ان کی تعداد تقریباً آٹھ ملین ہے۔یعنی فرانس کے ہر چار آدمیوں میں سے ایک آدمی۔

فرانس میں جوتش اور رغیب دانی باقاعدہ تجارتی پیشہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ ٹیکس کے محکمہ کے مطابق پچاس ہزار افراد باقاعدہ محکمہ ٹیکس میں اس اعتبار سے رجسٹرڈ ہیں۔ یہ تعداد فرانس میں پادریوں یا ڈاکٹروں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ان لوگوں کی آمدنی 500 ملین سے لے کر 600 ملین ڈالر سالانہ تک ہوتی ہے۔

اے ایف پی نے پیرس سے رپورٹ دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

With the deepening economic recession, more and more people are turning to the occult for relief for their physical and psychological ailments.

گہرے اقتصادی بحران کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کے لیے غیب دانوں سے رجوع کر رہے ہیں (ٹائمس آف انڈیا 5 مارچ 1985)۔

انسان کو بار بار یہ تجربہ ہوتا ہے کہ ظاہری مادی اسباب اس کا سہارا بننے کے لیے ناکافی ہیں۔ وہ معلوم اسباب سے مایوس ہو کر نامعلوم اسباب کی طرف دوڑتا ہے۔ مگر نامعلوم اسباب کی تلاش میں کسی انسان کا سہارا پکڑنا سراسر بے حقیقت ہے۔ یہ ایسی چیز کا سہارا پکڑنا ہے جس کے اندر سہارا بننے کی طاقت نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا سہارا صرف ایک ہے۔ اور وہ خدا ہے۔ مادی اسباب کی بے مایگی اس لیے تھی کہ آدمی خدا کی طرف رجوع کرے۔ مگر مادی اسباب کے عجز کا تجربہ اس کو ایک اور عاجز کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ حقیقت کا سراغ پانے کے بعد آدمی دوبارہ حقیقت کو کھو دیتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے

بیٹے نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کو مارا۔ ماں نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک معاملہ جو بظاہر مار کا معاملہ تھا اس کو ماں نے محبت کا معاملہ بنا دیا۔ اس نے "برائی" کو "بھلائی" کے خانہ میں ڈال دیا۔ اس نے ایک قابل سزا چیز کو قابل انعام قرار دے دیا۔ یہ واقعہ جو ہر گھر میں گزرتا ہے، یہ خدا کی صفات کمال میں سے ایک صفت کی ہلکی سے جھلک ہے جو ماں کے رویہ کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ یہ خدا کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ خدا نے اپنی رحمتوں کے کیسے

عجیب نمونے اس دنیا میں بکھیر دیے ہیں۔شفقت کی یہ انوکھی قسم جو ماں کے اندر پائی جاتی ہے اس کو ماں نے خلق نہیں کیا ہے۔اس کا خالق اللہ ہے۔ پھر جو اس کا خالق ہے اس کے اندر یہ صفت کمال درجہ میں پائی جانی چاہیے۔

آدمی غیب کو نہیں جانتا،اس بنا پر اس کو دنیا کی زندگی میں طرح طرح کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔اس کی قوت ارادی کمزور ہے،اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی سطحی جذبہ سے مغلوب ہوجاتا ہے اور بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔آدمی کے وسائل محدود ہیں،اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ باہر کے اسباب وعوامل پر وہ قابو نہیں پاتا اور شکست کھا جاتا ہے۔اس قسم کی چیزوں نے دنیا میں انسان کی زندگی کو ایک المیہ بنا دیا ہے۔زمین پر چلنے والا ہر آدمی خواہ وہ کوٹھی میں ہو یا جھونپڑی میں،اس احساس میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ ایک ناکام انسان ہے،وہ جو کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا اس کو وہ حاصل نہ کرسکا۔یہاں کا ہر انسان ایک مایوس انسان ہے، خواہ بظاہر وہ فربہ جسم اور ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

کیا اس المیہ کو طربیہ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی کی منزل پر ہم اس حال میں پہنچیں کہ ہماری ناکامیاں کامیابیوں کی صورت اختیار کر چکی ہوں ،ہمارے قصور کو انعام کے خانہ میں ڈال دیا گیا ہو،ماں کی زندگی میں خدا نے اپنی صفات کی جو ایک جھلک دکھائی ہے وہ اسی سوال کا ایک مثبت جواب ہے۔ خدا اپنے بندوں کے لیے اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر اس واقعہ کو رونما کرسکتا ہے جو ماں اپنے بچہ کے لیے بہت چھوٹے پیمانہ پر ظاہر کرتی ہے۔ماں کے رویہ کی صورت میں خدا نے دنیا میں جو نشانی قائم کی ہے وہ اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ مانگنے والے کو یہ انعام بھی دیتا ہے کہ — وہ اس کے "نہیں" کو "ہے" میں تبدیل کردے۔مگر ایسا انعام صرف اس شخص کے لیے مقدر ہے جو خدا کو اپنی "ماں" کا درجہ دے کر اپنے آپ کو اس کا "بیٹا" بنا چکا ہو۔

عجز کی تلافی

خدا قادر مطلق ہے اور انسان عاجز مطلق۔ خدا اور انسان کے درمیان جو تقسیم ہے وہ زیادہ اختیار اور کم اختیار کی نہیں ہے بلکہ اختیار اور بے اختیاری کی ہے۔ یہاں سارا اختیار خدا کی طرف ہے اور ساری بے اختیاری انسان کی طرف۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ایسی تخلیق کا کیا جواز ہے جس میں انسان کو حقیقی طور پر کچھ دیا ہی نہ گیا ہو۔ خدا کے لیے کیوں کر جائز تھا وہ ایسے انسان پیدا کرے جو سراسر عاجز ہوں، جن کو نہ اپنے آپ پر کوئی اختیار حاصل ہو اور نہ اپنے سے باہر کی دنیا پر۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف وہ ہوسکتا ہے جس میں انسان کے عجز کی کامل تلافی موجود ہو۔ کامل تلافی سے کم کوئی چیز اس سوال کا حقیقی جواب نہیں بن سکتی۔ کامل تلافی کا مطلب یہ ہے کہ جو جواب دیا جائے اسی سطح پر ہو جو سوال کی سطح ہے۔ یعنی انسان کا عجز بذات خود اس کی بے اختیاری کی تلافی ہو جائے۔

اس سوال کا جواب قرآن میں اور پیغمبر کی تعلیمات میں واضح طور پر موجود ہے۔ اور وہ خدا کی یہ رحمت خاص ہے کہ اس نے صرف مانگنے کو پانے کے لیے کافی بنا دیا ہے۔ آدمی اگر حقیقی طور پر خدا سے مانگنے والا بن جائے تو یقینی طور پر وہ اپنے لیے پانے والا بھی بن جائے گا۔ انسان جب ذاتی اقتدار کا مالک نہیں تو وہ دیے ہی سے پاسکتا ہے۔ چنانچہ خدا نے اس کو اپنی طرف سے دے دیا۔ حقیقی دعا کے لیے قبولیت کی ضمانت ہونا یہی گویا اس کو دے دینا ہے۔

حدیث میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ — الدَّعْوَۃُ لَا تُرَدُّ (مسند احمد، حدیث نمبر 13357)۔ یعنی، بندہ اپنے خدا کو اگر حقیقی طور پر پکارے تو اس کی پکار کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ حضرت مسیح نے اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا:

مانگو توتم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈوتو پاؤ گے۔دروازہ کھٹکھٹاؤ توتمہارے واسطے کھولا جائے گا۔کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جوڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔تم میں ایسا کون سا آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اسے پتھر دے دے۔یا اگر مچھلی مانگے تو اسے سانپ دے دے۔پس جب کہ تم برے ہوکر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہوتوتمہارا باپ جوآسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا(متی،7:7-11)۔

کائناتی نمونہ

ایمرسن (1803-1882) کا قول ہے کہ فطرت اس اصول پر عمل کرتی ہے کہ— سب ہر ایک کے لیے اور ہر ایک سب کے لیے:

Nature works on a method of 'all for each and each for all'.

یہ ایک لفظ میں کائنات کے عمل کی نہایت جامع تعبیر ہے۔کائنات میں بےشمار چیزیں ہیں۔مگر ان کا عمل حد درجہ توافق کے ساتھ ہوتا ہے۔ان میں سے ہر چیز اس طرح عمل کرتی ہے کہ اس کا عمل دوسری تمام چیزوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔اسی طرح تمام چیزیں اس طرح متحرک ہوتی ہیں کہ ان کی حرکت ہر واحد جزء سے کامل طور پر مطابق رہے۔

یہ گویا خدا کا ایک نمونہ ہے جو اس نے اپنی دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔انسان کو بھی اسی نمونہ پر چلنا ہے۔انسانی آبادی میں بھی یہی نظام مطلوب ہے کہ ہر فرد اس طرح زندگی گزارے کہ اس سے دوسروں کو فائدے پہنچے اور مجموعی طور پر پوری انسانیت اس طرح کام کرے کہ اس کا کام فرد کی ترقی اور کامیابی میں معاون بن رہا ہو۔فرد کا عمل جماعت سے ہم آہنگ ہو اور جماعت کا عمل فرد سے ہم آہنگ۔

کائنات کی صورت میں خدا نے ایک زندہ نمونہ قائم کر دیا ہے جو ہر صبح وشام لوگوں

کو بتارہا ہے کہ وہ کس طرح رہیں اور کس طرح نہ رہیں۔ کون سا انسان خدا کے یہاں قابل قبول ٹھہرے گا اور کون سا انسان خدا کے یہاں رد کر دیا جائے گا۔

ایک درخت اور کائنات کی مثال لیجیے۔ کائنات میں حرارت ہے۔ کشش ہے۔ ہوا ہے، پانی ہے۔ ان میں سے ہر چیز درخت کی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ بیکٹیریا سے لے کر سورج تک تمام چیزیں درخت کے لیے گویا کائناتی دسترخوان ہیں۔ ہر چیز درخت کو عین وہی چیز دے رہی ہے جو اس کی فطرت کے مطابق اسے ملنا چاہیے۔

دوسری طرف ایک درخت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ درخت اس دنیا کی کسی چیز سے ٹکرائے بغیر اپنا ارتقائی سفر طے کرتا ہے۔ اس کی لکڑی، اس کی پتی، اس کا پھول، اس کا پھل، غرض اس کی چیز بقیہ دنیا کے لیے عین کارآمد ہے۔ حتیٰ کہ اس کا کاربن لینا اور آکسیجن نکالنا بھی عین خارجی دنیا کے تقاضوں کے مطابق ہے — جزء اور کل یا فرد اور اجتماع کے درمیان یہی کامل مطابقت انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اس کے سوا انسان کی کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (1889-1975) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کناڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کناڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کناڈا میں حکومت اسرائیل

کے سفیر مسٹر ہرزگ (1921-1972) تھے۔مسٹر ہرزگ نے برطانوی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کرلیا۔اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مارڈالا تھا۔اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جاسکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔کسی شخص کے لیے سو فیصد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔قاتل کہلانے کے لیے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی جھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے۔یہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ محرومی، مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی

ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

اژدہا بھی

اژدہا کا لفظ سنتے ہی ایک خطرناک جانور کا تصور سامنے آتا ہے۔ اژدہے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ہندستان کے جنگلوں میں اس خوفناک سانپ کی جو قسم پائی جاتی ہے اس کو ماہرین حیوانات مالورس اژدہا (Python molurus) کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی 20 فٹ ہوتی ہے اور وزن 200 پونڈ سے زیادہ جب کہ وہ پورا ہو جائے۔

تاہم دوسرے وحشی جانوروں کی طرح اژدہا بھی کوئی خطرناک جانور نہیں۔ وہ کسی انسان یا کسی جاندار پر صرف دو حالتوں میں وار کرتا ہے — جب کہ وہ بہت بھوکا ہو، یا اس پر حملہ کیا جائے۔ عام حالات میں وہ بالکل بے ضرر جانور کی طرح پڑا رہتا ہے۔ ایک ماہر حیوانات نے اژدہے کے طویل مطالعہ کے بعد لکھا ہے:

> A python, however large it may be, is nervous by nature and like all other sankes will never attack deliberately nor will it become aggressive unless provoked. It threatens by hissing or disappears if encountered in the wild but does not stand up and fight as one migt imagine.

اژدہا، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، فطری طور پر وہ عصبی مزاج کا ہے۔ وہ دوسرے تمام سانپوں کی طرح کبھی بالقصد حملہ نہیں کرے گا۔ اور نہ کبھی وہ جارح بنے گا۔ الّا یہ کہ اسے مشتعل کر دیا جائے۔ اگر جنگل میں اس کا سامنا پیش آجائے تو وہ آواز نکال کر ڈرائے گا یا غائب ہو جائے گا مگر وہ نہ تو اٹھے گا اور نہ لڑائی کرے گا۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے (ہندستان ٹائمس، 19 اکتوبر 1984)۔

اژدہے کے اندر یہ خصوصیت محض اتفاقاً نہیں۔ وہ براہ راست خالق کائنات کا منصوبہ ہے۔ اژدہا فطرت کی ایک خاموش پکار ہے۔ وہ عمل کی زبان میں انسان سے کہہ رہا ہے کہ —اگرتم اژدہا ہوتب بھی کسی کو نہ کاٹو۔ اگرتم زوراور قوت میں دوسروں سے بڑھ جاؤ تب بھی دوسروں کو نہ ستاؤ۔

کیسا عجیب ہے وہ انسان جوایک ایسی دنیا میں ظلم کرتا ہے جہاں شیر اوراژدہے تک کی سطح پراس کوظالم نہ بننے کاسبق دیا جارہا ہے۔

خداپرستی

موجودہ دنیا میں زندگی گزارنے کی دوقسمیں ہیں—ایک خودرخی (self-oriented) زندگی۔ دوسری خدارخی (God- oriented) زندگی۔

آدمی یاتو خود پرست ہوگا یا خدا پرست۔ اس کا مرکز ومحور اپنی ذات ہوگی یاخدا کی ذات۔ وہ یاتواپنے رخ پر دوڑے گا یاخدا کے رخ پر۔ زندگی کے بس یہی دوطریقے ہیں۔ ان کے سوا زندگی کا کوئی تیسرا طریقہ نہیں۔

خودرخی زندگی وہ ہے جس میں آدمی کی توجہ کا مرکز صرف اس کی اپنی ذات ہو۔ وہ بس اپنے آپ میں جئے۔ وہ اپنے وسائل کواپنی ذات کی تکمیل میں خرچ کرے۔ فلسفیانہ زبان میں اس طرزِ فکر کانام ذاتی طرزفکر (Self-centered thinking) ہے۔ اوراخلاقی زبان میں اِس کو خودغرضی، بے اصولی، خواہش پرستی اور مفاد پسندی کہا جاتا ہے۔ ایسا آدمی بظاہر انسان ہوتا ہے۔ مگر اندر سے حیوان کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے جینے کی سطح اورحیوانات کے جینے کی سطح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

خدارخی زندگی وہ ہے جس میں آدمی کی توجہات کامرکز صرف ایک خداہو۔ خدا کو وہ ایک ایسے بڑے کی حیثیت سے پالے جس کے بعد اپنی ذات سمیت ہر چیزاس کی نظر میں

چھوٹی ہو جائے ۔اس کو یاد آئے تو خدا کی یاد آئے ۔اس کو امید ہوتو خدا سے امید ہو۔ اس کوڈر ہوتو صرف خدا کا ڈر ہو۔ خدا کی ذات اس کی نظر میں سب کچھ ہواور اپنی ذات اس کی نظر میں بے کچھ۔

یہی دوسرا انسان خدا پرست انسان ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند انسان ہے کیوں کہ اس نے وہ روش اختیار کی ہے جو کائنات کے مجموعی نظام سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔اس نے اس صحیح راستہ کو پالیا ہے جس پر چلنے والا اس حقیقی منزل تک پہنچ جاتا ہے جس کے سوا خدا کی اس کائنات میں دوسری کوئی منزل نہیں۔

انسان کی منزل خدا ہے۔اس سے کمتر کوئی چیز انسان کی منزل نہیں ہوسکتی۔

زندگی کا مسئلہ

برازیل جنوبی امریکا کا ایک ملک ہے جو اٹلانٹک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی 119 ملین ہے جس میں زیادہ تر رومن کیتھو لک ہیں۔ برازیل میں 1964 سے فوجی حکومت قائم تھی۔فوجی حکومت کے خلاف جن جمہوریت پسند لیڈروں نے تحریک چلائی ان میں ایک ممتاز نام ٹینکر یڈ نویس (1910-1985) کا تھا۔ مسٹر نویس نے بے شمار مصیبتیں اٹھائیں۔21 سال کی پر مشقت جدو جہد کے بعد بالآخر وہ ملک کے عوام کو حکومت کے خلاف منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔فوجی حکمراں مجبور ہو گئے کہ ملک میں عام انتخابات کرائیں۔

جنوری 1985ء میں الیکشن ہوا۔اس ا یکشن میں مسٹر نویس بھاری اکثریت سے صدر منتخب ہو گئے۔ اخبارات اور ریڈیو نے ان کی کامیابی کا شاندار تذکرہ کیا۔ایک اخبار نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ — ان کی جیت ایک شخص کے تقریباً پچاس سالہ سیاسی کردار کی تکمیل ہے:

His victory capped a political career spanning nearly 50 Years.

15 مارچ 1985ء کومسٹر نویس کی حلف برداری کی رسم صدارتی محل میں ادا کی جانے والی تھی کہ عین اس روز چند گھنٹہ پہلے وہ سخت بیمار پڑ گئے ۔ انہیں فوری اسپتال لے جایا گیا۔ ملک کے سب سے بہتر اسپتال میں وہ ایک مہینہ تک ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں رہے۔ اس مدت میں ان کا سات بار آپریشن کیا گیا۔مگر ساری کوشش ناکام ہوگئی ۔ 21اپریل 1985ء کومسٹر نویس کا انتقال ہوگیا۔اس وقت ان کی عمر 75 سال تھی۔

کیسا عجیب ہے انسان کا یہ انجام کہ وہ کوشش کرتا ہے مگر وہ اس کا پھل نہیں پاتا۔اس کے لیے فتح کا تاج تیار کیا جاتا ہے مگر اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس کو اپنے سر کی زینت بنائے۔اس کی کوششوں کی تکمیل اس کی بربادیوں کی تکمیل بن جاتی ہے۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا صرف عمل کرنے کی جگہ ہے۔وہ پانے کی جگہ نہیں۔ پانے کی جگہ کوئی اور ہے جو اس کے ماورا ہے۔

زلزلہ درکار ہے

خدا کی جنت جتنی نفیس ہے اتنی ہی بڑی قیمت اس کی ادا کرنی پڑتی ہے۔جنت صرف ان حوصلہ مندوں کے لیے ہے جو بھونچال کی قیمت پر اس کو حاصل کرنے کے لیے راضی ہوجائیں۔جنت کو پانے کے لیے آدمی کو ایسے کٹھن مرحلہ سے گزرنا ہوتا ہے جس کو انسانی زبان میں صرف زلزلہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جو آدمی آخرت کی ابدی جنت کا طالب ہو اس کو سب سے پہلے اپنی ذات کے اندر زلزلہ لانا ہے۔جس طرح ایٹم کے مجموعہ میں بے پناہ طاقت چھپی ہوتی ہے۔مگر یہ طاقت اس

وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ ایٹم کو توڑا جائے۔یہی معاملہ انسان کا ہے۔ہر آدمی کے اندر ایک عظیم ربانی انسان چھپا ہوا ہے۔موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک انفجار برپا کرے۔تا کہ اس کے اندر چھپا ہوا ربانی انسان باہر آسکے۔

ہر آدمی اصلاً فطرت خداوندی پر پیدا ہوتا ہے۔مگر ماحول، روایات، خواہشات اور اس طرح کے دوسرے اسباب اس کے اوپر تہ بہ تہ پردے ڈال دیتے ہیں۔آدمی ایک مصنوعی غلاف میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔جس کے تحت وہ سوچتا ہے اور جس کے مطابق وہ جیتا ہے۔اسی مصنوعی پردہ کو پھاڑنے میں انسان کی تمام ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔اپنے ذہنی سانچہ کو توڑنا بلا شبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔مگر اسی مشکل ترین کام میں خدا نے تمام انسانی سعادتوں کا راز چھپا دیا ہے۔

قرآن کے الفاظ میں انسان جب اپنے شاکلہ کو توڑتا ہے تو اس کا شاکلہ خدا کے شاکلہ کے ہم سطح ہو جاتا ہے۔اس کی ربانی فطرت جاگ اٹھتی ہے۔وہ براہ راست خدائی فیضان کی زد میں آجاتا ہے۔وہ محدودیت کی دنیا سے نکل کر ابدیت کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔اس کی سوچ خدائی سوچ بن جاتی ہے۔اس کا اخلاق خدائی اخلاق کے ہم رنگ ہو جاتا ہے، جس طرح بیج کے اندر ایک شاداب درخت چھپا ہوا ہے۔مگر یہ درخت اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب کہ بیج ٹوٹے اور اپنے کو فنا کرنے کے لیے تیار ہو۔اسی طرح ہر آدمی کے اندر ایک ربانی انسان چھپا ہوا ہے جو جنت کی حسین دنیا کا باسی بن سکے۔مگر اس چھپے ہوئے انسان کا وقوع میں آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ انسان اپنے اندر ایک زلزلہ پیدا کرنے کے لیے تیار ہو۔وہ مصلحتیں اور محبوبات جن کو بچانے کے لیے آدمی اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے انہیں مصلحتوں اور محبوبات کا ٹوٹنا جنت کے دروازہ کا کھلنا ہے۔مگر اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے۔

خدا کی معرفت

خدا کی یافت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ — ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ حالانکہ قیامت کے دن پوری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو لوگ کرتے ہیں (39:67)۔

اس سلسلے میں ایک حدیث مختلف روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز منبر پر سورہ زمر کی مذکورہ آیت پڑھی:

وَرَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ هَكَذَا بِيَدِهِ يُحَرِّكُهَا يُقْبِلُ بِهَا وَيُدْبِرُ يُمَجِّدُ الرَّبُّ نَفْسَهُ أَنَا الْجَبَّارُ أَنَا الْمُتَكَبِّرُ أَنَا الْمَلِكُ أَنَا الْعَزِيزُ أَنَا الْكَرِيمُ فَرَجَفَ بِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمِنْبَرُ حَتَّى قُلْنَا لَيَخِرَّنَّ بِهِ (مسند احمد، حدیث نمبر 5414)۔ یعنی، اور رسول اللہ اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہے تھے اور آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ اللہ اپنی بزرگی بیان کرے گا۔ اور کہے گا میں جبّار ہوں۔ میں متکبر ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں عزیز وکریم ہوں۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ پر لرزہ طاری ہوگیا حتی کہ ہم نے کہا آپ منبر کے ساتھ گر پڑیں گے۔

جب ایک آدمی خدا کا حقیقی ادراک کرتا ہے تو اس کا حال وہی ہوجاتا ہے جو اوپر کی مثال میں خدا کے رسول کا نظر آتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو اس وقت حسی طور پر نہیں دیکھ رہے تھے۔ مگر خدا کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے آپ کا جسم ہل گیا۔ دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا کہ آپ زمین پر گر پڑیں گے۔

اس کا نام خدا کی معرفت ہے۔ خدا کی معرفت اس مالک کائنات کی معرفت ہے جو

سب سے بڑا ہے۔ جو سب سے طاقتور ہے۔ ایسے خدا کو پانا محض سادہ پانا نہیں ہوتا۔ وہ آدمی کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر بھونچال کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کی معرفت خدا کو دیکھے بغیر دیکھ لینا ہے۔ یہ اس وقت خدا کے سامنے ڈھ پڑنا ہے جب کہ خدا ابھی زمین و آسمان کا پردہ پھاڑ کر عیاناً انسان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

معرفت

ہندوستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر سی، وی، رمن (1888-1970) سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں نے جو چیزیں دریافت کی ہیں ان میں ان کا اپنا کوئی خاص کارنامہ نہیں۔ یہ دریافتیں زیادہ تر اتفاقات کے نتیجہ میں حاصل ہوئیں۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا 'ہاں، مگر ایسا اتفاق صرف سائنس داں کو پیش آتا ہے"۔

دریافت دراصل ذہنی ترکیز (Concentration of Mind) کی قیمت ہے۔ جب آدمی کسی خاص موضوع پر اپنے ذہن کو پوری طرح لگا دیتا ہے تو اس موضوع کے بارے میں اس کو خاص بصیرت حاصل ہوجاتی ہے۔ سوتے جاگتے ہر وقت اس کا ذہین اسی کے اندر مشغول رہتا ہے۔ اس موضوع کی دنیا سے اس کا بے حد قریب فکری رابطہ ہو جاتا ہے۔

سائنسی دریافتیں اکثر اسی قسم کے ترکیز فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جب ایک آدمی کسی چیز سے اتنا زیادہ اپنے کو متعلق کر لیتا ہے تو اس چیز کے بارے میں اس کو خاص پہچان حاصل ہوجاتی ہے۔ ذرا سا اشارہ دیکھتے ہی وہ اس کی پوری بات کو پکڑ لیتا ہے۔ دریافت اکثر حالات میں جزء سے کل تک پہنچنے کا دوسرا نام ہوتی ہے، اور اس قسم کا پہنچنا ہمیشہ اسی کے لیے ممکن ہوتا ہے جو پہلے سے اس موضوع میں لگا ہوا ہو اور اس کی بابت پوری آگہی رکھتا ہو۔

یہ بات جو سائنسی معرفت کے لیے صحیح ہے۔ یہی دینی معرفت کے لیے بھی درست

ہے۔خدا بھی آدمی کے لیے ایک دریافت ہے۔مگر یہ دریافت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جس نے اپنے آپ کو خدا میں شامل کر رکھا ہو۔

جب آدمی اپنا ذہن خدا میں لگائے ہوئے ہو۔وہ خدا کی نظر سے دیکھتا ہو اور خدا کے کان سے سنتا ہو۔وہ دوسری تمام باتوں سے اپنی توجہ ہٹا کر خدا کی طرف مائل ہو گیا ہو، جب کوئی شخص اس قسم کی زندگی گزارے تو اس کو بار بار وہ اتفاقات پیش آتے ہیں جن کو معرفت کہا جاتا ہے۔دنیا کی چیزوں کا مشاہدہ، انسانی تاریخ کا مطالعہ، اپنے حالات پر غور وفکر ہر چیز میں اس کا ذہن بار بار حقیقت اعلیٰ کی طرف منتقل ہوتا ہے، وہ بار بار ربانی تجلیات کو پاتا رہتا ہے۔خدا کی معرفت خدا میں جینے کی نقد قیمت ہے۔یہ قیمت اسی کو ملے گی جو خدا میں جی رہا ہو۔جو کسی اور چیز میں جئے وہ خدا کی معرفت کا رزق کبھی نہیں پا سکتا۔

توحید اور شرک

آدمی کو موجودہ دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ایک سہارا درکار ہے۔ہر آدمی کسی نہ کسی بڑائی میں جیتا ہے۔مومن وہ ہے جو خدا کی بڑائی میں جئے اور غیر مومن وہ ہے جو خدا کے سوا دوسری بڑائیوں میں جیتا ہو۔

قدیم زمانہ کا مشرک انسان چاند اور سورج کی بڑائی میں جیتا تھا۔موجودہ زمانہ کا مادہ پرست انسان مادی قوتوں کی بڑائی میں جی رہا ہے۔کچھ لوگ دولت کو بڑا بنا کر اس کو اپنی تلاش کا جواب بنائے ہوئے ہیں۔کچھ لوگ انسانی اکابر کی بڑائی میں گم رہتے ہیں اور اس طرح اپنے اس فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔

یہ تمام کی تمام شرک کی صورتیں ہیں۔یہ ایک حقیقی تلاش کا مصنوعی جواب ہے۔مومن وہ ہے جو فطرت کی تلاش کے سچے جواب کو پا لے۔جو ظاہری چیزوں میں نہ اٹکے۔بلکہ ظاہری اور نمائشی چیزوں سے گزر کر آخری حقیقت تک پہنچ جائے۔

مومن انسان جب ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی ظاہری چمک سے فریب نہیں کھاتا۔ یہ تمام چیزیں اس کو صرف مخلوق نظر آتی ہیں۔ وہ اس کو اسی مقام عجز پر دکھائی دیتی ہیں جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔ مومن ان چیزوں میں سے کسی پر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔

مومن وہ ہے جو اپنی تمام چیزوں کو خدا کا عطیہ سمجھے۔ جو اپنے عجز کی تلافی خدا سے کرے۔ جس کو زمین کے حسن میں خدا کا حسن دکھائی دے۔ جس کو کائنات کی عظمت میں خدا کی عظمت نظر آئے۔ جو تمام بڑائیوں کو خدا کا عکس سمجھتا ہو۔ جو خدا کے جلووں میں اس طرح گم ہو جائے کہ اس کی حمد خوانی اس کا لذیذ ترین مشغلہ بن جائے۔

ایمان کا مطلب دراصل حاضر میں غائب کو دیکھنا ہے۔ جو کچھ سامنے ہے اس میں اس چھپی ہوئی چیز کو دیکھ لینا ہے جو سامنے نہیں ہے۔ جس کو یہ نظر حاصل ہو جائے اس کو اپنے چاروں طرف صرف خدا کی بڑائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ صرف خدا کو اپنا سب کچھ بنالیتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ اپنی بڑائی نظر آئی اور نہ دوسروں کی بڑائی۔

دریافت

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے دریافت کرنے والے:

The Discoverers: A History of man's Search to Know His World and Himself by Daniel Boorstin , Randon House , p.745

مصنف نے اس کتاب میں دریافتوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ مختلف لوگ جنھوں نے کسی شعبۂ علم میں کوئی نئی چیز یا نیا نظریہ دریافت کیا وہ مصنف کی خصوصی توجہ کا

مرکز بنے ہیں۔ مصنف دریافت کرنے والوں کی شخصیت سے اتنا متاثر ہے کہ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ میرا ہیرو دریافت کرنے والا انسان ہے:

My hero is Man the Discoverer

یہ صرف مذکورہ مصنف کی بات نہیں بلکہ یہ عام انسانی فطرت کی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "دریافت" ہر انسان کی محبوب ترین چیز ہے۔ جو آدمی کسی نئی چیز کا انکشاف کرے وہ لوگوں کی نظر میں اعلیٰ ترین انسان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

حق کا داعی بھی ایک اعتبار سے دریافت کرنے والا (discoverer) ہوتا ہے۔ وہ باطل کے مقابلہ میں حق کو دریافت کرتا ہے۔ جو چیز لوگوں کو معلوم نہیں ہے اس کو معلوم کرکے لوگوں کے سامنے رکھتا ہے: عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (96:5)۔

دریافت حقیقۃً لوگوں کی چھپی طلب کے جواب کا دوسرا نام ہے۔ لوگوں کے دل میں یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ وہ مواصلات (communications) کے لیے تیز رفتار ذریعہ پالیں۔ جب ایک شخص نے تیز رفتار ذریعہ سفر دریافت کیا تو گویا اس نے ہزاروں برس سے لوگوں کی چھپی ہوئی تمنا کو پورا کیا۔ اس بنا پر وہ لوگوں کا محبوب بن گیا۔

یہی معاملہ حق کا ہے۔ ہر دور میں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے خدا کے بندے اس تلاش میں ہوتے ہیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ اب ایک شخص جو خود بھی اس تلاش سے دو چار تھا وہ حق کو اس کی کامل صورت میں دریافت کرتا ہے۔ اور اس کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے چھپے ہوئے سوال کا جواب بن جائے۔ جب ایسا شخص ظہور میں آتا ہے تو بالکل فطری طور پر وہ ان تمام لوگوں کا "ہیرو" قرار پاتا ہے جن کو اس نے تلاش کے دلدل سے نکالا تھا — دریافت کرنے والا شخص لوگوں کی نظر میں ہیرو بن جاتا ہے اور اسی طرح حق کو دریافت کرنے والا بھی۔

سب کچھ عجیب ہے

1957 میں روس نے پہلا اسپٹنک (Sputnik) خلا میں بھیجا تھا۔ امریکا نے 12 اپریل 1981 کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔

کولمبیا کا وزن 75 ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار 26 ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ 54 گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد 36 چکر لگا کر 10 لاکھ میل طے کیے اور پھر 14 اپریل کو واپس آ گئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈر اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر 345 کیلو میٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہوگئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت 11500 درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل 31 ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکا کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف 10 سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لیے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں 20 ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کرسکیں۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر جان ینگ (1930-2018ء) تھے۔ ان کی عمر اس وقت 50 سال ہے۔ 54 گھنٹہ بے وزنی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا — کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا:

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے: میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی خدائی عجوبہ کو دیکھ لے۔

خدا سے نسبت

ایک بزرگ فجر کی نماز کے وقت اپنے گھر سے نکلے اور تیزی سے مسجد کے لیے روانہ ہو گئے مگر جب وہ مسجد کے اندر داخل ہوئے تو ان کے قدموں کی رفتار سست ہو گئی۔ اس وقت اگرچہ پہلی صف میں کافی جگہ تھی۔ مگر وہ پیچھے کی صف میں رک گئے اور مسجد کے ایک کنارے بیٹھ کر جماعت کا انتظار کرنے لگے۔ نماز کے بعد ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت، یہ کیا بات ہے کہ آپ مسجد کی طرف تیزی سے روانہ ہوئے مگر جب مسجد کے اندر پہنچے تو بڑھ کر اگلی صف میں جگہ لینے کے بجائے پچھلی صف میں ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

بزرگ نے جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ جب میں گھر سے مسجد جانے کے لیے نکلا تو مجھ کو ایسا لگا کہ میں ایک ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں خدا کی رحمت ومغفرت تقسیم ہو رہی ہے۔ اس وقت شوق ہوا کہ میں لپک کر جلد سے وہاں پہنچوں۔ مگر جب اندر داخل ہوا تو خدا کی عظمت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا احساس مجھ پر غالب آ گیا اور میرے قدموں کی رفتار اچانک سست پڑ گئی۔

"آپ سست قدموں سے بھی تو اگلی صف میں جا سکتے تھے" آدمی نے دوبارہ پوچھا۔ بزرگ نے کہا کہ تمہارا یہ کہنا صحیح ہے۔ مگر اس وقت مجھ پر یہ احساس طاری ہوا کہ خدا کی رحمت ومغفرت کا خزانہ تو ختم ہونے والا نہیں۔ اگر میں پیچھے بیٹھ جاؤں تب بھی اس کی تقسیم کا سلسلہ ضرور یہاں تک پہنچ جائے گا۔

اس کے بعد بزرگ نے کہا کہ بندے کی نجات کا دار ومدار اس پر ہے کہ وہ خدا کی صفات کا ادراک کرے۔ بندے اور خدا کے درمیان اس کی صفات ہی کے ذریعہ اتصال قائم ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص خدا کی صفتوں میں سے کسی صفت کا ادراک کرتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو خدا کی زد میں لاتا ہے۔ جس طرح سورج کسی کو اس وقت روشن کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو اس کی کرنوں کی زد میں لائے۔ اسی طرح ایک بندہ اس وقت اپنے رب کی زد میں آتا ہے جب کہ وہ خدا کی صفات کی معرفت حاصل کرے۔

بزرگ جب مسجد کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے خدا کی حیثیت دریافت کی کہ خدا دینے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی دینے والا نہیں۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو انھوں نے خدا کے بڑے ہونے کو پہچانا اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کو دریافت کیا۔ پہلے مرحلہ میں انھوں نے معطی ہونے کی حیثیت سے خدا سے نسبت قائم کی اور دوسرے مرحلہ میں خدا کے علی وکبیر ہونے کی حیثیت سے۔

حق کی پہچان

شری رام رتن کپلا دہلی میں ریفریجریٹر کے تاجر ہیں اور شری موتی رام صراف دہلی میں سونے چاندی کا کاروبار کرتے ہیں۔ دونوں میں بہت دوستی ہے۔ اکثر صبح کو دونوں ایک ساتھ ٹہلنے کے لیے نکلتے ہیں اور ایک ساتھ واپس آتے ہیں۔

ایک روز دونوں ایک مقام پر ٹہل رہے تھے۔ شری رام رتن کپلا کو ایک جگہ راستے کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ انھوں نے اس کو شیشہ کا ٹکڑا سمجھا اور تفریح کے طور پر ہاتھ میں اٹھالیا۔

ٹہلنے کے بعد دونوں گھر واپس آئے شری رام رتن کپلا نے واش بیسن پر ہاتھ دھویا اور مذکورہ ٹکڑے کو بے خیالی کے ساتھ ایک کنارے ڈال دیا۔

اس کے بعد شری موتی رام صراف اپنا ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن پر آئے، ان کی نگاہ مذکورہ ٹکڑے پر پڑی۔ اس کی چمک دیکھتے ہی فوراً انھوں نے پہچان لیا کہ یہ ہیرا ہے۔ انھوں نے اس کو اٹھالیا اور اس کو دھو کر شری رام رتن کپلا کے پاس لے گئے۔ جب انھوں نے بتایا کہ یہ ہیرا ہے تو شری رام رتن کپلا کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو اسے معمولی شیشہ کا ٹکڑا سمجھا تھا۔ خیریت ہوئی کہ میں نے اسے پھینک نہیں دیا۔

شری رام رتن کپلا ہیرے سے بے خبر نہ تھے۔ ان کے گھر میں ہیرے کا نیکلس موجود تھا جس کو وہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی مخصوص الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر راستہ میں پڑے ہوئے ہیرے کو وہ پہچان نہ سکے۔

شری موتی رام صراف بھی ہیرے سے واقف تھے اور شری رام رتن کپلا بھی۔ فرق یہ

ہے کہ شری موتی رام جوہری تھے۔ وہ ہیرے کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچان سکتے تھے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ مگر شری رام رتن کپلا صرف اس ہیرے سے واقف تھے جوان کے معلوم نیکلس میں لگا ہوا ہو۔ معلوم نیکلس کے باہر کسی ہیرے کے ٹکڑے کو پہچاننا انہیں نہیں آتا تھا۔

وہ شخص جوہری نہیں جو ہیرے کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ وہ اس کے اپنے ہار میں لگا ہوا ہو۔ جوہری وہ ہے جو ہیرے کو اپنے ہار میں بھی پہچانے اور دوسرے کے ہار میں بھی۔ اسی طرح حق شناس وہ ہے جو حق کو ہر حال میں پہچان لے، خواہ وہ اس کے اپنے حلقہ کے اندر ہو یا اس کے اپنے حلقہ کے باہر۔

پانے والا

قرآن میں جو کردار بیان ہوئے ہیں، ان میں سے ایک قارون ہے۔ وہ اسرئیلی تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ مصر کے قبطی حکمرانوں کا ساتھ دے کر اس نے بے حساب دولت اپنے پاس جمع کر لی تھی۔ ایک روز وہ اپنی پوری شان کے ساتھ لوگوں کے سامنے نکلا۔ اسرائیلیوں میں سے کچھ لوگ اس کو دیکھ کر مرعوب ہو گئے۔ انھوں نے کہا : قارون بھی کیسا خوش قسمت ہے۔ کاش ہم کو بھی وہ چیز حاصل ہوتی جو اس کو ملی ہوئی ہے۔

اسرائیلیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سچائی کو پائے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: قارون کی دنیوی شان وشوکت پر رشک نہ کرو۔ ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل خوش قسمتی تو یہ ہے کہ آدمی کو آخرت کی کامیابی حاصل ہو۔ اور آخرت کی کامیابی کا کوئی تعلق دنیا کی چمک دمک سے نہیں ہے۔ وہ تو صرف انہیں کو ملے گی جو سچے مومن ہوں اور وہ کام کریں جو اللہ کو پسند ہے۔ اسرائیلی علماء کا یہ جواب نقل کرنے کے بعد قرآن میں ارشاد ہوا ہے : وَلَا

یُلَقّٰهَا إِلَّا الصّٰبِرُونَ (28:80) ۔یعنی، اور یہ بات انہیں کو دی جاتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

یعنی حقیقت کا یہ مقام کہ آدمی دنیا کی شان وشوکت سے اوپر اٹھ کر حقیقت کو دیکھ سکے۔ بڑے تپ کا مقام ہے۔ یہ انہیں لوگوں کے حصہ میں آتا ہے جو دنیا کی زینتوں کی طرف دوڑنے سے اپنے کو بچائیں۔ جو اپنی سوچ اور اپنی دلچسپیوں کو نمائشی چیزوں میں نہ الجھائیں۔ جو وقتی ہنگاموں میں کھونے کے بجائے ابدی کائنات میں مصروف رہتے ہوں۔ جو دنیا سے گزر کر آخرت میں جینے لگے ہوں۔ یہ بڑے تپ کا کام ہے۔اس میں اپنے آپ کو جانتے بوجھتے ذبح کر دینا پڑتا ہے۔مگر اعلیٰ سچائی کو پانے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ رجھانے والی دنیا میں رہ کر جو اپنے آپ کو رجھنے سے بچا سکے اسی پر بالاتر حقیقتوں کا راز کھلتا ہے۔ جو سامنے کی چمک دمک میں کھو گیا وہ کبھی آگے کی اعلیٰ تر چیزوں سے آشنا نہیں ہوسکتا۔

دنیوی ہوشیاری دکھانا بلا شبہ دنیا میں آدمی کو عزت اور ترقی عطا کرتا ہے۔مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ”دنیوی ہوشیاری“ ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو آخرت کی ہوشیاری سے محروم کر دیتی ہے۔آخرت کی عقل اسی کے حصے میں آتی ہے جو دنیا کی محرومیوں کو جھیلنے کے لیے تیار ہو، جو دنیوی مصلحتوں کو حق کی خاطر قربان کر سکے ، جو ظاہری عزتوں پر گمنامی کی زندگی کو ترجیح دے سکے، جو عوامی مقبولیت کو عوامی نا مقبولیت کے بدلے میں دے سکے ،جو ملتے ہوئے مفادات کی قیمت دے کر ذاتی نقصان کو خرید سکے، جو نفس کی تسکین کر چھوڑ کر نفس کو دبانے کے راستہ پر چلنے کے لیے تیار ہو۔ دنیا کی رونقوں میں نہ بہنا بڑا اپر مشقت عمل ہے مگر اسی شخص پر معرفت حق کے دروازے کھلتے ہیں جو اس مشقت کو برداشت

کرے، دنیا کی محرومی پر قانع ہونا بڑے صبر کا کام ہے مگر جو دنیا کی محرومیوں پر صبر کرتا ہے وہی وہ شخص ہے جس کو اِس لیے چنا جاتا ہے کہ حکمت کے موتیوں سے اس کے دامن کو بھر دیا جائے۔

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اوراس سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اورحرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اوراس سے بہت روشن بھی۔ روشنی اورحرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (1906-2005) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر 1967 میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (Hans Bethe) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لیے جوش ومسرت کا ایک ناقابل بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اورحیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا — کیا تم کو خبر ہے کہ اِس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں:

Do you realize, just now you are standing next to the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ایمان باللہ ایک دریافت (discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے۔مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفور جذبات سے بے قابو ہوجاتا ہے۔مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز —خدا کو دریافت کرتے ہیں اوران کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کرسکے۔حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہوجاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لیے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کردیے ہوں۔اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہوسکتا،خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں،خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لیے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لیے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو، جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے — قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

گروہی اعتراف

یہود تورات کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ اسی طرح عیسائی انجیل کو خدا کی کتاب مانتے تھے۔ مگر جب قرآن ان کے سامنے آیا تو اس کو انھوں نے خدا کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ماننا گروہی ماننا تھا نہ کہ حقیقی ماننا۔ وہ حق کو صرف اپنے گروہ کی بنیاد پر پہچانتے تھے نہ کہ اس کے جوہر کی بنیاد پر چنانچہ انھوں نے اپنے گروہی

حق کو مانا اور گروہ سے باہر جو حق تھا اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ (2:91)۔ یعنی، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو (قرآن) بھیجا ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں کہ ہم اس کو مانتے ہیں جو ہمارے اوپر اترا ہے۔ اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے حالانکہ وہ حق ہے اور اس کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے۔

یہ نفسیات جس کے تحت یہود ونصاریٰ نے قرآن کا انکار کیا تھا۔ وہ آج پوری طرح مسلمانوں میں پائی جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کا بھی یہ حال ہو رہا ہے کہ وہ صرف گروہی صداقت کو جانتے ہیں۔ وہ چیزوں کو اپنے گروہ کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ان کے گروہ سے باہر اگر کوئی خوبی پائی جاتی ہو تو اس کی انھیں کوئی خبر نہ ہوگی۔

مسلمان آج بے شمار گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ کا یہ حال ہے کہ وہ صرف اِس عالم کو عالِم جانتا ہے جو اِس کے گروہ کا ہو۔ باہر کے عالم کی اِسے خبر نہیں۔ ہر گروہ اپنے گروہ کے متقی کو متقی سمجھتا ہے۔ باہر کے متقیوں کی اِس کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ وہی مصنف مصنف ہے جو اپنے حلقہ کا ہو۔ اپنے حلقہ سے باہر کی کسی چیز کو وہ اِس طرح نظر انداز کر دیتا ہے جیسے وہ اس کو دکھائی ہی نہیں دیتی۔

خدا کے یہاں اس انسان کی قیمت ہے جس نے حق کو جوہر کی بنیاد پر پہچانا ہو۔ جو شخص گروہ کی بنیاد پر حق کو پہچاننے کی مہارت دکھائے۔ اس کی قیمت صرف اس کے اپنے گروہ میں ہے، خدا کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

حق کو پانا

انسان کا ذہن حق کا آئینہ ہے۔ آئینہ کے سامنے کوئی چیز لائی جائے تو وہ اس کی ہو بہو صورت اپنی سطح پر اتار لیتا ہے۔ وہ کبھی اس میں کوتاہی نہیں کرتا۔ ٹھیک یہی حال آدمی کے ذہن کا ہے۔ اس کے سامنے جب حق آتا ہے تو وہ فوراً اس کو پہچان لیتا ہے۔ وہ پوری طرح اسے پالیتا ہے۔ وہ نہ دیکھنے میں غلطی کرتا اور نہ پہچاننے میں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ آیات بینات (کھلے دلائل) کے ذریعہ حق سامنے آتا ہے، اس کے باوجود بے شمار لوگ اس کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ نفسیاتی اٹکاؤ ہے۔ ایسے افراد کا گہرا تجزیہ کیجئے تو ان کے انکار کی وجہ کوئی حقیقی دلیل نہیں ہوگی۔ بلکہ کوئی نہ کوئی دوسری غیر متعلق چیز ہوگی جس کے ساتھ آدمی اٹکا ہوا ہوگا۔

سچائی کو پانے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ حق واضح ہونے کے بعد آدمی کسی بھی اور چیز کو اپنے لیے رکاوٹ نہ بننے د۔ مگر آدمی اکثر حالات میں ایسا نہیں کر پاتا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کو اپنے لیے رکاوٹ بنا لیتا ہے۔

کوئی کسی شخصیت پر اٹک کر رہ جاتا ہے۔ کوئی کسی مفاد پر، کوئی کسی اور چیز پر۔ یہی وہ کمزوری ہے جس نے ہر دور میں بے شمار لوگوں کو سچائی اختیار کرنے سے محروم کر دیا۔ وہ پانے کے باوجود اس کو پانے میں ناکام رہے۔

ابوجہل کے لیے اس کا قیادتی مفاد قبول حق میں رکاوٹ بن گیا۔ طائف کے لوگوں نے حق کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ اس کا اعلان ایک ایسے شخص کی زبان سے ہو رہا تھا جو بظاہر انہیں وقت کی بڑی بڑی شخصیتوں سے کم تر دکھائی دیتا تھا۔ یہود نے آپ کا انکار اس لیے کیا کہ آپ کو پیغمبر ماننے سے ان کا احساس برتری ٹوٹتا تھا۔ شہنشاہ ہرقل نے

اس لیے اس کا اقرار نہیں کیا کہ اس نے محسوس کیا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں اپنی قوم سے کٹ جاؤں گا۔ ہر ایک دلیل سے مفتوح ہو چکا تھا۔ مگر ہر ایک کسی نہ کسی چیز میں اٹک کر اس کو قبول کرنے سے باز رہا۔

اس دنیا میں حق صرف اس شخص کو ملتا ہے جو کسی اٹکنے والی چیز پر نہ اٹکے۔ سچائی کا دلیل سے واضح ہو جانا ہی اس کے لیے کافی ہو کہ وہ اس کو ہمہ تن قبول کر لے۔

خدا کو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت اتنی نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہو گی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس نے خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو قرآن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس

ہونے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے۔ جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لیے ایسی ممکن غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پیئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں۔ اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں۔ مگر ان کے منہ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لیے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل و دماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیب میں لیے ہوئے ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لیے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

انکشاف خداوندی

نکیتا خروشچیوف (1894-1971) نے کہا تھا "ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نہیں ملا"۔ کمیونسٹ روس کے سابق صدر نے یہ بات نعوذ باللہ بطور مذاق کہی تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے تمام سیکولر محققین پر وہ پوری طرح صادق آتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانے پر فطرت کے علوم کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک کی مختلف چیزوں کی تحقیق میں بے شمار لوگوں نے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ مگر ان لوگوں کی کتابیں پڑھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں کہیں ان کی خدا سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ زمین سے لے کر آسمان تک سفر کرتے رہے۔ مگر خدا کی کوئی جھلک انہیں دکھائی نہیں دی۔ انھوں نے خاموش لہروں کے ذریعہ سفر کرنیوالی آوازوں کو پکڑ لیا۔ مگر ان کے کان خدا کی آواز سے آشنا نہیں ہوئے۔ ان کی خوردبینوں اور دوربینوں نے انہیں ایسی چیزیں دکھائیں جو اس سے پہلے انسان نے کبھی نہیں دیکھی تھیں مگر خدا کے فرشتوں سے ان کا کبھی مصافحہ نہیں ہوا جو کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہی واقعہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اور قائدین کے ساتھ بھی کسی قدر بدلی ہوئی شکل میں پیش آیا ہے۔ جس طرح سیکولر مفکرین کو کائنات کا صرف ظاہر ملا، اس کی اندرونی حقیقت انہیں نہیں ملی۔ اسی طرح مسلم مفکرین کے حصہ میں اسلام کا صرف ظاہری ڈھانچہ آیا۔ وہ اسلام کی اندرونی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔

آپ ان مفکرین کی تقریریں سنیے، ان کی سوانح عمریاں پڑھیے۔ ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو ان میں ہر چیز ملے گی مگر وہی چیز نہیں ملے گی جو اسلام کی اصل روح

ہے — ان کے یہاں انسانوں سے ملاقات کا ذکر ہوگا مگر خدا کی کبریائی کا احساس اورخدا سے ملاقات کا کہیں ذکر نہ ہوگا۔ وہ انسانی آرٹ کی بلندی اورتاثیر سے مسحور نظر آئیں گے، مگر خدائی آرٹ کی بلندی اورتاثیر سے ان کے اندر کوئی تموج پیدا ہوتا ہوا دکھائی نہیں دے گا۔ دنیا کے واقعات کے چرچے سے ان کی زبان وقلم گونج رہی ہوں گی مگر آخرت کے چرچے کا نشان کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ وہ قومی مسائل اورملّی مفاخر پرولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے نظر آئیں گے مگر خدا کے جلال وجمال پر ولولہ انگیز تقریر کبھی ان کے یہاں سنائی نہ دے گی وہ اپنی حیران کن دریافتوں کا انکشاف کریں گے۔ مگر کہیں اس کا نشان نہیں ملے گا کہ ان پر خدا کا انکشاف ہوا اورخدا کی دریافت نے ان کے اندر ہلچل پیدا کردی۔

ایمان میں اضافہ

ایک سائنس داں نے کہا "فطرت کا مطالعہ میرا مذہب ہے۔ جس دن میں فطرت کی کوئی نئی چیز نہیں دریافت کرتا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن میں نے ضائع کردیا"۔ یہ اس انسان کا حال ہے جو مخلوقات میں جیتا ہے۔ پھر اس انسان کا حال اس سے مختلف کیسے ہوسکتا ہے جو خالق میں جیتا ہو۔ جس طرح سائنس دان ہر روز مخلوقات میں کوئی نئی چیز دریافت کرتا ہے، اسی طرح مومن کو ہر روز خالق کی نسبت سے کوئی ایسی چیز پانا چاہیے جو اس کے ایمان میں اضافہ کرنے والی ہو۔ مومن جس روز کوئی نئی چیز نہ پائے، وہ دن گویا اس نے ضائع کردیا، اس دن گویا خدا سے اس کا ربط قائم نہیں ہوا۔

ایمان خدا کی دریافت کا دوسرا نام ہے۔ خدا ایک مسلسل حقیقت ہے جس کی کوئی حد

نہیں، اس لیے اس کی دریافت بھی ایک مسلسل واقعہ ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جو ایمان اضافہ پذیر نہ ہو وہ غفلت کی ایک قسم ہے، اس کو حقیقی معنوں میں ایمان نہیں کہا جاسکتا۔

جس کا ذہن خدا کی طرف متوجہ ہو، جس کا دل خدا کی طرف لگا ہوا ہو، اس کو بار بار خدا کی نئی تجلیات کا ادراک ہوتا ہے۔ وہ بار بار خدا کی نئی جھلک پاتا رہتا ہے۔ جس طرح خدا کے کمالات کہیں ختم نہیں ہوتے، اسی طرح مومن کا سفرِ معرفت بھی کسی حد پر ختم نہیں ہوتا۔

یہ نئی معرفت کبھی ایسی ربانی کیفیات کی صورت میں امنڈتی ہے جس سے وہ اس سے پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ کبھی ایسے دعائیہ الفاظ کے روپ میں بے اختیار اس کی زبان پر آجاتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی وہ خدا کی حکمتوں میں سے کسی ایسی حکمت کا راز پالیتا ہے جو اس سے پہلے اس پر نہیں کھلے تھے۔ وہ خدا کی قربت کا ایسا تجربہ کرتا ہے جو اِس سے پہلے کبھی اس کے علم میں نہیں آئے تھے۔ کبھی اس پر ایسے نئے معانی کا القاء ہوتا ہے۔ جس کے اظہار کے لیے اس کے تمام معلوم الفاظ عاجز نظر آنے لگتے ہیں۔

ہر چیز عجیب

موجودہ قسم کی چھتری لندن میں سب سے پہلے 1749 میں بنائی گئی۔ اس وقت اس کا تعارف ایک شخص نے ان الفاظ میں کرایا تھا:

> When opened it was like a small tent, and when shut it was all curiously jointed and would fold up to the length of a man's hand.

جب اس کو کھولا جائے تو ایک چھوٹے خیمے کے مانند ہوجاتی ہے اور جب اس کو بند کیا جائے تو حیرت انگیز طور پر وہ پوری سمٹ جاتی ہے اور لمبائی میں ایک آدمی کے ہاتھ

کے برابر ہوجاتی ہے (ٹائمس آف انڈیا، 26 مئی 1984)۔

موجودہ صدی کی ابتدا میں ہندستان کے ایک دیہات میں ایک زمین دار کے یہاں پہلی بار ہینڈ پمپ (hand pump) لگایا گیا۔ جب اس کو چلایا گیا اور زمین سے وہ پانی کھینچ کر نکالنے لگا تو ایک دیہاتی عورت نے اس کو دیکھ کر کہا: "آدمی صرف موت سے ہارا ہے"۔ یعنی آدمی سب کچھ کرسکتا ہے۔ صرف ایک موت ایسی چیز ہے جس پر قابو پانا اس کے اختیار میں نہیں۔

دوسو سال پہلے چھتری اور ہینڈ پمپ آدمی کو انتہائی عجیب معلوم ہوتے تھے۔ مگر آج آدمی چھتری اور ہینڈ پمپ کو دیکھتا ہے اور اس کے اندر کوئی استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو دیکھتے دیکھتے اب وہ اس کا عادی بن چکا ہے۔ کوئی چیز جب بار بار آدمی کے سامنے آتی ہے تو وہ اپنا انوکھا پن کھودیتی ہے۔ اس کے بعد انتہائی عجیب چیز بھی اس کے لیے غیر عجیب بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی معاملہ خدا کی تخلیقات کا ہے۔ موجودہ دنیا میں جو چیز بھی ہے، نہایت عجیب ہے۔ خواہ وہ ایک چھوٹی پتی ہو یا عظیم سمندر ہو، ایک بے نور ذرّہ ہو یا روشن آفتاب ہو۔ مگر آدمی پیدا ہوتے ہی ان کو دیکھتا ہے اور ساری زندگی ہر روز دیکھتا رہتا ہے۔ اس طرح برابر دیکھتے رہنے کی وجہ سے ان کا عجوبہ پن اِس کی نظر میں ختم ہوجاتا ہے۔ ان کو دیکھ کر آدمی کے اندر استعجاب پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انھیں چیزوں میں سے کسی چیز کو وہ اچانک ایک روز دیکھے تو وہ احساس حیرت میں ڈوب جائے۔

یہی موجودہ دنیا میں آدمی کا امتحان ہے۔ اس کو ایک درخت کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کہ وہ پہلی بار اچانک اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ہو۔ اس کو ایک سورج کو اس طرح دیکھنا ہے جیسے کے وہ بالکل پہلی بار اس کے سامنے چمک اٹھا ہو۔ ایک چڑیا کے نغمہ کو

اسے اِس طرح سننا ہے جیسے کہ اس کے کان پہلی بار اس کے چھچھے سے آشنا ہوئے ہوں۔

نفیِ ذات

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو قرآن میں احسن القصص (بہترین قصہ) کہا گیا ہے (یوسف، 12:3)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی اس بات کی ایک تاریخی مثال ہے کہ کس طرح خدائی مدد واقعات کے دھارے کو پھیر دیتی ہے۔ وہ ایک اسوء القصص کو احسن القصص بنا دیتی ہے۔

حضرت یوسف کے دشمنوں نے آپ کو کنویں میں ڈال دیا۔ مگر خدا نے آپ کو کنویں سے نکال کر مصر کے تخت پر پہنچا دیا۔ جہاں آپ کے مخالفین نے آپ کی کہانی ختم کرنی چاہی تھی وہیں سے آپ کی ایک نئی شاندار تر کہانی شروع ہوگئی۔

مذکورہ سورہ میں حضرت یوسف کا قصہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہوگئے اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آپہنچی پھر ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے ٹالا نہیں جاتا (12:110)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی مدد مایوسی کی حد پر پہنچ کر ملتی ہے۔ "مایوسی" سے مراد وہ مقام ہے جہاں بندہ اپنا سب کچھ دے کر خالی ہو چکا ہو۔ اس کے پاس مزید کچھ دینے کے لیے باقی نہ رہے۔ جب وہ محسوس کرنے لگے کہ بندگی کی حد ختم ہوگئی۔ اب وہ درجہ آ گیا ہے جہاں سے خدائی کی حد شروع ہوتی ہے۔ عین اس وقت خدا کی مدد آجاتی ہے۔ ناکامی کی انتہا کامیابی کا آغاز بن جاتا ہے۔

بیج کا ختم ہونا ایک درخت کو وجود دیتا ہے۔ یہی معاملہ خدا اور بندے کا بھی ہے۔

آدمی خدا کی مدد کا مستحق اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے لیے مٹا دے۔ جہاں اعتماد خویش ختم ہوجائے وہاں سے اعتماد علی اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔

خدا بلا شبہ سب سے بڑی طاقت ہے۔مگر خدا کو پانا ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔آدمی اپنی نفی نہیں کر پاتا اسی لیے وہ خدا کو پانے والا بھی نہیں بنتا۔خدا ہر چیز کا بدل ہے۔خدا کو پانا سب کچھ کو پالینا ہے۔مگر انسان کی یہ نادانی بھی عجیب ہے کہ وہ بے کچھ کے لیے سب کچھ کو کھو دیتا ہے۔وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں خدا سے محروم ہوجاتا ہے۔

اللہ کا ذکر

ذکر کے معنی یاد کے ہیں۔اللہ کے ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ یہ یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں، وہ اللہ کی معرفت کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔

جب کوئی آدمی اللہ کو اس کی عظمتوں اور قدرتوں کے ساتھ پاتا ہے تو اس کے اندر ایک روحانی ہلچل پیدا ہوجاتی ہے۔اس کے بعد اس کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ اس کو ہر وقت اللہ کی یاد آتی رہتی ہے۔ یہ یاد کبھی دل کے اندر تڑپ بن کر ظاہر ہوتی ہے اور کبھی زبان سے حمد اور شکر اور خشیت کے الفاظ کی صورت میں بے ساختہ نکل پڑتی ہے۔اسی کیفیت کو اللہ کی یاد کہا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اتھاہ خلا میں ستاروں اور کہکشاؤں کی حرکت پر غور کرتا ہے۔وہ پکار اٹھتا ہے کہ وہ خدا بھی کیسا عظیم خدا ہوگا جو اتنے بڑے کارخانے کو اتنی صحت کے ساتھ متحرک کیے ہوئے ہے۔کبھی وہ درختوں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے پرُ کشش مناظر کو دیکھتا ہے۔اور ان کے حسن اور معنویت کا ادراک کرکے حیران رہ جاتا

ہے۔آدمی کو اس کے گردوپیش کی چیزیں بار بار اللہ کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔اس کے اندر اللہ کی یاد کو جگاتی رہتی ہیں۔

اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی حالت پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے۔وہ بے تابانہ اپنے رب سے معافی مانگنے لگتا ہے۔وہ خدا سے کہتا ہے کہ وہ اس کو آخرت کے عذاب سے بچائے اور اس دن اپنی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرے جب کہ خدا کی رحمت کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا جہاں آدمی پناہ لے سکے۔کبھی آدمی اپنے عجز اور بے چارگی کو دریافت کرتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو قادر مطلق ہے تو اپنی قدرت سے میرے عجز کی تلافی فرما۔

انسان کے دل میں انہیں ربانی احساسات کا پیدا ہونا اور ان احساسات کا الفاظ کی صورت میں ڈھل جانا، اسی کا نام ذکر ہے۔ذکر اللہ کی یاد ہے، سب سے بڑی حقیقت کی یاد۔جو چیز سب سے بڑی حقیقت کی یاد ہو اس کا تجربہ بھی سب سے بڑا ہوتا ہے۔اس تجربہ کا کسی کے دل پر گزرنا اتنا بڑا واقعہ ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

کھونے والا پاتا ہے

اگر آپ بمبئی میں ہیں اور کلکتہ جانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو بمبئی کو چھوڑنا ہوگا۔اس کے بعد ہی آپ کلکتہ میں موجود ہو سکتے ہیں۔جو آدمی خدا کا طالب ہو وہ بھی گویا ایک قسم کا مسافر ہے۔اگر وہ اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے تو اس کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔یہ کہ وہ اپنی سابقہ جگہ کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے۔اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوب خدائی منزل پر پہنچنے کی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں لینے کے لیے دینا پڑتا ہے۔ یہاں کھونے میں پانے کا راز چھپا ہوا ہے۔

آپ اگر ایک نفع بخش تجارت کے مالک بننا چاہتے ہیں تو پہلے اپنا اثاثہ اس میں کھپانا پڑے گا۔ اگر آپ اپنے کھیت میں ہری بھری فصل دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے بیج کے ذخیرے کو مٹی میں ملا دینا ہوگا۔ اگر آپ منصوبہ بندی کے تحت دوررس عمل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے فوری جذبات کو کچل دینے پر اپنے آپ کو راضی کرنا پڑے گا۔ اگر آپ دولت مند بننا چاہتے ہیں تو ضروری ہوگا کہ آپ اپنے کو فضول خرچی سے باز رکھیں۔

جو ذرّہ نہ پھٹے وہ کبھی ایٹمی طاقت نہیں بنتا۔ جو دانہ اپنے آپ کو فنا نہ کرے وہ درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ جو فرد اپنے ذاتی مفاد کو قربان نہ کرے وہ اجتماعی مفاد کو قائم کرنے کا کریڈٹ نہیں پاتا۔

یہی معاملہ خدا کا بھی ہے۔ کوئی شخص خدا والا اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ خدا کی خاطر اپنے کو حذف کر دے۔ جو شخص اپنے وجود کو حذف کرنے کے لیے تیار نہ ہو وہ کبھی خدا والا بھی نہیں بنتا۔

خدا کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے — اسی ایک لفظ میں خدا کو پانے کا راز ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بھی پانا چاہے اور خدا کو بھی، وہ صرف اپنے آپ کو پائے گا۔ ایسا آدمی کبھی خدا کو پانے والا نہیں بن سکتا۔

خدا کا فیصلہ

فیصلہ کے دن

انڈین ایکسپریس بنگلور کی اشاعت مورخہ 9 ستمبر 1983 کی ایک خبر کا عنوان ہے — چمک دار چیز سونا نہیں:

Glitter is not gold

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مس سبل ڈی سلوا (Miss Sybil D'Silva) جو بنگلور میں آرٹیلری روڈ (Artillery Road) پر رہتی ہیں وہ اپنے گھر پر تھیں کہ تقریباً 45 سالہ ایک عورت ان کے پاس آئی اس کی گود میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا عورت نے مس ڈی سلوا سے کہا کہ اس کا شوہر بہت زیادہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لیے فوری طور پر 5 ہزار روپیہ کی ضرورت ہے عورت نے سونے کا ایک ہار اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں میں صرف اس سونے کے ہار کو بیچنا چاہتی ہوں اگرچہ یہ ہار مجھے بہت عزیز ہے مگر شوہر کی صحت اس سے زیادہ عزیز ہے اس ہار کی قیمت بازار میں دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے میں اپنی ضرورت کی بنا پر آپ کو صرف 5 ہزار روپے میں دے دوں گی۔

مس ڈی سلوا نے ہار لینے سے انکار کیا لیکن عورت اپنی مجبوری بیان کرتی رہی یہاں تک کہ اس نے مس ڈی سلوا کو متاثر کرلیا۔ انھوں نے روپیہ دے کر ہار خرید لیا۔

اگلے دن مس ڈی سلوا بنگلور کی کمرشل اسٹریٹ پر گئیں اور وہاں ایک سنار کو انھوں نے وہ ہار دکھایا۔ سنار نے وہ ہار لے کر اپنی کسوٹی پر جانچا۔ کسوٹی پر جانچنے کے بعد ہار کی حقیقت کھل گئی۔ مس ڈی سلوا نے بنگلور پولیس کو یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ سنار نے مجھے بتایا کہ یہ تو پیتل ہے:

He told me it was brass

یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کیے پر مگن ہے ہر آدمی اپنے کام کو سونا سمجھتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا

ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پر جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں سونا ثابت ہو اسی کے عمل کی قیمت ہے اور جس کے عمل کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پیتل تھا، اس کا سونا اس کے لیے صرف رسوائی اور بربادی کی علامت ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آج اتنا قیمتی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اس کو کسی طرح چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اس دن وہ اس سے اتنا بیزار ہوگا کہ وہ چاہے گا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان جدائی ہو جائے مگر اس دن جدائی نہ ہو سکے گی۔ جس چیز کو وہ فخر کی چیز سمجھے ہوئے تھا اس دن وہ اس کے لیے صرف ذلت اور رسوائی کی چیز بن جائے گی۔

اس دن کیا ہو گا

خدا ہر چیز کا مالک ہے دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے خدا کے دئے سے ملتا ہے خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی چیز ہی نہیں جو وہ کسی کو دے سکے ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ ایسا کریں کہ ایک شخص کو جائز طور پر ملی ہوئی چیز کو اس سے چھیننے لگیں تو گویا وہ خدا کے دئے کو چھین رہے ہیں وہ خدا کے منصوبہ کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں ایک شخص کو مکان ملے مگر کچھ لوگ اس کو بے گھر کرنے کی سازشیں کریں اس کی معاش کا جائز انتظام ہو مگر لوگ اس کی معاشیات کو تباہ کرنے پر اتر آئیں اس کو عزت کی زندگی حاصل ہو مگر لوگ اس کو بے عزت کرنے کی کارروائیاں کریں وہ سکون وعافیت کے ساتھ اپنے ماحول میں رہ رہا ہو مگر لوگ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھا کر اس کے سکون کو غارت کرنے لگیں۔ ایسا ہر واقعہ خدا کے انتظام میں مداخلت ہے یہ بے اختیار مخلوق کا ایسے خالق سے لڑنا ہے جو تنہا اور مکمل طور پر ہر قسم کا اختیار رکھتا ہے۔

ایسے واقعات کا مطلب یہ ہے کہ — خدا نے چاہا مگر بندوں نے نہ چاہا۔ خدا نے اپنے فیصلہ کے تحت تقسیم رزق کا ایک انتظام کیا مگر بندے اس تقسیم کو ماننے پر راضی نہ

ہوئے۔ خدا کے مقابلہ میں بندوں کی یہ سرکشی موجودہ دنیا میں بظاہر کامیاب نظر آتی ہے۔ مگر یہ کامیابی صرف اس لیے ہے کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو امتحان کی آزادی حاصل ہے جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی، آدمی اپنے آپ کو اتنا بے زور پائے گا کہ اس کے پاس الفاظ بھی نہ ہوں گے کہ وہ کسی کے خلاف بولے، اس کے پاس دل بھی نہ ہوگا کہ کسی کو ملیا میٹ کرنے کا منصوبہ بنائے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے یہاں کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے چاہے کو باطل کرے، وہ خدا کے تقسیم رزق کو کھنڈت کرنے کی کوشش کرے مگر ایسے لوگوں کا حال اس وقت کیا ہوگا جب امتحان کی موجودہ آزادی ختم ہو چکی ہوگی جب وہی ہوگا جو خدا چاہے اور وہ نہ ہو سکے گا جو خدا نہ چاہے، اس روز خدا کہے گا— میں دیتا ہوں جس کو چاہوں، اب جس کو کرنا ہے میرے چاہے کو باطل کرے۔

دولت کا فریب

کوالالمپور کے اخبار نیو اسٹریٹس ٹائمس (New Straits Times) کی اشاعت 28 جولائی 1984 میں ایک خبر نظر سے گزری۔ ایک اطالوی نژاد امریکی کارپینٹر (carpenter) وینرو پیگانو (Venero Pagano) جس کی عمر 63 سال ہے اور وہ نیویارک کے قریب رہتا ہے۔ وہ آٹھ سال سے بے روزگار تھا اور یونین کی پنشن سے اپنا کام چلا رہا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ اپنے مکان سے متصل زمین پر حسب منشا ٹماٹر کی کاشت کر سکے۔

مذکورہ کارپنٹر نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا۔ 27 جولائی 1984 کو اچانک اسے معلوم ہوا کہ اس کو اول انعام ملا ہے یہ انعام 20 ملین ڈالر تھا۔ یہ اب تک کے لاٹری انعاموں میں دنیا بھر میں سب سے بڑا انعام ہے۔

انعام کی خبر سب سے پہلے ٹیلی وژن پر آئی۔ اس کے فوراً بعد اس کے لیے

پریس کانفرنس کی گئی۔ اس نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ خبر کو سن کر میں ششدر رہ گیا۔ میں بار بار اپنے نمبر کو اعلان شدہ نمبر سے ملا کر چیک کرتا رہا اور ابھی تک مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ انعام مجھ کو ملا ہے خبر سن کر وہ بھاگ کر اندر کمرے میں گیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ "میرا خیال ہے کہ ہم لوگ کروڑ پتی ہو گئے ہیں"۔ اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ مجھ کو جو ضرورت تھی وہ میں نے پالیا میں نے اپنا مکان پالیا میں نے اپنے ٹماٹر پالیے:

I got whatever I need. I got my house. I got my tomatoes.

دنیا میں آدمی کے پاس دولت ہو تو اس کا ہر کام پورا ہو جاتا ہے۔ اس لیے آدمی سمجھتا ہے کہ دولت سب کچھ ہے دولت مل جائے تو آدمی سمجھتا ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا۔ حالاں کہ سب کچھ پانا یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی رحمتوں کو پالے۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی جن مسائل سے دو چار ہے ان سے بالکل مختلف وہ مسائل ہوں گے جن سے آدمی موت کے بعد کی زندگی میں دو چار ہوگا۔ آج دولت کی اہمیت ہے، اس وقت ایمان اور عمل صالح کی اہمیت ہوگی۔ آج چیزیں بازار سے حاصل ہوتی ہیں اس وقت تمام چیزیں خدا کی رحمت کے خزانے سے ملیں گی۔ آج مادی قوانین کے تحت آدمی کو مقام ملتا ہے اس وقت اخلاقی قوانین یہ فیصلہ کریں گے کہ آدمی کو کیا ملے اور کیا نہ ملے۔

گھاٹے والا

قرآن میں ارشاد ہوا ہے — کہو، کیا میں بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون لوگ ہیں وہ لوگ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں اور وہ اسی خیال میں رہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا۔ پس ان کے اعمال ضائع ہو گئے

ہم قیامت کے دن ان کے اعمال کا کچھ وزن قائم نہ کریں گے (18:103-105)۔

تمام محرومیوں میں سب سے زیادہ عجیب محرومی وہ ہے جب کہ آدمی کمائی کرے مگر اس کو اس کا حاصل نہ ملے وہ مہینہ بھر محنت کرے مگر وہ کوئی تنخواہ نہ پائے وہ تجارت میں اپنی ساری پونجی لگائے مگر اسے کچھ نفع حاصل نہ ہو وہ ارمانوں کے ساتھ اپنا گھر بنائے مگر اس میں اس کو چین کے ساتھ رہنا نصیب نہ ہو۔

اگر کسی آدمی کے ساتھ ایسا حادثہ گزرے تو وہ بالکل بجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس کے اعضاء شل ہو جاتے ہیں۔ اپنی محنت کے آخری نتیجے کو اپنی آنکھوں کے سامنے برباد ہوتے دیکھنا اتنا بڑا حادثہ ہے جس کو کوئی بھی شخص برداشت نہیں کرسکتا۔

یہ دنیا میں اعمال کی بربادی کا حال ہے۔ پھر آخرت میں جب آدمی اپنے اعمال کو ابدی طور پر برباد ہوتے ہوئے دیکھے گا تو اس کا کیا حال ہوگا۔

جب وہ دیکھے گا کہ عمر بھر کی محنت سے بنایا ہوا اِس کا ڈھانچہ اچانک ڈھ پڑا۔ اِس کی خوش گمانیوں کا قلعہ ایک ہی جھٹکے میں ہمیشہ کے لیے مسمار ہو گیا۔

جب وہ دیکھے گا کہ دنیا میں محنت کے ساتھ حاصل کی ہوئی کمائی آخرت میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ دنیا میں کھڑا کیا جانے والا عظمتوں کا گنبد آخرت میں گرا ہوا پڑا ہے۔ دنیا میں جمع کی ہوئی نیک نامی آخرت میں بالکل بے قیمت ہو چکی ہے۔

جس آدمی نے اپنی دوڑ دھوپ کو صرف دنیا میں لگایا ہو اس کا آخرت میں یہی حال ہوگا کہ وہاں وہ بالکل مفلس بن کر کھڑا ہوگا۔ وہاں اس کی حیثیت صرف ایک لٹے پٹے انسان کی ہوگی یہ منظر آدمی کیلیے ناقابل برداشت حد تک سخت ہوگا۔ کامیابیوں پر فخر کرنے والے ناکامی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہوں گے۔ ترقیات پر ناز کرنے والے ایسے بدحال دکھائی دیں گے جیسے انھوں نے کبھی ترقی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

انسان کا المیہ

ڈاکٹر اتم پرکاش (1982-1928) ہندستان کے ایک نامور سرجن تھے۔ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں شعبہ سرجری کے ہیڈ تھے۔ ڈاکٹر پرکاش کو پدم بھوشن کا انعام ملا تھا۔ شعبہ سرجری کی عالمی کانفرنس 17 فروری کو دہلی میں ہونے والی تھی جس کی صدارت کی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر 14 فروری کو ان پر دل کا دورہ پڑا اور اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 54 سال تھی۔

سرجری پر ہونے والی ورلڈ کانفرنس کی کامیابی ان کے ذاتی وقار کو بہت زیادہ بڑھا دیتی۔ اسی بنا پر وہ اس کے معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے راشٹر پتی سنجیوا ریڈی (1996-1913) کو آمادہ کرلیا تھا کہ وہ کانفرنس کا افتتاح کریں مگر جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تو راشٹر پتی بھون سکریٹریٹ سے بتایا گیا کہ راشٹر پتی ان کے اجلاس میں صرف اس وقت شرکت کر سکیں گے جب کہ مرکزی وزیر صحت بھی وہاں موجود ہوں۔ پروٹوکول (آداب شاہی) کے مطابق ایسا ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر پرکاش کے منصوبہ میں وزیر صحت کو بلانا شامل نہ تھا مگر اب ضروری ہو گیا کہ وزیر صحت کو بھی شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے۔ ڈاکٹر پرکاش نے وزیر صحت کے دفتر کا طواف شروع کیا مگر اب یہاں دوسری رکاوٹ حائل تھی وزیر صحت اجلاس میں شرکت پر راضی نہ ہو سکے۔ ایک ایسے اجلاس میں شرکت کرنا ان کی عزت نفس کے خلاف تھا جس کے اولین پروگرام میں ان کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ صدمات ڈاکٹر اتم پرکاش کے لیے اتنے سخت ثابت ہوئے کہ اجلاس کے تین دن پہلے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا مگر ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس، 16 فروری 1982) کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ موت

کے طویل سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دہلی کے سب سے زیادہ پریشان آدمی تھے۔

He was the most worried man in town before he took the long road

آج آدمی وقار کے کھونے کو بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ پھر آنے والی دنیا میں آدمی کا کیا حال ہوگا جب اس کو بھوک اور پیاس لگے گی مگر وہاں کھانا نہ ہوگا جس کو وہ کھائے اور پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائے۔ وہ تیز دھوپ میں جل رہا ہوگا مگر اس کے لیے کوئی سایہ نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے۔ عذاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگا مگر وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا جو اس کی مدد کو پہنچے آہ وہ انسان جو کنکری کی چوٹ کو برداشت نہیں کر پاتا حالانکہ اس کے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔

موت کا حملہ

سکندر اعظم (323-356 ق م) یونانی بادشاہ فلپ کا لڑکا تھا۔ اس نے تخت ملنے کے بعد دس سال کی مدت میں اس زمانہ کی معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر ڈالا۔ مصر کا شہر اسکندریہ اس کے فتح مصر کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ مگر بالآخر اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ عراق کے قدیم شہر بابل کے ایک محل میں اس طرح بے بسی کے ساتھ مر گیا جس طرح ایک غریب اور کمزور آدمی اپنی جھونپڑی میں مرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ پایا اور پھر سب کچھ پا کر خالی ہاتھ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے مرنے کے بعد اس کے تین فوجی سرداروں میں تقسیم ہوگئی۔ کیونکہ اس کا واحد بیٹا اس کی زندگی ہی میں قتل کیا جا چکا تھا۔

سکندر کی عظمت کا یہ حال تھا کہ جولیس سیزر ایک بار اسپین میں سکندر کے مجسمہ کے سامنے سے گزرا تو اس کو دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگا۔ اس نے کہا سکندر نے جو

فاتحانہ کارنامے دس برس کی مدت میں انجام دیے، اس کا دسواں حصہ بھی میں اب تک انجام نہ دے سکا۔

سکندر مخالفت کو بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مخالفت شروع ہوتے ہی اس کو فوراً کچل دینا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر کی غیر معمولی فتوحات کا باعث اس کی برق رفتاری تھی۔ اچانک پہنچ کر دشمن کو دبوچ لینے کی صلاحیت اس کے اندر دنیا کے تمام جنرلوں سے زیادہ تھی، مگر موت اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی۔ 13 جون 323 ق م کو جب موت اس کے اوپر حملہ آور ہوئی تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کے ساتھ موت کے حوالے کردے۔

موت اس لیے آتی ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ وہ خدا کے آگے کس قدر بے بس ہے۔ آدمی ہر روز اپنے چاروں طرف موت کے واقعات کو دیکھتا ہے مگر وہ اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ وہ زندگی کی اس سب سے بڑی حقیقت کو بھولا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آکر اس سے خود مہلت کو چھین لیتی ہے کہ وہ سوچے اور اس سے سبق لے۔ موت آدمی کے لیے سب سے بڑا سبق ہے۔ مگر موت سے آدمی سب سے کم جو چیز لے رہا ہے وہ یہی ہے۔

پانچ سکنڈ کا فاصلہ

3 جون 1979 کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی صدر بازار کی سڑک پر ایک ساتھ جا رہے تھے۔

اس کے بعد اچانک ایک واقعہ ہوا۔ ہمارے سامنے ایک مکان کے آگے کا حصہ دھما کہ کے ساتھ گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ اس وقت ہم دونوں جائے حادثہ سے بمشکل پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ

سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ ہمارا سفر شاید درمیان ہی میں ختم ہو جاتا جس کی منزل ہم نے بہت آگے سمجھ رکھی تھی۔

میں نے سوچا آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لیے ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ اس کا پانچ سکنڈ کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی اگر اچھی طرح اس بات کو جان لے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بالکل بدل جائے۔ وہ ایک اور ہی قسم کا انسان بن جائے وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے ایسی موت جس کے معاً بعد آدمی، حدیث کے الفاظ میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔ مگر انسان اتنا بے حس بنا ہوا ہے کہ اس کو اس کی خبر نہیں۔

لوگ جھوٹی خدا پرستی پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں حالانکہ آخرت میں صرف حقیقی خدا پرستی کسی شخص کے کام آئے گی۔ حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ اس کے ذہن پر چھا جائے وہ اس کے صبح وشام کا نگراں بن جائے وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔

ناتمام کہانی

مسٹر پی این پاٹھک ایک بے حد محنتی آدمی تھے وہ انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (نئی دہلی) میں ایک معمولی ملازم کے طور پر 1958 میں داخل ہوئے اور آخر میں اس کے

کمپوزنگ شعبہ کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بن گئے۔ وہ غالباً مزید ترقی کرتے مگر 27 دسمبر 1984ء کو حرکت قلب بند ہونے سے ان کا انتقال ہو گیا مرنے کے وقت ان کی عمر صرف 50 سال تھی۔

ہندستان ٹائمس (28 دسمبر 1984) میں ان کی اچانک موت کی خبر دیتے ہوئے یہ الفاظ درج ہیں کہ وہ اپنے عہدہ پر محض سخت محنت کے ذریعے پہنچے تھے:

He rose to the present position by sheer hard work

مسٹر پاٹھک نے الہ آباد میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد پندرہ سال تک وہ ٹائمس آف انڈیا اور انڈین ایکسپریس میں رہے۔ اس کے بعد 1958 میں وہ ہندستان ٹائمس کے عملہ میں داخل ہوئے۔ یہاں انہیں جم کر کام کرنے اور محنت کرنے کا موقع ملا 25 سال محنت کے بعد وہ اخبار میں ایک بڑے عہدہ پر پہنچ گئے مگر ابھی وہ اس عہدہ سے متمتع بھی نہیں ہو سکے تھے کہ اچانک موت کا وقت آ گیا۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں انسان کیسے عجیب المیہ سے دو چار ہے۔ انسان بے پناہ محنت کرتا ہے وہ اپنی پوری طاقت خرچ کر کے ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچتا ہے۔ مگر اپنی کوششوں کے آخری انجام سے فائدہ اٹھانے کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوتا کہ اس کی موت آ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ خاتمہ کیسا دردناک ہے مگر کوئی شخص اس پر غور نہیں کرتا ہر آدمی دوبارہ اسی دردناک کہانی کو لکھنا چاہتا ہے جس کو اس کے پیش رو نے لکھنا چاہا تھا اور وہ اس کو لکھنے میں کامیاب نہ ہوا۔ تمام انسانوں کی کہانی نامکمل کہانی ہے۔ مگر کوئی نہیں جس کو یہ سوال بے چین کرے کہ اس کا راز کیا ہے اور وہ کون سا طریقہ ہے جس کو اختیار کر کے انسان کی کہانی مکمل کہانی بن سکے۔

ہر انسان اس دنیا میں ایک ناتمام کہانی ہے۔ ہر انسان اپنی منزل پر پہنچ کر اچانک

بے منزل ہو جاتا ہے۔ زندگی کی یہ بے انجامی کیسی عجیب ہے اور اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ کسی کو اپنی بے انجامی کی فکر نہیں۔

موت کو یاد کرو

کچھوا پانچ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ درخت ایک ہزار سال تک زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑ اور دریا کروروں سال تک اپنی شان کو باقی رکھتے ہیں۔ مگر انسان کی عمر پچاس یا سو سال سے زیادہ نہیں۔ انسان جو بظاہر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے وہ سب سے کم زندگی پاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مختصر زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی کی زندگی غم اور دکھ سے اتنا زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خوشی کے لمحات غفلت کی چند جھلکیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، امیدوں کی مسلسل پامالی کا نام زندگی ہے اور بالآخر اس قسم کے دردناک ایام گزارتے ہوئے ایک دن موت کے آگے شکست کھا جانا۔

ایک غریب کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس بڑا مکان نہیں۔ اس کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کافی پیسہ نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظر سے دیکھتا ہے، دولت مند آدمی کے لیے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسائل پیدا کرتا ہے جو غریب کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک مشہور آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو اندر سے اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ غرض اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی شخص ناموافق حالات سے بچ جائے اوراس خوش قسمتی کو حاصل کرلے جس کوسکھ اور چین کہتے ہیں، تب بھی کتنے دن تک۔ اگر کوئی شخص اتفاقی اسباب کے تحت خوشیوں کا خزانہ اپنے گرد جمع کرلے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لیے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اِس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پالیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے آدمی پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہوجاتی ہے جس طرح ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ابدالآباد تک ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

جب موت ذہنی طلسم کو توڑ دے گی

ایران میں فروری 1979 میں شاہ مخالف عناصر غالب آ گئے۔ اس کے بعد خفیہ انقلابی عدالتیں قائم ہوئیں۔ سرسری سماعت کے بعد ان افسروں کو گولی مار کر ہلاک کیا جانے لگا جنھوں نے شاہ کے حکم کی تعمیل میں شاہ مخالف عناصر کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔ اس سلسلہ میں جو خبریں آرہی ہیں ان میں بڑی عبرت کا سامان ہے۔

جنرل ربیع شاہ کی خفیہ پولس ساواک (Savak) میں اعلیٰ افسر تھے۔ ۱۹ اپریل

1979 کو تہران میں ان لوگوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ ایران کی نئی انقلابی حکومت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔ رائٹر کے مطابق انھوں نے اپنے بیان میں عدالت سے کہا:

I am sorry I served somebody until it was too late to discover he was nothing.

مجھے افسوس ہے کہ میں شاہ ایران کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ میں اس کے بے حقیقت ہونے کو صرف اس وقت جان سکا جب کہ اس کو جاننے کا وقت نکل چکا تھا — یہی صورت زیادہ بڑے پیمانہ پر موت کے وقت پیش آتی ہے۔ آدمی اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ موت کا وقت آجاتا ہے۔ اس وقت اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جن خوش نما خیالات اور خوب صورت الفاظ کے سہارے وہ جی رہا تھا ان کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ موت کے جھٹکے کے بعد اچانک وہ ہوش میں آجاتا ہے۔ مگر اب اس کا ہوش میں آنا بے کار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بدلہ پانے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ عمل کرنے کا۔

اسی طرح، رائٹر کے مطابق، ایک اور ملزم جنرل خواجہ نوری نے عدالت کے سامنے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

Because of the heavy censorship. I was unaware of the real situation.

"خبروں پر بھاری سنسر قائم ہونے کی وجہ سے میں حقیقی صورت حال سے بالکل بے خبر رہا"۔ آخرت کے اعتبار سے بھی انسان کا حال یہی ہے۔ آدمی اپنے خیالات میں اس طرح گم رہتا ہے کہ اس کو باہر کے حقائق دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اپنی خواہشات کے خول میں بند رہتا ہے۔ وہ لفظی توجیہات وضع کرتا ہے اور ان کے سہارے جیتا رہتا ہے۔ وہ اپنے مطابق حق اور ناحق کا ایک خود ساختہ ڈھانچہ گھڑتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے حسب حال پا کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ وہ اپنی خوش خیالیوں اور دنیوی کامیابیوں کے مطابق اپنے گرد

ایک فرضی ہالہ بنالیتا ہے اوراس کے اندراس طرح صبح وشام کرتا رہتا ہے جیسے وہ ابدی حصار میں آ گیا ہے، آدمی اسی طرح اپنی زندگی کے دن گزارتا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آ کراس کے ذہنی فریب کا پردہ پھاڑ دیتی ہے۔اب اس کومعلوم ہوتا ہے کہ وہ جس فکری گھروندے میں جی رہا تھاوہ فرضی طلسمات کے سوااور کچھ نہ تھا۔وہ جن الفاظ کولکھ اور بول رہا تھا وہ معانی سے بالکل خالی تھے۔وہ جن کاموں میں مشغول تھاوہ عالم آخرت کے اعتبار سے کوئی قیمت نہ رکھتے تھے۔جن مشاغل پر اس نے خدااوراسلام کا بورڈ لگا رکھا تھا وہ محض اس کی ایک ذاتی تجارت تھی۔وہ صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے متحرک تھا نہ کہ حقیقۃً خدا کی رضا کے لیے۔

ساٹھ کیلومیٹر

جابرحسین ایک ریلوے گارڈ تھے۔ان کی ملازمت کی مدت پوری ہوچکی تھی۔ 17 جولائی 1981 کو وہ اندور۔بلاسپور ایکسپریس لے کر روانہ ہوئے۔یہ گارڈ کی حیثیت سے ان کا آخری سفر تھا۔کیونکہ اگلے دن 18 جولائی سے وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنی زندگی کا پورانقشہ بنا رکھا تھا۔ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اس نقشہ کوزیرعمل لانے کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ریلوے گارڈ کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی کے آخری سفر پرروانہ ہوتے ہوئے انھوں نے اپنے دوستوں سے کہا "کل سے میری دوسری زندگی شروع ہوگی"۔

یہ سفر جابرحسین کے لیے واقعی آخری سفر تھااوراس کے بعد ہی ان کی دوسری زندگی شروع ہوگئی۔مگراس معنی میں نہیں جس میں کہ انھوں نے سمجھا تھا کہ بلکہ کسی اورمعنی میں۔ ان کی ایکسپرس ٹرین اپنی منزل سے ساٹھ کیلومیٹر کے فاصلہ پرتھی کہ پیچھے سے آنے والی

مال گاڑی ان کی ٹرین سے ٹکرا گئی۔ گارڈ کا ڈبہ چکنا چور ہوگیا۔ جابر حسین فوراً ہلاک ہوگئے۔ ایک ریلوے افسر نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

Sixty kilometres more and it would have been the end of his official journey.

جابر حسین نے اگر 60 کیلومیٹر اور طے کرلیا ہوتا تو ریلوے ملازم کی حیثیت سے ان کا سفر پورا ہوجاتا (انڈین ایکسپرس 18 جولائی 1981)۔

یہی اس دنیا میں ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو لمبی تصور کیے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا سفر "60 کیلومیٹر" کے بعد پورا ہوگا۔ مگر موت کا فرشتہ اس کو 60 کیلومیٹر سے پہلے ہی پکڑ لیتا ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا میں "اپنی کل" کی تعمیر کا ایک نقشہ لیے ہوئے ہے مگر اچانک موت آ کر اس کو بتاتی ہے کہ اس کی "کل" اس دنیا میں شروع نہیں ہوتی جہاں 17 جولائی کے بعد 18 جولائی اور 18 جولائی کے بعد 19 جولائی کی تاریخیں آتی ہیں۔ بلکہ اس کی کل اس ابدی دنیا میں شروع ہوتی ہے جہاں دنیا کے کیلنڈر لپیٹ کر رکھ دئے جاتے ہیں۔ آدمی جہاں اپنے سفر کو ختم سمجھ رہا ہے وہیں سے اس کے حقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

کیسا عجیب

کرناٹک کے گورنر مسٹر گووند نرائن (1916-2012) کی لڑکی نندنی کی عمر ابھی صرف 38 سال تھی کہ 16 ستمبر 1981 کو نئی دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہنستی ہوئی زندگی اچانک خاموش ہوگئی۔

نندنی بہت ذہین اور تندرست تھی۔ اس کی تعلیم خالص انگریزی طرز پر ہوئی۔ اس

کے بعد اس نے امریکا سے جرنلزم (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ہندستان ٹائمس میں سینئر رپورٹر تھی۔ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے نندنی اپنے اخباری ساتھیوں کے درمیان بہت مقبول تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے الفاظ میں نندنی کی زندگی کا نظریہ یہ تھا:

She loved life to the full and wanted to live it to the full

وہ زندگی سے آخری حد تک پیار کرتی تھی اور زندگی کے ساتھ آخری حد تک رہنا چاہتی تھی۔

نندنی کی وفات پر اس کے ساتھی رپورٹروں نے ایک یادداشت (ہندستان ٹائمس، 17 ستمبر 1918) شائع کی ہے۔ اس یادداشت کے خاتمہ پر وہ لکھتے ہیں — نندنی کی موت اس حقیقت کی ایک بےرحم یاددہانی ہے کہ ہر آدمی کا ایک بے حد مقرر وقت ہے:

It is a cruel reminder of the fact that there is a deadline for everyone.

کیسی عجیب بات ہے ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ ایک لمحہ میں اس طرح ختم ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعتا اس طرح منظر سے ہٹا دی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے۔ مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بےرحمی سے کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہو جائے اور موت بلا شبہ اس حقیقت کی سب سے بہتر اور سب سے بڑی معلم ہے۔

موت کا مرحلہ

موت کا لمحہ تمام قابل قیاس اور نا قابل قیاس لمحات سے زیادہ شدید ہے۔ ہر دوسری مصیبت جس کے لیے آدمی پریشان ہوتا ہے اس مصیبت کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو موت کی صورت میں اس کے سامنے آنے والی ہے۔

موت زندگی کے سخت ترین مرحلہ کی طرف سفر ہے یہ کامل بے اختیاری کامل بے سروسامانی اور کامل بے مددگاری کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے دنیا کی ہر تکلیف کی ایک حد ہوتی ہے موت ہم کو ایک ایسی دنیا میں داخل کر دیتی ہے جس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کوئی حد نہیں۔

موجودہ دنیا میں بھی آدمی باعتبار حقیقت اسی حال میں ہے۔ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ وہ معمولی ناخوشگواری کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک سوئی کا چبھنا، ایک دن کی بھوک پیاس، چند دن کے لیے نیند نہ آنا بھی اس کے پورے وجود کو تڑپا دیتا ہے۔ تاہم موجودہ دنیا میں اس کو اس کی ضرورت کے مطابق تمام چیزیں حاصل ہیں، اس لیے وہ اپنی بے چارگی کو بھولا رہتا ہے وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔

اگر آدمی سے موجودہ دنیا چھین لی جائے جہاں پانی اور غذا ہے، جہاں ہوا اور روشنی ہے، جہاں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے تمدن بنانے کے امکانات ہیں۔ اگر موجودہ دنیا آدمی سے چھین لی جائے تو خلا کے کسی دوسرے مقام پر وہ اپنے لیے اس قسم کی ایک اور دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

دنیا میں آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ آہ واویلا کرتا ہے۔لیکن اگر وہ آنے والے دن کو جانے تو وہ کہے گا کہ خدایا جو کچھ بیت رہا ہے اس سے کہیں زیادہ سخت ہے وہ جو بیتنے والا ہے۔ دنیا میں آدمی کو عزت اور آرام حاصل ہو تو وہ فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔لیکن اگر وہ آنے والے لمحات کو جانے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا اس عزت اور آرام کی کوئی حیثیت نہیں اگر آنے والے طویل تر مرحلہ میں وہ باقی نہ رہے۔

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے مرحلۂ حیات کا آغاز ہے۔ یہ نیا مرحلہ کسی کے لیے تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت کا آغار ہوگا اور کسی کے لیے تمام راحتوں سے زیادہ بڑی راحت کا دروازہ۔

موت کے دروازے پر

موت کا مرحلہ سب سے زیادہ یقینی مرحلہ ہے جس سے آدمی کو لازماً گزرنا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو زندگی نہ ملے مگر جس کو زندگی ملی اس کے لیے موت کا آنا لازمی ہے۔ ہر آدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہر آدمی جو دیکھتا اور بولتا ہے، یقیناً ایک روز اس کی آنکھ بے نور ہوگی اور اس کا بولنا بند ہو جائے گا۔ ہر آدمی پر وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ موت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہوگی اور اس کے آگے آخرت وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہوگا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہورہا ہوگا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا وہ اپنے عمل کے میدان سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

زندگی ایک بے اعتبار چیز ہے جب کہ موت بالکل یقینی ہے۔ ہم زندہ صرف اس لیے

ہیں کہ ابھی ہم مرے نہیں ہیں اور موت وہ چیز ہے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہم ہر لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں وہ موت جس کا وقت مقرر نہ ہو جو ابھی اگلے لمحہ آسکتی ہو وہ گویا ہر وقت آرہی ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔ اس لیے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ — اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو: وعُدَّ نفسَك في أَهلِ القبورِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2333)۔

موت ہر چیز کو باطل کر دیتی ہے، وہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ ہے تاہم موت اگر صرف زندگی کا خاتمہ ہوتی تو وہ زیادہ بھیانک نہیں تھی۔ موت کا مطلب اگر صرف یہ ہوتا کہ اب آئندہ کے لیے اس انسان کا وجود نہ رہے گا جو چلتا تھا اور جو دیکھتا اور سنتا تھا تو اپنی ساری ہولناکیوں کے باوجود یہ صرف ایک وقتی حادثہ تھا نہ کہ کوئی مستقل مسئلہ۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں وہ ایک نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت کا مطلب اپنے ابدی انجام کی دنیا میں داخل ہونا ہے۔

ہر آدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے، کوئی اپنی خواہش اور انا کی تسکین کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور کسی کو خدا کے خوف اور خدا کی محبت نے بے چین کر رکھا ہے۔ دونوں قسم کے لوگ شام کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی تھکان کو مٹائیں اور اگلے دن دوبارہ صبح کرتے ہیں تاکہ پسند کی دنیا میں دوبارہ سرگرم ہو جائیں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو شخص دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔

سب سے بڑا بھونچال

آج لوگوں کے پاس الفاظ ہیں جن کو وہ بے تکان دہرا رہے ہیں مگر ایک وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ چھن چکے ہوں گے۔ ان کو اپنا ہر بول بالکل بے قیمت نظر آئے گا۔ وہاں کوئی سننے والا نہ ہوگا۔ جو اِن کے الفاظ کو سنے۔ کوئی پریس نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو چھاپے۔ کوئی لاؤڈ اسپیکر نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو فضا میں بکھیرے۔ ان کی خوش خیالیوں کا محل گر چکا ہوگا۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت ان کو نظر آجائے گا کہ دنیا میں حق کا انکار کرنے کے لیے وہ جن الفاظ کا سہارا لیے ہوئے تھے وہ کس قدر بے قیمت تھے یہ دنیا چونکہ امتحان کی دنیا ہے اس لیے یہاں الفاظ ہر معنی کو قبول کر لیتے ہیں۔ ایک ناحق بات کو بھی یہاں شان دار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے مگر موت کے بعد جو دنیا آئے گی وہاں صرف سچی بات بولنا ممکن ہوگا وہاں الفاظ کسی غلط بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ — موت کو بہت زیادہ یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے: أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ: يَعْنِي الْمَوْتَ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4258)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اگر موت کو یاد کرتا رہے تو اس کے لیے دنیا کی وہ تمام چیزیں بالکل بے حقیقت ہو جائیں جن کی خاطر وہ ظلم اور بے انصافی کرتا ہے اور اپنے لیے جہنم کی آگ میں جلنے کا خطرہ مول لیتا ہے جس مال کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھتا ہے اور اس کے سمیٹنے میں اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے وہ اس کو برت نہیں پاتا کہ موت آجاتی ہے اور اس کو اس کمائے ہوئے مال سے جدا کر دیتی ہے اگر آدمی کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو تو وہ مال کے پیچھے اپنے کو دیوانہ نہ بنائے آدمی کو کسی سے شکایت ہو

جاتی ہے اور وہ اس کو مٹانے اور اس کو برباد کرنے میں لگ جاتا ہے مگر ابھی وہ اپنے تخریبی منصوبہ کو پورا نہیں کر پاتا کہ موت اس کے اور اس کے دشمن کے درمیان حائل ہوجاتی ہے وہ اپنے دشمن کو اس کے حال میں چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے ذہن میں تازہ ہوتو وہ کبھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے، مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس کا اعتراف کرلیا تو وہ بڑائی کے مقام سے نیچے آجائے گا۔ اس کا بنا بنایا ڈھانچہ ٹوٹ کر منتشر ہو جائے گا، مگر سچائی کے انکار کے بعد اس پر چند دن بھی نہیں گزرتے کہ موت اس کی بڑائی کوختم کر دیتی ہے اور اس کا سارا نقشہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر وہ موت سے پہلے اس ہونے والے واقعہ کو یاد کرلے تو کبھی ایسی سچائی کے انکار کی جرآت نہ کرے جس کو چند لمحہ بعد اس کو بہر حال تسلیم کرنا ہے۔

ایک ایسا گھر جو کل جل کر تباہ ہوجانے والا ہو اس کو کوئی نہیں خریدتا ایک ایسا شہر جو اگلے لمحہ بھونچال کی زد میں آنے والا ہو اس میں کوئی داخل نہیں ہوتا مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موت کے عظیم تر بھونچال کے معاملہ میں ہر آدمی یہی غلطی کر رہا ہے

موت ہر چیز کو باطل کر دے گی

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی لوگ دنیا میں اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالاں کہ ان کے لیے قابل فخر بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حکم کے آگے جھکا

دیں۔ وہ اپنی غلطیوں کی توجیہ وتاویل کو کامیابی سمجھتے رہے حالاں کہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرلیں۔ ان کو الفاظ اس لیے دئے گئے تھے کہ ان کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں مگر وہ اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو انسان کی تعریف میں خرچ کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف ومحبت کے نازک جذبات اس لیے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو خدا کے لیے وقف کردیں مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف ومحبت کے جذبات کا مرکز بناتے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالاں کہ ان کے لیے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہوجائیں۔ ان کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظرانداز کر کے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معافی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شوروغل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں مصروف رہے۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ دنیا کا مال یا دنیا کی عزت پائیں تو اس کو بے حقیقت سمجھیں اور اس سے بے رغبتی کا ثبوت دیں مگر اسی کو وہ سب سے بڑی چیز سمجھ بیٹھے۔

آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بہادر بنے ہوئے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ اصل بہادری یہ تھی کہ وہ خود اپنے ظلم کو جاننے کے بہادر بنیں۔ لوگ کسی نہ کسی غیر خدا کا دامن تھام کر سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے لیے مضبوط پناہ حاصل کرلی، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خدا کے سوا کوئی نہ تھا جو کسی کے لیے پناہ بن سکے۔ لوگ الفاظ بول کر اپنے کو بری الذمہ سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ صرف حقائق تھے جو کسی کو بری الذمہ کرسکتے تھے لوگ دنیا کے اسباب کو اکٹھا کر کے مطمئن ہیں کہ جو کچھ ان کو

پاناتھا وہ انھوں نے پالیا، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب موت ان کی ہر چیز کو باطل کر دے گی اوران کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں پایا تھا۔لوگ دوسروں کی غلطیوں کی فہرست مرتب کرر ہے ہیں اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب فرشتے خود ان کی غلطیوں کی فہرست ان کے سامنے پیش کریں گے ۔لوگ زندگی کو اصل مسئلہ سمجھے ہوئے ہیں اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل مسئلہ موت تھا نہ کہ دنیا کی چندروزہ زندگی ۔لوگ اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق پا کر اپنے کو برحق سمجھ رہے ہیں ۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ حق پر صرف وہ تھا جو اللہ کے مقرر کیے ہوئے معیار کے مطابق تھا لوگ استقبال کرنے والوں کی بھیڑ پا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھ رہے ہیں ۔اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خوش قسمت صرف وہ تھا جس کے استقبال کے لیے اللہ اوراس کے فرشتے اس کا انتظار کررہے تھے — ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اوراپنے آپ کو اس کے اندر پا کر مطمئن ہے مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے " گھر " میں پناہ پکڑے ہوئے تھا جس نے اپنے لیے خدا کا سایہ حاصل کرلیا تھا۔

کل کو یاد رکھیے

لارڈ کرزن (1859-1925) 1898 میں ہندستان کے وائسرائے (Viceroy) ہو کر انگلستان سے یہاں آئے ان کی دولڑکیاں تھیں تیسری پیدائش کے وقت لارڈ کرزن اورلیڈی کرزن کی بہت خواہش تھی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہو ۔دونوں بڑی امیدوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے،مگر تیسری بار بھی مارچ

1904 میں ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اس وقت ان کا قیام نالدرا میں تھا۔ اس مناسبت سے انھوں نے اپنی لڑکی کا نام الکزنڈر نالدرا کرزن رکھا۔ لارڈ کرزن نے اس زمانہ میں اپنی بیوی کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو انھوں نے شملہ سے لندن بھیجا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اپنی بیوی کو تسکین دلانے کی کوشش کی۔ ان کے خط کا ایک جملہ یہ تھا— لڑکا یا لڑکی کا کیا فائدہ جب کہ ہم دونوں اس دنیا سے جا چکے ہوں گے۔

After all what does sex matter after we are both of us gone.

لارڈ کرزن کا یہ جملہ محض اپنی مایوس نفسیات کو چھپانے کی ایک کوشش تھی لیکن یہی بات اگر آدمی کے اندر شعوری طور پر پیدا ہو جائے تو دنیا کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے دولت، اولاد، اقتدار یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے اور ان کو حاصل کرنے لے لیے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ اگر آدمی یہ سوچ لے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو لوگوں کے اندر قناعت آجائے اور دنیا کا تمام ظلم وفساد ختم ہو جائے یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں جو پانا اگلے روز کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کرکے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لیے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اس کو کھو دے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے۔ ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گردوپیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلا جانے والا ہے۔

آدمی " آج" میں جیتا ہے وہ کل کو بالکل بھولا رہتا ہے آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں جانے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدا

کی عدالت میں لے جانے کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالاں کہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی باقی نہ رہے۔

آہ یہ انسان

تقریباً ایک درجن انڈے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ بظاہر سب انڈے اوپر سے دیکھنے میں اچھے لگتے تھے۔ مگر جب توڑا گیا تو ایک کے بعد ایک سب خراب نکلتے چلے گئے۔ آخر میں یہ معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایک بھی اچھا نہ تھا۔ سارے انڈے اندر سے خراب انڈے تھے۔ اگرچہ بظاہر اوپر سے اچھے نظر آتے تھے۔

ایسا ہی کچھ حال آج کل انسانوں کا ہو رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی آدمی ہے۔ وہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ اوپر سے ہر آدمی اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس اپنے کارناموں کی نہ ختم ہونے والی داستانیں ہیں۔ مگر جب تجربہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کچھ اور تھا۔ اوپر کے خوبصورت خول کے اندر ایک انتہائی بدہیئت اور بالکل مختلف قسم کا انسان چھپا ہوا تھا۔

جب کسی سے لین دین ہوتا ہے، جب کوئی شکایت اور تلخی کا کوئی موقع سامنے آتا ہے، جب کسی کے مفاد اور مصلحت پر ضرب پڑتی ہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا اصلی انسان وہ نہ تھا جو اوپر سے دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت کپڑوں کے اندر جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ گندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ خودغرضی، سطحیت، ظاہرداری، فخر، حسد، غرور، موقع پرستی، تعصب، استحصال، یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگ اپنے خوبصورت جسموں کے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی بظاہر اچھا انڈا ہے۔ مگر توڑنے کے بعد ہر آدمی خراب انڈا ہے۔

یہی آج کی انسانی دنیا ہے۔گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو آج کی دنیا میں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں۔دکھ کی آہیں، یا ظلم کے قہقہے، کچھ لوگ بے انصافیوں کا شکار ہو کر آہیں بھر رہے ہیں۔کچھ لوگ اپنے حیوانی ارادوں کی تکمیل کر کے فتح کے قہقہے لگا رہے ہیں۔کچھ لوگ بے شعوری کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔اور کچھ لوگ بے حسی کے گڑھے میں۔مگر یہ صورت باقی رہنے والی نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائے گا۔ایک ایسی دنیا جہاں فیصلہ کا سارا اختیار خدا کو ہوگا نہ کہ انسان کو۔

زبان والے بے زبان ہو جائیں گے

قدیم عرب میں ایک شخص جمیل بن معمر جمحی تھا۔وہ بہت ذہین آدمی تھا۔اس کے اندر یہ عجیب صلاحیت تھی کہ وہ دو متضاد نقطۂ نظر پر یکساں قدرت کے ساتھ تقریر کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس کا نام ذوالقلبین (دودل والا) پڑ گیا۔

اس قسم کے کردار مختلف شکلوں میں ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں، مگر ذوالقلبین ہونا خدا کے مقرر کیے ہوئے فطری نقشہ سے انحراف کرنا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں ایک ناپسندیدہ چیز ہے نہ کہ کوئی پسندیدہ چیز۔اس لیے قرآن میں فرمایا گیا کہ — اللہ نے کسی انسان کے دودل نہیں بنائے (33:4) ۔یعنی جب عضویاتی تخلیق میں انسان کو دودل والا نہیں بنایا گیا ہے تو سوچ اور جذبات کے اعتبار سے بھی دودل والا ہونا اس کے لیے صحیح نہیں ہوسکتا۔

موجودہ دنیا میں چونکہ انسان کو آزادی حاصل ہے اس لیے یہاں کوئی شخص ایسا کرسکتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں ایک طرز پر سوچے اور دوسرے معاملہ میں دوسرے طرز پر سوچے،

وہ ایک مجمع میں ایک ڈھنگ پر بولے اور دوسرے مجمع میں دوسرے ڈھنگ پر تقریر کرے۔ وہ جسم کے اعتبار سے ایک دل والا انسان ہونے کے باوجود ذہن اور زبان کے اعتبار سے دو دل والا انسان بن کر رہے۔ بلکہ کئی دل والا انسان بن جائے۔ مگر ایسی ہر صورت خدا کے تخلیقی نقشہ کی خلاف ورزی ہے۔ وہ فطرت کے مقررہ راستہ سے انحراف کرتا ہے۔ موجودہ دار الامتحان میں کوئی شخص ایسا متضاد رویہ اختیار کرکے کامیاب ہوسکتا ہے مگر آخرت کی حقیقی اور معیاری دنیا میں اس قسم کا خلاف فطرت رویہ بالکل بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اس قسم کا انداز اختیار کرنے والا آدمی موجودہ دنیا میں خوب کامیاب رہتا ہے وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے حسب حال بات کرتا ہے۔ وہ جس سے ملتا ہے یا جہاں جاتا ہے ہر جگہ وہی بات کہتا ہے جو وہاں کے لوگوں کی پسند کے مطابق ہو۔ مگر ایسی ہوشیاری صرف موجودہ دنیا میں کسی کے کام آسکتی ہے کیونکہ یہ دنیا سچائی کے ظہور کی دنیا نہیں۔ آخرت سچائی کے ظہور کی دنیا ہوگی وہاں حق حق کی صورت میں اور باطل باطل کی صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ وہاں جمیل بن معمر جمحی جیسے ماہرین بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ وہ ساری مہارت کے باوجود ایسا محسوس کریں گے جیسے ان کے پاس زبان ہی نہیں جس سے وہ بولیں اور ان کے پاس قلم ہی نہیں جس سے وہ کچھ لکھ سکیں۔

کیسا عجیب

میں شہر کی ایک پر رونق سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ تیز رفتار سواریاں مسلسل میرے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ وہ انسانوں کو لیے ہوئے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی منزل کی طرف رواں ہوں۔ جیسے وہ کسی پہنچنے کی جگہ پر پہنچنا چاہتی ہوں۔

یہ دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ سواریاں نہیں ہیں بلکہ خدا کے فرشتے ہیں جو انسانوں کو لیے ہوئے تیزی سے بھاگ رہے ہیں تا کہ جلد از جلد تمام انسانوں کو اس کے خالق و مالک کے دربار میں پہنچادیں۔لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف جارہے ہیں۔ حالاں کہ وہ خدا کی منزل کی طرف لے جائے جارہے ہیں نہ کہ اپنی کسی منزل کی طرف۔

زندگی کیا ہے ،موجودہ دنیا میں امتحان کی مہلت۔موت کیا ہے،آخرت کی دنیا میں بجبر داخلہ۔موجودہ دنیا میں ہم ٹھیک ویسے ہی ہیں جیسے طالب علم امتحان ہال میں ہوتا ہے۔کوئی طالب علم صرف گھنٹہ بجنے تک امتحان ہال میں رہ سکتا ہے۔گھنٹہ بجتے ہی وہ اس میں قیام کا حق کھودیتا ہے۔اسی طرح موجودہ دنیا میں انسان صرف اس وقت تک ہے جب تک موت یا قیامت کا گھنٹہ نہ بجے۔گھنٹہ بجنے کے بعد نہ دنیا اس کی رہ جاتی ہے اور نہ وہ دنیا کا۔

انسان سمجھتا ہے کہ میں اپنی دنیا میں ہوں۔ حالاں کہ وہ صرف خدا کی دنیا میں ہے۔انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ خدا کے دئے سے ملا ہے۔وہ عین اسی لمحہ چھن جائے گا جب کہ خدا ان کو چھننے کا فیصلہ کرے۔اس کے بعد انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ اس کے پاس ان چیزوں میں سے کچھ نہ ہوگا جن کو آج وہ اپنا سمجھ رہا ہے۔

انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ بھوکا ہوگا مگر اس کے پاس کھانے کو نہ ہوگا جس سے وہ اپنی بھوک مٹائے۔وہ پیاسا ہوگا مگر اس کے پاس پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرے۔اس پر سخت سردی کا موسم آئے گا مگر اس کے پاس گرم کپڑے نہ ہوں گے جن سے وہ اپنے بدن کو گرم کرے۔اس کو سخت گرمی کا سامنا ہوگا مگر اس کو کوئی سایہ نہ ملے گا جس کے نیچے جا کر وہ ٹھنڈک حاصل کرے۔

آہ ،کیسا عجیب دن انسان پر آنے والا ہے مگر وہ اس سے کتنا زیادہ غافل بنا ہوا ہے۔

جب حقیقت کھلے گی

دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ دکھاوے کے لیے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال آخرت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں جب کہا جائے گا کہ اپنے رب کو سجدہ کرو تو وہاں سجدہ نہ کر سکیں گے (القلم، 68:42)۔

سجدہ محض ایک وقتی اور رسمی نوعیت کا جسمانی فعل نہیں۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے آگے جھکانا ہے، وہ اپنی پوری زندگی کو حق وصداقت کے تابع بنا دینا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں محدود معنوں میں صرف "سجدہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ آیت پوری زندگی کے بارے میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہی ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کا یہ حال ہے کہ ان کے دل سچائی کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے تابع نہیں بنایا ہے۔ مگر ظاہری رویہ میں ہر ایک یہ دکھا رہا ہے کہ وہ حق پر قائم ہے۔ ہر ایک اپنی زبان سے ایسے الفاظ بول رہا ہے گویا کہ اس کا کیس انصاف کا کیس ہے نہ کہ ظلم اور استغلال کا کیس۔

مگر اس قسم کی دھاندلی صرف موجودہ امتحانی دنیا میں ممکن ہے۔ آخرت کے آتے ہی پوری صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ بازار میں کھوٹے سکے چل سکتے ہیں مگر بینک میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔ اسی طرح آخرت میں اس کا امکان ختم ہو جائے گا کہ کوئی جھوٹی بات کو سچے الفاظ میں بیان کرے۔ کوئی بے انصافی کے عمل کو انصاف کا عمل ثابت کرے۔

آخرت میں ہوگا کہ الفاظ جھوٹے معانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا وہ ظلم کو انصاف بتائے اور باطل کو حق کے لباس میں پیش کرے۔ اس وقت ظاہر اور باطن کا فرق ختم ہو جائے گا۔ آدمی کی زبان وہی بول سکے گی جو

اس کے دل میں ہے۔ اس دن ہر آدمی عین اس روپ میں دکھائی دے گا جو باعتبار حقیقت تھا نہ کہ اس روپ میں جو وہ مصنوعی طور پر دوسروں کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

لوگ انسان کے سامنے اپنے آپ کو حق بجانب دکھا کر مطمئن ہیں کہ وہ حق بجانب ثابت ہو گئے۔ حالانکہ حق بجانب وہ ہے جو خدا کے سامنے حق بجانب ثابت ہو۔ اور وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں صرف حق حق ثابت ہوگا اور جو باطل ہے وہ وہاں صرف باطل ہو کر رہ جائے گا۔

خدا اور آخرت

چھوڑنے کے لیے

برطانوی دورحکومت میں ہندستان کا دارالسلطنت کلکتہ تھا۔ 1911 میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دارالسلطنت کوکلکتہ سے دہلی منتقل کردیا جائے۔ انگریز ماہرتعمیرات سرایڈون لیوٹنس (1944-1869) نے نئے دارالسلطنت کا نقشہ بنایا۔ 1913 میں پرانی دہلی کے جنوب میں رائے سینا پہاڑیوں کے علاقہ میں تعمیرات شروع ہوئیں۔ بالآخر وہ عالی شان آبادی وجود میں آئی جس کونئی دہلی کہا جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ ساری دنیا میں ایک نئی سیاسی لہر آچکی تھی۔ یہ قومی تحریکوں کی لہر تھی۔ سیاسی افکار کی دنیا میں نئے انقلابات نے نو آبادیاتی نظام کا جواز ختم کردیا تھا۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ بظاہر یہ بات کھل چکی تھی کہ ہندستان میں برطانیہ کی حکومت اَب زیادہ دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔

نئی دہلی کی تعمیر کے بعد اسی زمانہ میں فرانس کے ایک لیڈر نے ہندستان کا دورہ کیا۔ جب وہ نئی دہلی آئے اور یہاں نیا تعمیر شدہ عظیم دارالسلطنت دیکھا تو انھوں نے اس پراظہاررائے کرتے ہوئے کہا— "انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی ہے، صرف اس لیے کہ وہ اسے چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave

یہ کہانی صرف برطانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کو لیے ہوئے دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تمام قوتوں کا استعمال کر کے وہ اپنا ایک "شاندارگھر" بناتا ہے۔ مگرعین اس وقت جب کہ اس کی آرزوؤں کا گھر بن کر مکمل ہوتا ہے، اچانک موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور اس کو اس کی محنتوں سے بنائی ہوئی دنیا سے جدا کر کے وہاں پہنچا دیتا ہے جس کو آرتھر کوئسلر (1983-1905) نے نامعلوم ملک (Unknown Country) کا نام دیا ہے۔

زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی ہو تو وہ کیسی عجیب دردناک کہانی ہے۔ مگر جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا بھی ایک تکمیلی جوڑا ہے، اور وہ جوڑا آخرت ہے۔ جو شخص آخرت کو بھولا ہوا ہے اس کی زندگی یقیناً صرف ایک المیہ ہے۔ مگر جو شخص امکان آخرت سے فائدہ اٹھائے اور موجودہ دنیا کے مواقع کو اگلی دنیا کی تعمیر میں صرف کرے اِس کے لیے موجودہ دنیا ایک نئی زیادہ کامیاب زندگی کا قیمتی زینہ بن جائے گی۔

آخرت کے بغیر انسان کی زندگی صرف ایک المیہ ہے۔ مگر آخرت کو ملانے کے بعد وہ ایک طربیہ میں بدل جاتی ہے۔

کہاں سے کہاں تک

5 رمضان 1404ھ کو میں دہلی کے ایک جنازہ میں شریک ہوا موت کے بعد مرنے والے شخص کو نہلایا گیا اس کو نئے کپڑے کا کفن پہنایا گیا لوگوں نے کھڑے ہو کر اس کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر میت کو اپنے کاندھوں پر لے کر چلے یہاں تک کہ قبر میں احترام کیساتھ لٹا کر اس کو ڈھک دیا گیا

میں نے سوچا کہ ایک مردہ جسم کے ساتھ اتنے زیادہ اہتمام کا حکم اسلام نے کیوں دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، مگر اس کو عام مٹی کی طرح اِدھر اُدھر پھینک نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ باقاعدہ انسان کا سا سلوک کیا جاتا ہے "مٹی" کے ساتھ "انسان" جیسا معاملہ کرنے کا حکم مرنے والے کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ زندہ رہنے والے کے اعتبار سے ہے۔ مردہ انسان کے ذریعہ زندہ انسانوں کو

سبق دیا جاتا ہے کہ بالآخر ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ زندہ لوگ مرنے والے کے روپ میں خود اپنے آپ کو دیکھیں وہ موت سے پہلے موت کا تجربہ کریں۔

یہ تجربہ اس طرح بھی ممکن تھا کہ ایک مقررہ دن کو کاغذ کا انسانی پتلا بنایا جائے اور اس کے ساتھ تمام رسوم ادا کر کے اس کو مٹی کے گڑھے میں ڈال دیا جائے اسلام نے اس تجربہ کو حقیقی بنانے کے لیے حقیقی انسان کے مردہ جسم کو استعمال کیا۔

ایک انسان ہماری طرح ایک زندہ انسان تھا۔ چلتے چلتے اس کے قدم جواب دے گئے بولتے بولتے اس کی زبان بند ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں لوگوں کے نزدیک اس کی جو قیمت تھی وہ سب اچانک ختم ہو گئی۔ اب خدا اس واقعہ کو استعمال کرتا ہے تا کہ اپنے جیسے ایک انسان کے ذریعہ لوگوں کو زندگی کا سبق یاد دلا دے۔

لوگ اس کو اہتمام کے ساتھ تیار کرتے ہیں اور پھر لے کر چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری مرحلہ میں پہنچ کر جب اس کو قبر کے گڑھے میں لٹا دیا جاتا ہے تو ہر آدمی یہ کرتا ہے کہ تین بار اپنے ہاتھ میں مٹی لے کر قبر میں ڈالتا ہے۔ پہلی بار مٹی ڈالتے ہوئے کہتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ (اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا) جب وہ دوسری بار مٹی ڈالتا ہے تو کہتا ہے: وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ (اسی میں ہم تم کو دوبارہ ڈالیں گے) اور پھر تیسری بار مٹی ڈالتے ہوئے وہ کہتا ہے: وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (20:55)، اور اسی سے ہم تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

یہ تین بار مٹی ڈالنا اس پورے قصہ کا کلائمکس (climax) ہے۔ اس طرح ایک زندہ واقعہ کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا۔

قریب مگر دور

ایرانڈیا کا ایک جہاز (Boeing 747) 23 جون 1985 کو مانٹریل سے اڑا۔ اس پر جہاز کے عملہ سمیت 329 آدمی سوار تھے وہ مانٹریل سے لندن ہوتا ہوا دہلی آنے والا تھا۔ دہلی کے پالم ایر پورٹ پر حسب معمول بہت سے لوگ اپنے آنے والے عزیزوں اور مہمانوں کا انتظار کر رہے تھے۔ آنے والے مسافروں میں کچھ وہ لوگ تھے جو کمائی کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ کچھ وہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں جو ہندستان میں شادی کرنے کے لیے آرہی تھیں۔ کچھ لوگ اپنے متعلقین سے ملنے کے لیے اپنے وطن پہنچنے والے تھے۔

اچانک خوشیاں غم میں تبدیل ہوگئیں۔ معلوم ہوا کہ جہاز اٹلانٹک کے اوپر پرواز کر رہا تھا کہ آئرلینڈ کے قریب اس کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ برباد ہو کر سمندر میں گر پڑا۔ ہوائی اڈہ پر مرنے والے مسافروں کی فہرست آویزاں کر دی گئی۔ تمام لوگ جو ہوائی اڈہ پر انتظار کر رہے تھے وہ فہرست دیکھنے کے لیے متعلقہ بورڈ کی طرف دوڑے۔ اس موقع پر ایک انگریزی اخبار کے رپورٹر نے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں:

In thier moment of stunned disbelief,each one thought "this could not be happening to me " But, with merciless equality the death list shattered all their hopes.

ہوش اڑا دینے والی بے یقینی کے اس لمحہ میں ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا حادثہ میرے ساتھ پیش نہیں آسکتا، مگر بے رحم مساوات کے ساتھ موت کی فہرست نے ان کی تمام امیدوں کو بکھیر دیا (ہندستان ٹائمس، 24 جون 1985)۔ فہرست نے بتایا کہ ہوائی جہاز کے 329 مسافر سب کے سب اچانک حادثہ کا شکار ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے انتظار کرنے والوں تک پہنچنے والا ہو۔

ہر روز اس دنیا میں بے شمار آدمی مر رہے ہیں۔ یہ واقعہ لوگوں کو ہلا دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ جب وہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ موت صرف دوسروں کے لیے ہے، اس کے اپنے لیے موت نہیں۔ اپنے کو الگ کرنے کی اس نفسیات کا نتیجہ ہے کہ آدمی سبق نہیں لیتا۔ وہ موت کے عین قریب ہو کر بھی موت کے پیغام کو نہیں سنتا۔

دنیا کی حقیقت

مسٹر آر این پانڈے (35 سال) ہندستانی فوج میں سکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ وہ 12 نومبر 1983 کو جموں توی ایکسپریس پر سوار ہوئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو انہیں احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں۔ انہیں دراصل اتکل ایکسپریس پر سوار ہونا چاہیے تھا۔ جب اوکھلا کا اسٹیشن آیا تو وہ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے۔ ٹرین اس وقت پوری رفتار میں تھی۔ وہ پہیہ کے نیچے آگئے اور اسی وقت کٹ کر مر گئے (ہندستان ٹائمس، 13 نومبر 1983)۔

یہ واقعہ موجودہ دنیا میں انسان کی بے بسی کی ایک تصویر ہے انسان ٹرین بناتا ہے جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو لے کر دوڑتی ہے اور منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر اسی ٹرین کے مقابلہ میں انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کے پہیہ کے نیچے آنے کے بعد وہ اس کی زد سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

ایک کامیاب انسان ہے۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتا ہے جو اس کی خوش حال زندگی کی علامت ہے۔ اس کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوئی ہے جو اس کی شان میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک کارخانہ کا مالک ہے جو اس کی دولت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بے شمار ساتھی ہیں جو اس کی قوت وشوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آدمی کی دنیوی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔لیکن اگر یہ تمام چیزیں سمیٹ کر اوپر سے آدمی کے سر پر گرائی جائیں تو وہ اس کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ گویا ایک بہت بڑا ملبہ ہوگا جو آدمی کے اوپر پٹک دیا گیا اور اس کے نیچے دب کر اس کا وجود دفنا ہو گیا۔

اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ دنیوی ترقی کی حقیقت کیا ہے۔دنیا کی تمام ترقیاں اسی وقت تک ترقیاں نظر آتی ہیں جب تک وہ فریب کے روپ میں ہوں۔ جیسے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آئیں وہ صرف بربادی کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ یہ ترقیاں اپنے آخری انجام کے اعتبار سے کسی کے لیے قبرستان تو بن سکتی ہیں مگر وہ کسی کے لیے کامیابی کا شاندار محل نہیں بن سکتیں۔

لذتیں جنت میں لذت ہیں اور دنیا میں صرف فریب لذت۔انسان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو وہ موجودہ دنیا میں پانا چاہتا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

بے خبر انسان

آئیوری کوسٹ (Ivory Coast) مغربی افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ یہاں بجلی افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے۔گھروں اور دکانوں کی جگمگاہٹ کی وجہ سے اس کو افریقہ کا شوکیس کہا جاتا تھا (ٹائمس آف انڈیا 4 جنوری 1984)۔

دسمبر 1983 میں اچانک وہ ایسا ملک بن گیا جہاں لوگ عالی شان ہوٹلوں میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھائیں اور گھروں اور دفتروں کو بھی موم بتی سے روشن کریں۔آئیوری کوسٹ میں 92 فیصد پن بجلی کا رواج تھا مگر بارش رک جانے کی بنا پر ڈیم سوکھ گئے اور اکثر

ٹربائن کا چلنا بند ہو گیا ۔ چنانچہ بجلی کی کٹوتی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات مسلسل 18 گھنٹے تک بجلی غائب رہی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی پیداوار گھٹ کر 35 فیصد رہ گئی کمپیوٹر الکٹرک ٹائپ رائٹر (electric typewriter) ریفریجریٹر اور اکثر بجلی سے چلنے والی چیزیں بند رہنے لگیں۔

بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اس اندیشہ سے دفتر جانا چھوڑ دیا کہ کہیں وہ لفٹ میں اٹک کر نہ رہ جائیں ایک تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے نیو یارک ٹائمز کے نمائندہ سے کہا کہ سالہا سال سے میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ائیر کنڈیشنڈ مکان سے ائیر کنڈیشنڈ کار میں اور پھر ائیر کنڈیشنڈ دفتر میں جاتا تھا میں نے کبھی یہ جانا ہی نہیں کہ حقیقۃً آئیوری کوسٹ کتنا زیادہ گرم ہے:

For years, I had gone from my air conditioned villa to my air conditioned car to my air conditioned office. I never realised just how hot it really is here.

افریقہ جیسے گرم ملک میں ائیر کنڈیشنڈ ماحول میں رہنے والا تاجر گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہا تھا جب بجلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت اس کو معلوم ہوا کہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی جس کو وہ اپنے ذہن میں بطور خود فرض کیے ہوئے تھا۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر تمام انسانوں کا ہے انسان موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کی ملکیت ہے جب انسان کی موت آئے گی اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہ محض فریب تھا۔ اس نے امتحان کی آزادی کو استحقاق کی آزادی سمجھ لیا تھا اس نے خدا کے اثاثہ کو اپنا اثاثہ فرض کرلیا تھا وہ اپنے اعمال کے لیے خدا کے یہاں جواب دہ تھا مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ وہ خواہ کچھ بھی کرے کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں۔

انسان ذمہ دار وجود ہے

دوستووسکی (1821-1881) مشہور روسی ناول نگار ہے۔ اس کا ایک کامیاب ناول "جرم وسزا" ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک بدمزاج، کریہہ المنظر اور لاولد بوڑھی عورت کو اس لیے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی بے کار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو ناول کے تمام کردار اور خود ناول کا قاری اس کو مجرم قرار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڑھیا کی دولت اس کے قاتل کے لیے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لیے ہرن کا گوشت ہوتا ہے، مگر شیر ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لیے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ قاتل کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔

اس کی وجہ کیا ہے اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار وجود ہے۔ اس کے ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ جب کہ جانور اپنے اندر اس قسم کا کوئی اخلاقی شعور نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں صرف مفید اور غیر مفید کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غیر صحیح کی۔ انسان ایک اخلاقی حیوان ہے جب کہ حیوان صرف حیوان۔

انسان اور حیوان کا یہ فرق بتاتا ہے کہ انسان اور حیوان کا معاملہ یکساں نہیں۔ حیوان کو اس کے اعمال کے لیے کسی اخلاقی عدالت میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ جب حیوان کو اعمال کے اخلاقی پہلوؤں کا شعور ہی نہیں تو اس کو اخلاق کی عدالت میں مجرم کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ انسان کے اندر معاملات کے بارے میں اچھے اور برے کا احساس ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لیے

اخلاق کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس فعل پر آدمی کا اپنا اندرونی ضمیر اس کو مجرم ٹھہرا رہا ہو اس کے لیے باہر کی عدالت میں مجرم ٹھہرانا عین فطری ہے۔

تاہم موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی عدالت نہیں جو آدمی کا اخلاقی احتساب کر سکے یہاں آدمی اپنی مجرمانہ کارروائی کو خوبصورت الفاظ میں چھپا سکتا ہے وہ قانونی نکتے نکال کر اپنے کو عدالت کی گرفت سے بچا لیتا ہے وہ زور قوت کے ذریعہ اپنے خلاف تمام زبانوں کو بند کر دیتا ہے یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان کا اخلاقی احتساب کرنے والی عدالت دنیا کے موجودہ حالات میں قائم نہیں کی جا سکتی اس کے لیے ایک اور دنیا درکار ہے جہاں وہ تمام مواقع کامل صورت میں جمع ہوں جو اس پیچیدہ کام کے لیے ضروری ہیں۔

انسان کا المیہ

خدا نے ایک دنیا بنائی۔ بے حد حسین اور انتہائی لذیز دنیا۔ خدا نے اس دنیا میں آدمی کے لیے وہ سب کچھ جمع کر دیا جس کو وہ چاہتا ہے۔ اس کے بعد خدا نے اس پر کیف دنیا میں انسان کو بسایا اور لکھ دیا کہ — انسان اس دنیا کو صرف دیکھے گا وہ اس کو پا نہ سکے گا۔

دنیا کا سکھ اور اس کی لذتیں آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کے سکھ اور اس کی لذتیں آدمی کے لیے ناقابل حصول ہیں۔ ایک شخص جس کو دنیا ابھی حاصل نہ ہوئی ہو وہ اپنے کو جتنا محروم سمجھتا ہے اتنا ہی وہ شخص بھی اپنے کو محروم پاتا ہے جس کو دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ حاصل ہو گئی ہو۔

بمبئی کا ایک فلم پروڈیوسر ہے گل آنند۔ اس کی شادی ایک خوبصورت عورت سے ہوئی جس کا نام شوبھا تھا۔ بظاہر اس جوڑے کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی کوئی شخص

تمنا کرسکتا ہے۔ بمبئی میں ان کے پاس کئی شاندار مکانات تھے، جہاں وہ خوشیوں کی جنت میں رہنے لگے۔مگر کچھ دنوں کے بعد انہیں ایک کمی کا احساس ہونے لگا۔ وہ دو ہونے کے باوجود ابھی تک اولاد سے محروم ہیں۔ اس احساس نے دونوں کے درمیان ایک خاموش دوری پیدا کرنی شروع کی۔

بالآخر انھوں نے ایک مقامی یتیم خانہ سے ایک چھوٹا بچہ اور ایک چھوٹی بچی حاصل کی۔وہ بیٹے اور بیٹی کے طور پر ان کی پرورش کرنے لگے۔تاہم یہ مصنوعی تدبیر ان کی محرومی کے احساس کو ختم نہ کرسکی۔دوری یہاں تک بڑھی کہ دونوں الگ مکانوں میں رہنے لگے۔

شوبھا کے ڈاکٹروں نے تجویز کیا کہ اس کو ذہنی اختلال ہے۔دس سال تک وہ اس مفروضہ کے تحت اس کا علاج کرتے رہے،مگر بے سود۔ بالآخر 8 فروری 1983 کو یہ المناک کہانی ختم ہوگئی۔شوبھا بمبئی میں پیڈار وڈ کے "نیلم بار" میں سولہویں منزل پر ایک اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔اس نے 8 فروری کو اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ پہلے اپنے بچوں کو کھڑکی سے باہر پھینکا اور اس کے بعد خود بھی چھلانگ لگا دی۔ تینوں نیچے گرتے ہی مر گئے۔انگریزی اخبار کی رپورٹنگ کے مطابق شوبھا کے شوہر (گل آنند) نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

I don't know the exact medical terms for my wife's mental disorders.

اپنی بیوی کے ذہنی اختلال کو بیان کرنے کے لیے متعین طبی اصطلاح مجھے معلوم نہیں (ٹائمس انڈیا، بمبئی، 9 فروری 1983)۔

چالیس سال بعد

31 جولائی 1984 کو دہلی فیض روڈ کے پاس ایک لاش ملی۔ اس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی اور اس کو بری طرح قتل کر کے ایک پارک میں ڈال دیا گیا تھا۔ پولیس نے کافی کوشش کی اور اشتہارات دیے، مگر مقتول کی شناخت ممکن نہ ہوسکی۔ مقتول کے جسم پر جو قمیض تھی اس پر "آزاد ٹیلرس" کا لیبل لگا ہوا تھا۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس پر کوڈ نمبر 52 بھی درج ہے۔ کافی تلاش و جستجو کے بعد آخر کار پولیس ساون پارک کی ایک چھوٹی سی دکان تک پہنچی۔ اس دکان کے مالک صلاح الدین نے بڑی مشکل سے "پانڈے" نام کے ایک شخص کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد پولیس قریب کے "کمال کلاتھ ہاؤس" تک پہنچی جس نے بتایا کہ مذکورہ شخص کا پورا نام دیو نرائن پانڈے تھا۔ اس کا وطن فیض آباد تھا اور کام کے لیے وہ دہلی میں رہتا تھا۔

دیو نرائن پانڈے موزائک فرش کی پالش (mosaic floor polish) کا کام کرتا تھا۔ پولس کی یہ تحقیق جاری رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ مذکورہ شخص نے چالیس سال پہلے ایک شخص کو کسی ذاتی رنجش کی بنا پر مار ڈالا تھا۔ اس مقتول کا بھتیجا مہندر کمار چودھری (23 سال) بچپن سے اپنے گھر میں سنتا آیا تھا کہ پانڈے نے اس کے چچا کو قتل کیا ہے۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے دیو نرائن پانڈے سے دوستی کی اور ایک دن موقع پا کر اس کا قتل کر دیا۔ قاتل اب پولیس کی حراست میں ہے اور اس نے جرم کا اقبال کر لیا ہے (ہندستان ٹائمس، 14 ستمبر 1984ء)۔

مہندر کمار چودھری کا خاندان چالیس سال بعد بھی اپنے قاتل کو نہ بھلا سکا۔ اس کے انتقام کی آگ اس وقت تک ٹھنڈی نہ ہوئی جب تک اس نے مارنے والے کو مار نہ ڈالا۔

ہر ماحول میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا حل بدلہ لینا نہیں بلکہ بھلا دینا ہے۔ شکایت کو بھلانا مسئلہ کو گھٹاتا ہے اور شکایت کا بدلہ لینا مسئلہ کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔

مگر یہ کوئی آسان معاملہ نہیں۔ آدمی ایک کھوئی ہوئی چیز کو اسی وقت بھلا سکتا ہے جب کہ وہ اس سے بڑی چیز اپنے لیے پا لے۔ محرومی کو بھلانے کے لیے ہمیشہ کوئی بڑی چیز درکار ہوتی ہے اور یہ "بڑی چیز" صرف آخرت ہے۔ آخرت کا عقیدہ آدمی کو وہ سب سے بڑی چیز دے دیتا ہے جس کے مقابلہ میں ہر چیز کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کو پانے والا ہر دوسری چیز کا کھونا گوارا کرلیتا ہے۔

31 دن کے لیے

جنوری 1983 میں آندھرا پردیش میں تلگو دیسم پارٹی برسر اقتدار آئی تاہم 16 اگست 1984 کو گورنر مسٹر رام لال نے تلگو دیسم وزارت کو برخاست کر دیا اور مسٹر نریندر بھاسکر راؤ سے کہا کہ وہ کانگریس سے مل کر وزارت بنائیں۔ گورنر نے ازروئے دستور یہ ہدایت کی کہ وہ 30 دن کے اندر یہ ثابت کریں کہ 293 رکنی اسمبلی میں ان کی اکثریت ہے۔

اس کے بعد ممبروں کو توڑنے کی کوشش شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایک ممبر کی قیمت 20 لاکھ روپے تک لگادی گئی (ہندستان ٹائمس، 13 ستمبر 1984)۔ مگر معزول وزیر اعلیٰ مسٹر این ٹی راما راؤ نے وزارت کی برخاستگی کے بعد اپنی پارٹی کے ممبران اسمبلی کو اپنے راما کرشنا اسٹوڈیوز میں بند کر دیا۔ 30 دن گزر گئے اور مسٹر بھاسکر راؤ اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ ان کی وزارت غیر قانونی ہوگئی۔ چنانچہ نئے گورنر

شنکر دیال شرما نے 16 ستمبر 1984 کو نیا حکم جاری کیا جس کے مطابق مسٹر بھاسکر راؤ کو وزارت چھوڑ دینی پڑی اور مسٹر این ٹی راما راؤ دوبارہ حکومت کے ایوان میں داخل ہو گئے۔

اس سلسلے میں ٹائمس آف انڈیا (19 ستمبر 1984) نے ایک خصوصی رپورٹ میں دکھایا ہے کہ مسٹر بھاسکر راؤ نے اپنی مختصر وزارت کے دوران کیا کیا۔ انھوں نے حکومت کا ایک سو کرور روپیہ سے زیادہ کا فنڈ ریلیز کر دیا انھوں نے اسمبلی کے ممبروں کو کھلی پیشکش کردی کہ پارٹی چھوڑ کر آؤ اور وزیر بن جاؤ۔

Defect and be a minister

اس قسم کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے اخبار مذکورہ کا نامہ نگار لکھتا ہے کہ مسٹر بھاسکر راؤ 31 دن تک وزیر اعلیٰ رہے۔ اس غیر یقینی مدت میں انھوں نے اس طرح عمل کیا گویا کہ وہ اس عہدہ پر ایک سو سال تک رہنے کے لیے آئے تھے:

During his 31-day uncertain career as chief minister, Mr. Bhaskara Rao behaved and acted as if he had come to stay for a hundred year.

یہی ہر آدمی کا حال ہے موجودہ دنیا میں ہر آدمی صرف "30 دن" کے لیے آیا ہے مگر وہ اس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ "سو سال" سے پہلے یہاں سے جانے والا نہیں۔ کیسا عجیب ہے موجودہ دنیا میں انسان کا آنا اور کیسا عجیب ہے اس کا یہاں سے جانا۔

سب سے بڑی خبر

ایک نوجوان دہلی میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ ایک روز میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، رات کو واپس آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ آج مذکورہ نوجوان کئی بار آپ سے ملنے کے لیے آچکے ہیں۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ گھنٹی

بجی۔ دروازہ کھولا گیا تو مذکورہ نوجوان تیسری بار مجھ سے ملنے کے لیے دروازے پر موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولے ”آج میں آپ کو ایک خوش خبری دینے آیا ہوں“۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرا پروموشن ہو گیا ہے اور اب میری تنخواہ میں سو روپیہ ماہوار کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں نے سوچا کہ آدمی کے پاس اگر کوئی اہم خبر ہو تو وہ اس کو چھپانے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اہم خبر کو آدمی بتا کر رہتا ہے۔ بلکہ وہ ڈھونڈتا ہے کہ کوئی ملے تاکہ وہ اس کو بتا سکے۔ کسی نے نئی کار خریدی ہو یا نیا مکان بنایا ہو تو اس کا چرچا کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ کسی مجلس میں اگر اس کی کار یا اس کا مکان موضوع گفتگو نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح موضوع کو بدل کر ایسے رخ پر لاتا ہے کہ وہ اپنی نئی کار اور نئے مکان کی خبر لوگوں کو دے سکے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی اہم خبر کو دوسروں کو سنانے کے لیے بے قرار نہ رہتا ہو۔

آج بے شمار آوازیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہے جس کو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر سنانے والوں کی بھیڑ میں کوئی آخرت کی خبر سنانے والا نہیں۔ کوئی جنت اور جہنم سے آگاہ کرنے والا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے اور لکھنے والوں کے پاس آخرت کی خبر ہی نہیں۔ ہر ایک کے پاس دنیا کی کوئی نہ کوئی خبر ہے۔ آخرت کی خبر کسی کے پاس موجود ہی نہیں۔ اگر کسی کے پاس آخرت کی خبر ہوتی تو وہ اس کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ آخرت کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے لیے کوئی دوسری خبر، خبر نہ ہوتی جس کو سنانے کے لیے وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ اپنی ساری طاقت اور سارا وقت بس آخرت کی خبر سنانے میں لگا دیتا، جہنم سے ڈرانے اور جنت کی خوش خبری دینے کے سوا کوئی کام اس کو کام نظر نہ آتا۔

اگر یہ معلوم ہو کہ اگلے چند لمحہ کے بعد بھونچال آنے والا ہے یا آتش فشاں پھٹنے والا ہے تو ہر آدمی اسی کا تذکرہ کرنے میں مشغول ہوگا۔ ہر دوسری بات کو بھول کر لوگ آنے والے ہولناک لمحہ پر بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر تقریر کرنے والے تقریریں کر رہے ہیں اور مضامین لکھ رہے ہیں مگر یہ سب چیزیں قیامت کے تذکرہ سے اس طرح خالی ہوتی ہیں جیسے کہ لوگوں کو آنے والے ہولناک دن کی خبر ہی نہیں۔

آدمی اکثر اپنے گردو پیش کے مسائل میں الجھا رہتا ہے، ذاتی یا قومی قسم کے معاشی اور سیاسی اور سماجی واقعات جن کا وہ اپنے آس پاس تجربہ کرتا ہے وہ انہیں کو واقعہ سمجھتا ہے اور انہیں کے چرچے میں مشغول رہتا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ قیامت کا مسئلہ ہے۔ قیامت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، مگر وہ ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے، وہ تمام واقعات سے زیادہ اس قابل ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے۔

کل کو جانیے

ضیاء الرحمٰن (1981-1936) سابق صدر بنگلہ دیش ڈھاکہ سے چاٹگام گئے۔ وہاں وہ 30 مئی 1981 کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے تھے کہ رات کے وقت ان پر حملہ کر کے انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کو ہلاک کرنے والا بنگلہ دیش کا ایک فوجی افسر میجر جنرل منظور تھا۔ میجر جنرل منظور نے یہ گمان کیا تھا کہ صدر ضیاء الرحمٰن کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد بنگلہ دیش کی حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط نکلا فوج کے ایک دستہ کے سوا عام فوجیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف دو دن بعد 2 جون 1981 کو مخالف فوجیوں نے انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جنرل منظور کا جو انجام ہوا وہی اس دنیا میں ہر آدمی کا انجام ہو رہا ہے۔ کسی کا بظاہر فوج کی گولی کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوئی فرشتوں کے ذریعہ موت کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا کوئی "جنرل منظور" یہ نہیں سوچتا کہ اپنے حریف کو قتل کرنے کے اگلے ہی دن وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسرے کو موت کے گڑھے میں گرانے کے بعد وہ خود بھی لازمی طور پر موت کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ میں وہی بن جاتا ہے جو دوسرا اپنے دائرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص "جنرل منظور" ہے۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کر کے سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔

ہر شخص جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے "آج" کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے "کل" کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ بالآخر تم جس سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمھارا کل ہے نہ کہ تمھارا آج۔

آنے والا طوفان

11 اگست 1979 کو موروی (گجرات) میں اچانک ایک سیلاب آیا جس نے پوری بستی کو تہس نہس کر دیا۔ بستی کے کنارے ایک بڑا بند تھا۔ غیر معمولی بارش سے اس کا پانی بہت اونچا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس نے بند کو توڑ ڈالا۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں "تقریباً 20 فٹ اونچی پانی کی دیوار" اتنی تیزی کے ساتھ بستی کے اندر داخل ہوئی کہ کوئی اس سے بچ نہ سکتا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر پانی کا یہ طوفان بستی کی تمام چیزوں کو برباد کر کے نکل گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً 25 ہزار آدمی اس اچانک سیلاب میں مر گئے۔ جب کی بستی کی کل آبادی تقریباً 40 ہزار تھی بربادی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دیگر چندوں کے علاوہ صرف مرکزی حکومت نے فوری امداد کے طور پر پانچ کروڑ روپے حکومت گجرات کو دیے ہیں۔

ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار ارن کمار نے جو چشم دید رپورٹ (ہندستان ٹائمس 19 اگست 1979) شائع کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ بچے ہیں ان میں سے ہر شخص کے پاس بتانے کے لیے ایک پُر درد کہانی ہے۔ ان کو جو صدمہ اور تکلیف پہنچی ہے اس کے احساس سے وہ ابھی تک نکل نہیں سکے ہیں، کچھ کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گویائی کھو دی ہے۔ وہ بالکل سراسیمہ اور ہکا بکا دکھائی دیتے ہیں:

Some have lost their speech and look absolutely dazed and blank.

ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے ایک تباہ حال زمین دار کو اس وقت حیرت ناک خوشی ہوئی جب سرکاری ذمے داروں نے اس کو 18 ہزار روپے نقد 225 گرام سونے کے زیورات یہ کہہ کر دئیے کہ یہ تمھارے گھر کے اندر سے دستیاب ہوئے ہیں (ہندستان ٹائمس 20 اگست 1979)۔

اس طرح کے واقعات جو زمین پر روزانہ ہوتے رہتے ہیں، وہ اس لیے ہوتے ہیں تاکہ آدمی آخرت کے دن کو یاد کرے۔ آخرت کا عظیم تر سیلاب بھی بالکل اچانک آئے گا۔ بہت سے لوگ اس دن اس طرح برباد ہوں گے کہ ان کے الفاظ کے ذخیرے تک ختم ہوجائیں گے جو دنیا میں ہر آدمی کو نہایت وافر مقدار میں حاصل ہیں۔ ان کی چلتی ہوئی زبانیں بند ہوجائیں گی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے اپنی ہولناک بربادی کو دیکھیں گے اور کچھ بول نہ سکیں گے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو یہ خوش خبری دی جائے گی کہ ہلاکت اور بربادی کے عمومی طوفان نے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ تمھارا بہترین اثاثہ اللہ کے مزید انعام کے ساتھ آج تمھارے حوالے کیا جائے گا۔ ایک ہی سیلاب کچھ لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا اور کچھ لوگوں کے لیے وہ جنت کی ابدی خوشیوں میں داخلہ کا دن بن جائے گا۔ "سیلاب" سے پہلے آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ہر ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لیے شاندار الفاظ پالیتا ہے۔ مگر "سیلاب" کی ہولناکی کو دیکھتے ہی اس کا سارا زور ختم ہوجائے گا اور ایسا معلوم ہوگا گویا اس کے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے وہ اپنی روش کی صفائی پیش کرسکے۔

اس وقت کیا ہوگا

بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ مجھے قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ۔ میں نے کہا، اے خدا کے رسول میں آپ کو قرآن سناؤں اور وہ آپ کے اوپر اترا ہے۔ آپ نے فرمایا مجھے پسند ہے کہ میں قرآن کو اپنے سوا دوسرے سے سنوں۔ میں نے سورہ نساء پڑھنی شروع کی،

یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (4:41)۔ یعنی، پھر کیا ہوگا جب ہم ہر قوم سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تم کو گواہ بنا کر لائیں گے۔ آپ نے فرمایا بس کرو۔ میں نے دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے: فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4582)۔

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لیے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہی شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اسی کو خدا کی طرف سے اس خاص بندہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے گا جس کو خدا نے اپنی طرف سے لوگوں کو آنے والے دن سے باخبر کرنے کے لیے چنا تھا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور آدمی سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لیے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

ان لوگوں کا اس وقت کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتارا جائے گا اور لوگ دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے بالکل خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں اتنی قبیح ہو جائیں گی کہ لوگ اس کی طرف نظر کرنے سے بھی گھبرائیں گے۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں کسی کے لیے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کے لیے اس کی مادی رونقیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا

اندازہ ہوجائے تو ان کے الفاظ کی شدت ختم ہوجائے، کسی چیز میں ان کے لیے لذت باقی نہ رہے دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہوجتنا دنیا کی بے عزتی۔

نامعلوم مستقبل

آدمی اس دنیا میں معصوم کلی کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین امنگوں اور حوصلوں کے ساتھ اس کو پالتے ہیں۔ وہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں اپنی زندگی کی جدو جہد شروع کرتا ہے جہاں اس کے لیے تلخ تجربات اور ناخوشگوار یادوں کے سوا اور کوئی چیز موجود نہیں۔

انسان آرزوؤں کے محل بناتا ہے، صرف اس لیے کہ سنگین حقائق اس کی نفی کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے مٹادیں وہ حوصلوں کی دنیا آباد کرتا ہے۔ مگر اس کے حوصلے صرف اس کے دماغ میں رہ جاتے ہیں۔ وہ خارجی دنیا میں واقعہ نہیں بنتے۔ وہ امیدیں قائم کرتا ہے، مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی امیدیں فرضی سپنے کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی ایک نازک شیشہ ہے جو صرف اس لیے دنیا میں آتی ہے کہ حالات کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہوجائے۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز سنہری آرزوؤں کے ساتھ کرتا ہے۔ مگر بالآخر جو چیز اس کے حصہ میں آتی ہے وہ صرف آرزوؤں کا ایک قبرستان ہے جو اس کے سینے میں دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیسی کیسی امیدیں، کیسی کیسی تمنائیں اور کیسے کیسے خواب ہوتے ہیں جن کی وہ اپنی روح کے سب سے نازک گوشہ میں پرورش کرتا ہے، مگر سب کا سب ناتمام رہتا ہے۔ وہ حسرتوں کا قبرستان بنا ہوا زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جب کہ وہ ایک نامعلوم مستقبل کی طرف دھکیل دیا جائے۔

انسان کا ماضی امیدوں اور تمناؤں کا ماضی ہے اس کا حال نا کامیوں اور حسرتوں کا بہت بڑا مزار ہے اور اس کا مستقبل ایک نا معلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ آغاز اور کیسا عجیب ہے اس کا انجام۔

خدا نے ایسا کیوں کیا۔ اس کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ وہ زندگی میں کھو جانے کے بجائے زندگی کے آغاز و انجام کے بارے میں سوچے۔ جو شخص سنجیدگی کے ساتھ اس معاملہ میں سوچے گا وہ اس کامل حکمت کو پالے گا جس کی طرف یہ ناقص دنیا ہر آن اشارہ کر رہی ہے۔

الٹا رُخ

ایک مولوی صورت آدمی ایکسپریس ٹرین کے فرسٹ کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے سوا کیبن میں تین اور مسافر تھے اور تینوں پورے معنوں میں "مسٹر" تھے۔ مذکورہ مسافر کے سادہ لباس اور اس کے چہرے کی شرعی داڑھی نے اس کو اس ماحول میں اجنبی بنا دیا۔

کئی اسٹیشن گزر گئے۔ تینوں مسٹر آپس میں باتیں کرتے رہے مگر کسی نے مولوی کی طرف رخ نہیں کیا۔ مولوی شاید ان کے نزدیک اس قابل نہ تھا کہ اس سے بات کی جائے۔ آخر مولوی نے یہ کیا کہ اگلے اسٹیشن پر ایک انگریزی اخبار خریدا اور اس کو ہاتھ میں لے کر الٹی طرف سے دیکھنے لگا۔ مسٹر صاحبان یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے۔ ایک شخص نے دوسرے سے انگریزی میں کہا۔ اس مولوی کو دیکھو الٹی طرف سے اخبار پڑھ رہا ہے۔ دوسرا بولا یہ شخص جب انگریزی نہیں جانتا تو اس کو خواہ مخواہ انگریزی اخبار خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔

مسٹر صاحبان کو یقین تھا کہ مولوی ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں رہا ہے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ مولوی ان سے زیادہ انگریزی جانتا ہے۔ اس کے بعد مولوی ان کی طرف مخاطب ہوا اور

انگریزی زبان میں مسلسل بولنا شروع کیا۔ اس نے انگریزی میں کہا: کیا یہ کوئی قانونی جرم ہے کہ اخبار کو الٹی طرف سے پکڑا جائے۔ آخر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کو دوسری طرف موڑ دیا۔ اس نے کہا: ایک اخبار کو الٹی طرف سے پکڑنا آپ کو اتنا عجیب معلوم ہوا مگر معاف کیجیے آپ اور آپ جیسے بے شمار لوگ پوری زندگی کو الٹی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔

زندگی کو غیر مادی مقصد کی طرف سے پکڑنا چاہیے اور لوگ اس کو مادی مقاصد کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کو روح کی طرف سے پکڑنا چاہیے اور لوگ اس کو جسم کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح رخ یہ ہے کہ اس کو آخرت کی طرف سے دیکھا جائے۔ مگر لوگ اس کو دنیا کی طرف سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا سب سے اہم مسئلہ موت ہے، مگر تمام لوگ زندگی کو سب سے اہم مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا کی نظر سے انسان کو دیکھا جائے، مگر آج سارے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ انسان کی نظر سے خدا کو دیکھ رہے ہیں۔

اخبار کا الٹا رخ ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے اور زندگی کا الٹا رخ کسی کو نظر نہیں آتا۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے کو دیکھنے والا سمجھتے ہیں، مگر ان کو وہی چیز دکھائی نہیں دیتی جس کو انھیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہیے۔

انجینئرنگ کافی نہیں

ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں دنیا کے مشہور ترین تعمیراتی انجینئر تھے۔ وہ ڈھاکہ میں پیدا ہوئے کلکتہ میں تعمیراتی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اس فن میں امریکا سے

ڈاکٹر کی ڈگری لی۔ 1963 میں انھوں نے شکاگو میں 43 منزلہ عمارت کا ٹھیکہ لے کر اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی وجہ سے انھوں نے اس میدان میں مجتہدانہ کارنامے انجام دئے۔ شکاگو میں 110 منزلہ عمارت سیئرز ٹاور (Sears Tower) بنانے کے بعد انھوں نے جدید تعمیرات میں عالمی شہرت حاصل کی۔ دنیا کی یہ سب سے اونچی عمارت ان کے اپنے وضع کردہ غیر روایتی اصولوں پر بنائی گئی ہے جس کو Tubular Design کہا جاتا ہے (ہندستان ٹائمس، 9 مئی 1982)۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں کو اپنی غیر معمولی کامیابی کے باوجود قلبی سکون حاصل نہ تھا۔ مسٹر کے ایم املادی 1976 میں فضل الرحمٰن خاں کے شکاگو کے دفتر میں ملے تھے۔ مسٹر املادی نے انہیں ان کی کامیابیوں پر مبارک باد دی مگر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اس کو سادہ چہرے کے ساتھ سنا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران مسٹر املادی سے کہا کہ زندگی انجینئرنگ سے زیادہ ہے۔

Life is more than engineering.

27 مارچ 1982 کو ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں کا اچانک اس وقت انتقال ہو گیا جب کہ ان کی عمر صرف 52 سال تھی۔ فضل الرحمٰن خاں نے تعمیراتی انجینئرنگ میں جو اجتہادی اصول وضع کیے۔ ان کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے جرمن انجینئر رابرٹ گیبریل (Robert Gabriel) نے 365 منزلہ عمارت کا منصوبہ بنایا ہے جو زمین سے ایک میل اونچی ہوگی۔ مسٹر املادی نے اپنی ملاقات میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن خاں سے پوچھا کہ کیا وہ ایسی عمارت کی تعمیر کو ممکن سمجھتے ہیں۔ فضل الرحمٰن خاں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے املادی اپنے مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتے ہیں کہ آئندہ یورپ اور امریکا میں ایسی اونچی عمارتیں کھڑی ہو چکی ہوں گی، مگر افسوس کہ وہی آدمی ان کو دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوگا جس

نے ایسی عمارتوں کی تعمیر کو ابتدائی طور پر ممکن بنایا تھا۔

The man who laid the foundation for making them possible,
alas, will no longer be there to witness them.

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو۔ یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مر جاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کرسکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لیے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کررہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کرکے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد

،گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھالیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لیے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پالیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہو کر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتارہا ہو۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ 20 سال پہلے وہ معمولی مکینک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاءاللہ اپنے کاروبار میں ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کر لی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لیے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کرلیا ہے۔اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔کم از کم "سوسال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کر کے مطمئن ہے۔کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کرلیا ہے۔کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعہ معاش اور اپنے بینک بیلنس پر ناز ہے۔کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی دادا گیری پر بھروسہ کیے ہوئے ہے۔کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کرلی ہے،اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لیے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لیے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے۔اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل

عاجز ہے۔اس کے لیے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اوراس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنا یا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لیے ہوئے تھے۔

ہرطرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم وفساد کو عین حق وانصاف کا روپ دے سکیں۔ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل ومسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آ گیا ہے جو صرف اس لیے آیا تھا کہ ان کی ساری بداعمالیوں

کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لیے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لیے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہوگئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہوسکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہوگئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دن ہاتھ آ گیا ہے جو صرف بحث ومباحثہ کرنے کے لیے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لیے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہوگئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہوکر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کردے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہوگا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اصل صورت میں نمایاں ہوجائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہوجائے گی۔

کامیابی کی فہرست

سید محمد کیرلا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے 80 سالہ انگریز استاد پروفیسر سٹیونس (Dr. Cleveland Stevans) نے 1957 میں کہا تھا کہ اے نوجوان شخص، ایک دن تم یہاں اپنے ملک کے نمائندہ بن کر آؤ گے۔ مگر میں اس وقت تم کو دیکھنے کے لیے موجود نہ ہوں گا:

Young man, one of these days you will come here to represent your country. But I would not be there to see you.

یہ پیشین گوئی 23 سال بعد پوری ہوئی اور سید محمد ہندستان کے ہائی کمشنر بن کر لندن گئے۔

سید محمد نے بیرسٹری سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انھیں بہت سے اعلیٰ عہدے ملے۔ وہ اقوام متحدہ میں ہندستان کے مندوب تھے۔ کیرلا کابینہ میں وزیر ہوئے۔ مائنارٹیز کمیشن کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سید محمد کے خاص دوستوں میں ایک مسٹر خوشونت سنگھ بھی تھے۔ انھوں نے سید محمد کے بارے میں ایک مضمون لکھتے ہوئے اس کو اس پیراگراف پر ختم کیا ہے:

Seyyed's passions were politics and law. He had applied for the Congress-I ticket to fight the last Parliamentary elections. Going by his records he would have undoubtedly won it. Kerala State Congress bosses denied him the ticket. It broke Seyyed's heart and a month later the setback took his life.

سید محمد کا شوق سیاست اور قانون تھا۔ انھوں نے کانگرس آئی کے ٹکٹ کے لیے درخواست دی تھی تاکہ حالیہ پارلیمنٹری الیکشن میں لڑ سکیں۔ اپنے حالات کے لحاظ سے وہ ضرور کامیاب ہوتے۔ کیرلا ریاستی کانگرس کے ذمہ داروں نے انھیں ٹکٹ دینے سے

انکار کیا۔اس واقعہ نے سید محمد کا دل توڑ دیا اور ایک ماہ بعد اس حادثہ نے ان کی زندگی لے لی (ہندستان ٹائمس، 23 مارچ 1985)۔

آج انسان کامیابیوں کی فہرست میں صرف ایک کمی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ حالانکہ انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کامیابیوں کی پوری فہرست اس سے چھن جائے گی۔ کیسا عجیب ہوگا وہ دن اور کیسا عجیب ہوگا اس دن انسان کا حال۔

چھت گر پڑی

1968 کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڑھ کی ایک دوکان میں داخل ہوا۔ وہاں میرے ایک جانے پہچانے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ سلام کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اب بھی وہ خاموش ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔ " کیا یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں" میں نے سوچا۔ مگر میری آنکھیں اس شبہ کی تردید کر رہی تھیں۔ جو شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا وہ یقینی طور پر وہی شخص تھا جس کو میں پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ بظاہر یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مجھ کو بھول گئے ہوں۔

دکان کے مالک کو جلد ہی حیرانگی کا احساس ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک سخت حادثہ پیش آ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا نیا مکان بنا رہے تھے۔ دیواریں کھڑی ہوگئیں تو حسب قاعدہ ان کے اوپر سانچہ بنا کر چھت ڈلوائی مگر ایک ماہ بعد جب سانچہ کھولا گیا تو ساری چھت دھڑام سے گر پڑی۔ اس حادثہ کا ان کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ نیم پاگل ہو گئے۔ اب وہ نہ کوئی

کام کرتے ہیں نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔بس بت کی طرح اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں جیسا کہ اس وقت آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔مزید تحقیق کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ لوگوں نے یہ کاروبار کیا ہے کہ سیمنٹ کے رنگ کی مٹی (پنڈول) کو باریک پیس کر بوریوں میں بھر دیتے ہیں۔یہ مٹی دیکھنے میں بالکل سیمنٹ جیسی ہوتی ہے۔اس لیے لوگ اس کو سیمنٹ سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔مذکورہ بزرگ کو بھی اتفاق سے اسی قسم کی سیمنٹ مل گئی۔اوراسی سیمنٹ سے انھوں نے اپنی چھت بنوادی۔ظاہر ہے کہ ایسی سیمنٹ سے بنی ہوئی چھت کا وہی انجام ہونا تھا جو ہوا۔

اسی طرح کوئی دولت کو اپنی چھت بنائے ہوئے ہے۔کسی کو اپنے الفاظ پر بھروسہ ہے۔کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھیوں کی مدد اس کے لیے کافی ہے۔کوئی بڑوں کا سہارا پکڑے ہوئے ہے۔ مگر یہ سب جھوٹے سہارے ہیں۔قیامت جب ظاہری سانچہ کو ہٹائے گی تو اچانک لوگوں کی چھت ان کے اُوپر اس طرح گر پڑے گی کہ وہاں کوئی تنکا نہ ہوگا جو آدمی کا سہارا بن سکے۔

خدا کی دنیا

خدا کی دنیا

جب آپ اپنے کمرہ میں ہوں تو آپ اس کی چھت کو ناپ کر معلوم کرسکتے ہیں کہ اس کی لمبائی کتنی ہے اور چوڑائی کتنی۔ مگر جب آپ کھلے میدان میں آسمان کے نیچے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپنے کے لیے آپ کے تمام پیمانے ناکافی ہیں۔ یہی حال خدا کی پوری کائنات کا ہے۔ ایک بیج جس طرح بڑھ کر درخت کی ایک دنیا بناتا ہے اس کو کون بیان کرسکتا ہے۔ سورج کی روشنی، ہواؤں کا نظام، چڑیوں کے نغمے، پانی کے بہتے ہوئے چشمے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سچائی اس سے زیادہ لطیف ہے کہ اس کو انسانی لفظوں میں بیان کیا جاسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں زبان گنگ ہوجاتی ہے وہاں سے حقائق شروع ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ ساتھ نہیں دیتے وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ خدا چپ کی زبان میں بول رہا ہے اور ہم اس کو شور کی زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی آوازوں کو سن سکیں۔ اس دنیا کی سب سے قیمتی باتیں وہ ہیں جو چپ کے بول میں نشر ہورہی ہیں مگر جو لوگ صرف شوروغل کی بولیاں سننا جانتے ہوں وہ ان قیمتی باتوں سے اسی طرح ناآشنا رہتے ہیں جس طرح ایک بہرا شخص کسی عمدہ موسیقی سے۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی جب اس دنیا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خدا کی اس ابدی دنیا کا باشندہ بن جائے۔ وہ ہواؤں میں شامل ہوجائے وہ درختوں کی سرسبزیوں میں جا بسے۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ مگر انسان کی محدودیتیں اس کی اس خواہش کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنی محبوب دنیا کو دیکھتا ہے مگر اس میں شامل نہیں ہو پاتا۔ شاید جنت اسی کا نام

ہے کہ آدمی کو اس کی محدود یتوں سے آزاد کر دیا جائے تا کہ وہ خدا کی حسین دنیا میں ابدی طور پر داخل ہو جائے۔

انسان نے جو تمدنی دنیا بنائی ہے وہ خدا کی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی سواریاں شور اور دھواں پیدا کرتی ہیں مگر خدا کی دنیا میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور نہ کہیں شور ہوتا ہے اور نہ دھواں۔ انسان انسان کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، مگر خدا کی دنیا میں ہوا اس طرح گزرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ انسان اپنی غلاظت کو کاربن اور پسینہ اور بول و براز کی صورت میں خارج کرتا ہے مگر خدا نے اپنی دنیا میں جو درخت اُگائے ہیں وہ اس کے برعکس اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوش بو کی صورت میں۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام شہروں میں کوڑے کو ٹھکانے لگانا ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر خدا کی بنائی ہوئی وسیع تر دنیا میں ہر روز بڑے پیمانہ پر "کوڑا" نکلتا ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس کو (Recycle) کر کے دوبارہ کائنات کے مفید اجزاء میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جو شخص حقیقت کی جھلک دیکھ لے تو وہ اس کے بیان سے اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر چپ طاری ہو جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظوں کا سیلاب بہانے لگے۔

ہم خدا کے ملک میں ہیں

ایک امریکی خاتون سیاحت کی غرض سے روس گئیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی کے چیف کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات انہیں پسند نہیں آئی۔ ایک موقع پر وہ کچھ روسیوں سے اس پر تنقید کرنے لگیں خاتون کے ساتھی نے ان

کے کان میں چپکے سے کہا "میڈیم آپ اس وقت روس میں ہیں، امریکا میں نہیں ہیں"۔

آدمی اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق رہ سکتا ہے۔لیکن اگر وہ کسی غیر ملک میں جائے تو وہاں اس کو دوسرے ملک کے نظام کی پابندی کرنی پڑے گی۔اگر وہ وہاں کے نظام کی خلاف ورزی کرے تو وہ مجرم قرار پائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا ہے۔انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔یہ مکمل طور پر بنائی ہوئی دنیا ہے۔گویا انسان یہاں اپنے ملک میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ملک میں ہے۔

ایسی حالت میں انسان کی کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ خدا کی سکیم کو جانے اور اس اسکیم کے مطابق اس دنیا میں رہے۔اگر وہ یہاں خدا کی اسکیم کے خلاف رہے گا وہ باغی قرار پائے گا اور اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کو سخت سزا دے کر ہمیشہ کے لیے اپنی تمام نعمتوں سے محروم کر دے۔

دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق رہنے کا طریقہ کیا ہے، یہی وہ سوال ہے جس کا جواب دینے کے لیے خدا نے اپنے پیغمبر کھڑے کیے۔پیغمبروں نے انسان کی قابل فہم زبان میں کھول کھول کر بتایا کہ انسان سے خدا کو کیا مطلوب ہے۔اور خدا کی وہ اسکیم کیا ہے جس کی انسان کو پابندی کرنی چاہیے۔

قرآن اسی پیغمبرانہ ہدایت کا مستند مجموعہ ہے۔جو شخص یہ چاہتا ہو کہ خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے اور اس کو اپنی ابدی نعمتوں میں حصہ دار بنائے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآن کو پڑھے اور اس کو اپنی زندگی کا رہنما بنالے۔

جو شخص ایسا نہیں کرے گا اس کا انجام شدید تر شکل میں وہی ہوگا جو روس میں امریکا نوازوں کا ہوتا ہے یا امریکا میں روس نوازوں کا۔

ایک موت

23فروری 1983 کی صبح الرسالہ کے لیے بڑی دردناک خبر لے کر آئی۔ اس دن الرسالہ کے کاتب حافظ امجد علی شاہجہانپوری کا انتقال ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ حافظ امجد علی صاحب نے الرسالہ کی کتابت کا کام اتنی دلچسپی اور لگن کے ساتھ کیا کہ "الرسالہ" اور "امجد علی صاحب" دونوں ایک دوسرے کے ہم معنی بن گئے۔ وہ دہلی کے اعلیٰ درجہ کے کاتب تھے۔ الرسالہ کے صفحات نے ان کی خوش نویسی کے جو نمونے محفوظ کیے ہیں وہ ابھی نامعلوم مدت تک باقی رہیں گے۔ مگر لکھنے والے کا فن لکھنے والے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ الرسالہ کی ہر اشاعت سب سے پہلے امجد علی صاحب کی نظر سے گذرتی تھی تو یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ کیونکہ وہ الرسالہ کو صرف "لکھتے" نہیں تھے بلکہ وہ اس کو "پڑھتے" بھی تھے۔ الرسالہ کے مضامین جب انہیں کتابت کے لیے دیے جاتے تو پہلے وہ ان کا مطالعہ کرتے۔ اس کے بعد ان کو لکھنا شروع کرتے۔ وہ الرسالہ کے صرف کاتب نہیں تھے، بلکہ وہ اس کے سب سے پہلے قاری بھی تھے۔

موت کی خبر ملنے کے بعد 23 فروری کی دوپہر کو جب میں ان کے گھر پہنچا تو ان کا مردہ جسم ایک چارپائی پر لٹایا ہوا تھا۔ میں دیر تک تاثرات کے طوفان میں انہیں دیکھتا رہا۔ وہی معصوم چہرہ تھا، مگر اب وہ خاموش ہو چکا تھا۔ بظاہر وہی آنکھیں تھیں۔ مگر اب وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ ہاتھ وہی تھا مگر اب وہ قلم پکڑنے کی طاقت سے محروم تھا۔

23فروری کو نماز ظہر کے بعد جنازہ اٹھا۔ لوگ حافظ امجد علی کا جسم کاندھوں پر اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے تھے اور میرے ذہن میں ایک پوری تصویر جاگ رہی

تھی۔جس میں انسان اپنے آغاز سے انجام کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔انسان کی کہانی کیسے عجیب طور پر اس دنیا میں شروع ہوتی ہے۔اور کیسے عجیب طور پر ختم ہوجاتی ہے۔

23فروری سے پہلے امجد علی صاحب سے میرا ہر روز ساتھ تھا۔23فروری کو وہ اچانک دوسری دنیا میں چلے گئے۔جب مجھے اس کا خیال آتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہماری آج کی دنیا اور ہماری کل کی دنیا میں کتنا کم فاصلہ ہے۔ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا ایک قدم اگر اِس دنیا میں ہے تو اس کا دوسرا قدم اُس دنیا میں۔

زندگی کا انجام

ماستی وینکاٹیسا آئنگر (1891-1986) کنڑ ازبان کے مشہور مصنف ہیں۔تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ میسورسول سروس میں شامل ہوئے۔اپنی اعلیٰ خدمات کی بنا پر انہیں ریاست میسور کا وزیر ہونا چاہیے تھا۔مگر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔چنانچہ وہ بددل ہوکر وقت سے پہلے ریٹائر ہوگئے۔

ملازمت سے الگ ہوکر انھوں نے کہانیاں اور ناول لکھنا شروع کیا۔اس میدان میں انھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔آج وہ تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتاب چکاویراراجندر (Chikka Veera Rajendra) پر حکومت ہند نے ان کو گیان پیٹھ کا خطاب اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور انعام دیا ہے۔

مسٹر وی سری دھر موصوف سے ملے اور ان سے ایک انٹرویو(ٹائمس آف انڈیا 12اگست 1984)لیا۔مسٹر ماستی اگرچہ اپنی تمام کتابوں کو ادبی شاہکار سمجھتے ہیں۔مگر حکومت کے اعلیٰ انعام پر وہ خوش نہ ہوسکے۔انھوں نے کہا:

I am too old to be happy

یعنی 94 سال کی عمر کو پہنچ کر میں اتنا زیادہ بوڑھا ہو چکا ہوں کہ کوئی خوشی میرے لیے خوشی نہیں۔ مسٹر ماستی کی پہلی کہانی 1912 میں شائع ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے انہیں اپنے ادبی کمالات کے اعتراف کے لیے 70 سال انتظار کرنا پڑا۔ مگر لمبی مدت کے بعد جب انہیں عزت اور انعام ملا تو وہ وقت تھا جب کہ بڑھاپے نے ان کے چہرے پر جھریوں کی مالا پہنا دی تھی۔

مسٹر ماستی کی کہانی موجودہ دنیا میں ہر شخص کی کہانی ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کا یہ قصہ ہے کہ وہ محنت کرتا ہے۔ اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے۔ بالآخر "ستر سال" کی محنت کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت اور انعام ملے۔ مگر اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کسی بھی صبح یا شام موت آجاتی ہے اور اس کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی عمر بھر کی کمائی کو چھوڑ کر ایسی دنیا کی طرف چلا جائے جس کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

کہاں سے کہاں

31 اکتوبر 1984 کو صبح سوا نو بجے کا وقت تھا۔ نئی دہلی میں وزیر اعظم ہند کی سرکاری رہائش گاہ میں حسب معمول پولیس اور اسٹاف کی سرگرمیاں اپنے شباب پر تھیں۔ پیشگی اپائنٹمنٹ کے مطابق وسیع اور شاندار لان میں پیڑ اسٹینوف (1921-2004) اپنی پارٹی کے ساتھ آچکے تھے۔ وہ وزیر اعظم اندرا گاندھی (1917-1984) پر ایک فلم تیار کر رہے تھے۔ وزیر اعظم اپنے وقت پر اپنے کمرہ سے برآمد ہوئیں۔ وہ لان میں داخل ہونے ہی والی تھیں کہ گولیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ مسز اندرا گاندھی کی حفاظتی پولیس کے دو مسلح جوانوں نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ ایک پستول سے فائر کیے، دوسرے نے اپنے

اسٹن گن کی 20 گولیاں ان کے اوپر خالی کردیں۔خون میں لت پت اندرا گاندھی کوئی آخری کلمہ نہ بول سکیں۔وہ "بے ہوش" حالت میں اسپتال لے جائی گئیں۔صرف اس لیے کہ ڈاکٹر ان کی طبی موت کا آخری اعلان کرسکیں۔اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹیں شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ عبرت انگیز مسٹر پیٹر اسٹینوف کا واقعہ تھا:

Peter Ustinov, world renowned actor, director, and writer, was sitting in the lawn at Mrs Indira Gandhi's residence, waiting, to interview her ("I wanted to ask her how as a single child she came to terms with her loneliness") when he heard the 'sound of death'.

مسٹر اسٹینوف جو عالمی شہرت رکھنے والے ایکٹر، ڈائرکٹر اور رائٹر ہیں، وہ مسز اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔وہ ان سے انٹرویو کے منتظر تھے۔انھوں نے کہا کہ میں ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ واحد اولاد ہونے کے اعتبار سے انھوں نے کس طرح اپنے اکیلے پن کے ساتھ نباہ کیا۔عین اسی وقت اسٹینوف نے موت کی آواز سنی (ہندستان ٹائمس، 1 نومبر 1984)۔

راقم الحروف نے جب یہ رپورٹ پڑھی تو معاً مجھ کو یہ خیال آیا کہ اگر الفاظ کے اندر تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے تو غالباً یہ اہم ترین سوال تھا جو اس نازک لمحہ میں مسز اندرا گاندھی سے پوچھا جاسکتا تھا۔الفاظ میں معمولی تبدیلی کے بعد وہ سوال یہ تھا:اب تک آپ 700 ملین انسانوں کے ملک کی محبوب وزیر اعظم تھیں۔اگلے لمحہ آپ کا کیا حال ہوگا جب کہ آپ اپنے کو ایک ایسی دنیا میں پائیں گی جہاں آپ بالکل تنہا اور بے یار و مددگار ہوں گی۔

کیسا عجیب ہے وہ پانا جس کا انجام کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں

تمام سفروں میں ٹرین کا سفر سب سے زیادہ تجربات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ انسانی قافلوں کو لیے ہوئے تیز رفتار ایکسپریس دوڑی چلی جارہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف قدرت کے مناظر مسلسل ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طرح ٹرین گویا زندگی کے بڑے سفر کی علامت بن گئی ہے جو نشانیوں سے بھری ہوئی ایک دنیا میں انسان طے کر رہا ہے۔ مگر جس طرح ٹرین کے مسافر اطراف کے مناظر سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرے۔

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے غروب ہو جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان اِن کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کی رعنائیاں سب ایک "عظیم اجتماع" کے شرکاء معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔ ایک سفر میں ہم ایک درمیانی اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لیے اترے۔ اسٹیشن کے آدمیوں سے پوچھا کہ "پچھّم کس طرف ہے"۔ مگر کسی کے پاس اس

سادہ سے سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا ”سورج ایک روشن ترین حقیقت کی حیثیت سے روزانہ ان کے اوپر نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔مگر لوگ اپنے آپ میں اتنا گم ہیں کہ ان کو مشرق ومغرب کا پتہ نہیں۔ پھر وہ لطیف پیغام جو سورج اور اس کے کائناتی ساتھی اپنی خاموش زبان میں نشر کررہے ہیں ان سے کیسے کوئی باخبر ہوسکتا ہے“۔

ہماری ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آکر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ہرے بھرے درخت، ان کے پیچھے سرخی ملی ہوئی روشنی اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے بادل، عجیب آفاقی حسن کا منظر پیدا کررہے تھے۔ ”ان میں یہ حسن ان کی بلندی نے پیدا کیا ہے“ میں نے سوچا۔” مگر انسان اس بلندی تک جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس سطح پر نہیں جیتا جس سطح پر درخت جی رہے ہیں۔ وہ وہاں بسیرا نہیں لیتا جہاں روشنی اور بادل بسیرا لیے ہوئے ہیں۔اس کے برعکس، وہ سطحی مفادات میں جیتا ہے۔ وہ جھوٹی دوستی اور جھوٹی دشمنی میں سانس لیتا ہے۔کائنات کا ہم سفر بننے کے بجائے اپنے آپ کو وہ اپنی ذات کے خول میں بند کرلیتا ہے۔ایک ایسی دنیا جہاں جنتی فضائیں اس کا انتظار کررہی ہیں۔ وہاں وہ اپنے آپ کو دوزخ کے ماحول میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دنیا کے بگاڑ کی ساری وجہ یہی ہے۔ اگر وہ بلند سطح پر جینے لگے تو اس کی زندگی میں بھی وہی حسن آجائے جو قدرت کے حسین مناظر میں دکھائی دیتا ہے (16 مارچ 1979)۔

زیادہ نازک

ایک مسلم نوجوان نے جدید تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اس کو باہر کے ایک ملک میں کام ملا وہ اور اس کے لیے روانہ ہو گیا۔اس کے ماں باپ اس کو رخصت کرنے کے لیے ہوائی اڈہ پر آئے۔ نوجوان کے مشرقی باپ نے آخری وقت میں

نصیحت کرتے ہوئے کہا: دیکھو بیٹے، جب ہوائی جہاز کے اندر بیٹھنا تو اپنے چاروں طرف آیتہ الکرسی کا گھیرا بنالینا۔ اوردرود شریف پڑھتے رہنا۔

یہ سن کر ایک شخص نے کہا: آپ بیٹے کو اس قسم کی نصیحت کیوں کررہے ہیں۔ بزرگ بولے: اس لیے یہ ہوائی سواری ہے۔راستہ میں ذراسی بھی کوئی بات پیش آئے تو کیا سے کیا ہوجائے۔

" آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص اس سے زیادہ خطرناک ہوائی سواری پر بیٹھا ہوا ہے"۔آدمی نے دوبارہ کہا" یہ زمین جس پر ہم آپ ہیں یہ ہوائی جہاز سے بھی زیادہ نازک سواری ہے۔ہماری زمین کسی ٹھوس چیز پر رکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ اتھاہ خلا میں معلق ہے۔وہ ہوائی جہاز سے کہیں زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دہراحرکت کررہی ہے۔ایک طرف وہ اپنے محور پر 20 میل فی سکنڈ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔دوسری طرف وہ اپنے مدار پر 15 سکنڈ فی میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ہوائی جہازتو درمیانی مقامات پر اترتے ہیں۔مگر زمین کا تیز رفتار سفر بغیر رکے ہوئے مسلسل جاری ہے"۔

اس قسم کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد مذکورہ شخص نے کہا۔" اگر آپ کو اپنے اس زمینی سفر کا واقعی احساس ہوتو آپ ہر وقت آیتہ الکرسی اوردرودشریف پڑھتے رہیں۔آپ کے اوپر لرزہ طاری ہوجائے۔ہوائی سفر سے کہیں زیادہ آپ کو اپنے زمینی سفر کا فکر لاحق رہنے لگے"۔

لوگ انسانی واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، وہ خدائی واقعات سے متاثر ہونا نہیں جانتے۔کوئی شخص کرتب کے زور سے اپنے آپ کو اس طرح دکھائے کہ اس کا پاؤں چھت پر ہو اوراس کا سر نیچے کی طرف لٹکا ہوا ہوتو بے شمار لوگ اس عجیب واقعہ کو دیکھنے کے لیے جمع ہوجائیں گے۔مگر لوگوں کی یاد نہیں کہ وہ خود اسی قسم کے عجیب تر واقعہ کی مثال ہیں۔کیونکہ ہم میں سے ہر شخص کا یہ حال ہے کہ وہ زمین کی سطح پر لٹکا ہوا ہے۔زمین گول

ہے۔زمین پر فی الواقع یہ صورت پائی جاتی ہے کہ آدمی اس کے اوپر مذکورہ کرتب باز آدمی کی طرف لٹکے ہوئے ہیں۔ ہندستان والوں کے لیے امریکا کے لوگ اس طرح ہیں کہ زمین کی سطح پر ان کا پاؤں ہے اور ان کا سر زمین کے نیچے لٹک رہا ہے اسی طرح امریکاوالوں کے لیے ہندستان کے لوگ سر نیچے اور پاؤں اوپر کیے ہوئے زمین پر چل پھر رہے ہیں۔

خدا سے ڈرو

آج کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ایک آدمی دوسرے آدمی کو ستا نہ رہا ہو۔ جہاں ایک آدمی دوسرے آدمی کو اپنے ظلم کا نشانہ نہ بنائے ہوئے ہو۔مگر لوگ کس آدمی کو ستاتے ہیں۔اس آدمی کو جوان کی نظر میں کمزور ہو۔جو داداگیری کرنا نہ جانتا ہو،جس نے اپنے آگے پیچھے ساتھیوں کی فوج نہ جمع کر رکھی ہو،جو پولیس اور کچہری سے دور رہنا چاہتا ہو،لوگ بے زوروں کے لیے بہادر ہیں اور جو شخص لوگوں کو زورآور دکھائی دیتا ہو اس کے لیے کوئی بہادر نہیں۔

مگر یہ اندھے پن کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔اگر ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہوتو وہ سب سے زیادہ اس سے ڈریں جس کو وہ بے زور سمجھتے ہیں۔کیونکہ جو شخص بے زور ہے اس کے پیچھے خدا کھڑا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آزمائش کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔خدا کو جانچ کر ہر شخص کے بارے میں جاننا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اور وہ کون ہے جو اللہ سے بے خوف ہے۔اس کی جانچ کیسے ہو۔اس کی جانچ ان شخاص کی سطح پر نہیں ہوسکتی جو اپنی زورآوری کی وجہ سے لوگوں کو مرعوب کیے رہتے ہیں،جن کی طاقت

دیکھ کر لوگوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف اگر لوگ برائی نہ کریں تو یہ ان کی اپنی طاقت سے ڈرنے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ خدا کے ڈر کی وجہ سے۔

مگر ایک شخص ہے جس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرتی ہے۔ اس کو ستانے سے اگر کوئی شخص بچتا ہے تو اس کی وجہ یقیناً اخلاقی ہوگی نہ کہ مادی۔ خدا کچھ افراد کو بے زور اور بے حیثیت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھتا ہے اور پھر ان کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرا وہ گویا خدا سے ڈرا، اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے نہیں ڈرا وہ گویا خدا سے نہیں ڈرا، ایسا شخص جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ڈال دیا جائے گا۔

ہر آدمی بری زندگی گزار کر مرجاتا ہے تاکہ موت کے بعد اور زیادہ بری زندگی کی طرف دھکیل دیا جائے۔

کائنات بیان دے گی

مجھے ایک بار لکھنؤ کے ایک علاقہ میں جانا ہوا جہاں آم کے باغات تھے۔ میں نے دیکھا کہ درختوں پر پھل لگے ہوئے ہیں مگر سب کے سب کالے ہورہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دھوئیں کی وجہ سے کالے ہوگئے ہیں۔ ان باغات کے پاس اینٹ کے بھٹے تھے جن کی چمنیوں سے ہر وقت کوئلہ کا دھواں نکلتا رہتا تھا۔ اس دھوئیں کی وجہ سے تمام پھل کالے ہوکر خراب ہوگئے۔ ان کی بڑھوتری رک گئی۔ وہ منڈی میں بھیجنے کا قابل نہ رہے۔

یہی اس دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ دنیا کے بنانے والے نے اس کو نہایت حکمت

کے ساتھ بنایا ہے۔اس کی ہر چیز بے حد نازک اور لطیف ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتی جو اس کے مزاج کے خلاف ہو، جو اس کی تخلیقی اسکیم کے مطابق نہ ہو۔مگر کائنات کے سب سے زیادہ سرسبز اور قیمتی حصہ پر انسان ہر وقت ظلم فساد جاری کیے ہوئے ہے۔حق کے نام پر حق کو قتل کیا جارہا ہے اور کائنات اپنی تمام معنویت کے باوجود خاموش کھڑی ہوئی ہے۔وہ زمین پر سب کچھ ہوتے دیکھتی ہے مگر اس کے بارے میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتی۔اس کی وجہ یہ ہے اس کے خدا نے ایک مقرر مدت تک کے لیے اس کو روک رکھا ہے۔جب یہ مدت ختم ہوگی تو اچانک وہ بول پڑے گی۔اس وقت وہ سب کچھ کہہ ڈالے گی جس کو آج وہ دیکھتی ہے مگر نہیں کہتی۔

آدمی اپنے اقتدار کی سیاست چلاتا ہے اور اس کو خدا کی سیاست کا نام دیتا ہے۔وہ مکمل اصلاح کے نفاذ کا نعرہ لگاتا ہے اور جب آزمایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جزئی اصلاح پر بھی قائم نہیں۔وہ اپنے پڑوسی کو ستاتا ہے اور دور کے ظالم کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے۔وہ اپنی انا کی پرستش میں لگا ہوتا ہے اور دوسرے کی انانیت اور تعصب کا اعلان کرنے کے لیے اسٹیج سجاتا ہے۔وہ مفاد پرستی اور استحصال میں غرق ہوتا ہے اور انصاف اور انسانیت کے عنوان پر تقریریں کرتا ہے۔وہ ضد اور نفرت اور انتقام کے تحت کارروائی کرتا ہے اور زبان سے یہ ظاہر کرتا ہے وہ صرف حق کے لیے ایسا کر رہا ہے۔وہ اپنے بدترین شیطانی کاموں کو بیان کرنے کے لیے بھی نہایت خوب صورت الفاظ پالیتا ہے۔یہ سب کچھ انسانی دنیا میں ہورہا ہے اور کائنات اپنی تمام نفاست اور لطافت کے باجود چپ رہتی ہے۔وہ سچ کو سچ نہیں کہتی اور جھوٹ ہونے کا اعلان نہیں کرتی۔

کیا کائنات کے اندر تضاد ہے، کیا یہ ایک گونگی کائنات ہے۔جس کائنات کے پاس

سریلے نغمے بکھیرنے والی چڑیاں ہوں، کیا اس کے پاس حق کا اعلان کرنے کے لیے زبان نہیں۔ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ قرآن بتا تا ہے کہ کائنات کی یہ خاموشی اس لیے ہے کہ خدا نے اس کو قیامت کے آنے تک خاموش رہنے کا حکم دے رکھا ہے، جیسے ہی صور پھونکا جائے گا۔ تمام زبانوں کی مہریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس وقت ساری کائنات ایک عظیم الشان ٹیپ ریکارڈر بن جائے گی اور پھر خدا کے گواہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتائے گی جو حق اور عدل کے مطابق اسے بتانا چاہیے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جس کائنات کے پاس رات کو دن بنا دینے والا سورج تھا اس کے پاس یہ بھی انتظام تھا کہ تاریکی میں چھپے ہوئے اعمال کو اجالے میں لا سکے۔

کیسی عجیب محرومی

آپ کسی شخص کو ایک ڈالر دیں اور اس سے کہیں کہ آگے اسی قسم کے ایک کرور سکے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تم تیزی سے جاؤ تو اس پورے ذخیرہ کو حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا آدمی ڈالر دیکھ کر کیا کرے گا۔ وہ ایک کو بھول کر ایک کرور کی طرف دوڑ پڑے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ موجودہ دنیا آخرت کا تعارف ہے۔ یہاں آدمی ان نعمتوں اور لذتوں کی ابتدائی پہچان حاصل کرتا ہے جس کو خدا نے کامل طور پر آخرت میں مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اس لیے ہے تا کہ آدمی جزء سے کل کو سمجھے۔ وہ قطرہ کو دیکھ کر سمندر کا اندازہ کرے۔

اگر آدمی کو دنیا کی صحیح معرفت حاصل ہو تو اس کے لیے دنیا مذکورہ ایک ڈالر کی مانند ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی لذت کو چھوڑ کر بڑی لذت کی طرف بھاگے گا۔ وہ دنیا کو بھول کر آخرت

کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص دنیا کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھے وہ موجودہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ وہ آخرت کو بھول کر اسی دنیا کی چیزوں میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔

سورج اس لیے ہے کہ وہ آخرت کی روشنیوں سے بھری زندگی سے انسان کو متعارف کرے۔ مگر انسان سورج کو دیکھ کر یہ کرتا ہے کہ وہ خود سورج ہی کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ پھولوں اور درختوں کا حسن اس لیے ہے کہ وہ آدمی کو آخرت کے حسن کی یاد دلائے۔ مگر انسان پھولوں اور درختوں کو آخری چیز سمجھ کر انہیں کے درمیان اپنی مستقل جنت بنانے لگتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس لیے ہیں کہ انسان کو ہمہ تن آخرت کا مشتاق بنا دیں مگر انسان انہیں لذتوں میں ایسا کھوتا ہے کہ اس کو آخرت کی یاد بھی نہیں آتی۔

جو شخص موجودہ دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے اس نے اپنی آخرت کو کھو دیا۔ ایسا شخص آخرت میں پہنچے گا تو وہاں کی ابدی نعمتوں کو دیکھ کر اس کا یہ حال ہوگا گویا اس کا سینہ حسرت و یاس کا قبرستان بن چکا ہے۔ وہ کہے گا کہ میں بھی کیسا نادان تھا۔ میں نے جھوٹے عیش کی خاطر حقیقی عیش کو کھو دیا۔ میں نے جھوٹی لذت کے پیچھے حقیقی لذت گنوا دی۔ میں نے جھوٹی آزادی سے فریب کھا کر اپنے آپ کو حقیقی آزادی سے محروم کرلیا۔

سب چلے گئے

فیبین سو شلزم (Fabian Socialism) ایک سو سال پہلے انگلینڈ میں وجود میں آئی۔ برنارڈ شا (1856-1950) اور دوسرے بہت سے دانشور اس سے وابستہ تھے۔ فیبین کا لفظ ایک رومی جنرل (Fabius Maximus) کے نام سے لیا گیا تھا۔ یہ لوگ غریبی اور جہالت کے خاتمہ پر زور دیتے تھے اور جبر کے بغیر سوشلزم لانے

کے علمبردار تھے۔ یہ گروہ فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کے نام سے مشہور ہوا۔

اس نظریے کو ماننے والوں میں ایک خاتون بیٹرس ویب (Beatrice Webb) بھی تھیں۔ وہ اپنی ڈائری لکھتی رہتی تھیں جو ان کے بعد شائع ہو کر کافی مقبول ہوئی۔ اس ڈائری کے آخری اندراجات میں سے ایک وہ ہے جو انھوں نے 1943 کی کسی تاریخ کو لکھا تھا۔ اس میں مذکورہ خاتون نے تحریر کیا تھا:

Everything and everyone is disappearing churchill Roosevelt,Stalin. What an amazing happening, and well worth recording in my diary. But that also will suddenly disappear (1943).

ہر چیز اور ہر شخص غائب ہوتے جارہے ہیں۔ چرچل، روزولٹ، اسٹالن، سب چلے گئے۔ کیسے عجیب ہیں یہ واقعات، اور کس قدر زیادہ میری ڈائری میں لکھے جانے کے قابل، مگر وہ بھی اچانک ایک روز غائب ہوجائے گی (ہندستان ٹائمس، 25 دسمبر 1984)۔

کیسے کیسے انسان اس دنیا میں آتے ہیں۔ وہ کیسے کیسے کمالات دکھاتے ہیں۔ اور پھر اچانک ایک روز اس دنیا سے چلے جاتے ہیں، جیسے کہ ان کا یہاں آنا اور یہاں سے جانا ان کی اپنی مرضی سے نہ ہو۔ بلکہ کوئی اور ہو جوان کو یہاں لاتا ہو اور پھر اپنے یک طرفہ فیصلہ کے تحت انہیں یہاں سے اٹھا لے جاتا ہو۔

اس واقعہ کی کوئی بھی بامعنی توجیہ اس کے سوا نہیں ہے کہ پیغمبروں کی اطلاع کے مطابق آخرت کو مانا جائے۔ آخرت کو شامل کرنے کے بعد موجودہ دنیا کی ہر چیز بامعنی ہو جاتی ہے اور آخرت کو شامل کیے بغیر موجودہ دنیا کی ہر چیز بے معنی۔

21واں منٹ

موجودہ دنیا میں انسان بظاہر آزاد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اس صورت حال نے انسان کو غفلت میں ڈال دیا ہے۔ ہر آدمی بے خوف بنا ہوا ہے۔ ہر آدمی وہ سب کرڈالنا چاہتا ہے جس کو کرنے کے لیے اس کا دل کہے۔

مگر یہ صورت حال سراسر وقتی ہے۔ آدمی کے پاس صرف ایک محدود مدت ہے۔ اس خاص مدت کے اندر ہی وہ سرکشی کر سکتا ہے۔ اس مدت کے ختم ہوتے ہی اس کا مالک اسے پکڑلے گا۔ اس کے بعد وہ مجبور ہوگا کہ اپنی سرکشی کا انجام ابدی طور پر بھگتتا رہے۔

ہوائی جہاز کو اڑانے کے لیے دو پائلٹ ہوتے ہیں۔ 21 جولائی 1983 کو یہ واقعہ ہوا کہ ایک ہوائی جہاز اٹلانٹک سمندر کے اوپر اڑ رہا تھا۔ عین پرواز کی حالت میں اس کے دونوں پائلٹ (ہوا باز) سو گئے اور مسلسل 20 منٹ تک سوتے رہے۔ وہ صرف اس وقت بیدار ہوئے جب کہ پائلٹ کیبن میں ایک خاص طرح کا الارم بجنا شروع ہوگیا (ہندوستان ٹائمس، 22 جولائی 1983)۔

یہ ہوائی جہاز کسی اتفاقی سبب سے اپنے روانگی کے مقام پر 12 گھنٹے لیٹ ہوگیا تھا۔ اس غیر معمولی حادثہ کی وجہ سے پائلٹ بے حد تھکے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے ہوائی جہاز کو اڑایا تو اس کے انجن کو انھوں نے ایک خاص رفتار پر سٹ کر دیا۔ اب ہوائی جہاز ایک بندھی ہوئی رفتار پر اڑنے لگا۔ اس دوران میں تھکے ہوئے ہوابازوں کی آنکھ بند ہوگئی۔ اور وہ مسلسل 20 منٹ تک سوتے رہے۔ یہاں تک کہ کنٹرول کا نظام بگڑ گیا اور ہوائی جہاز کی رفتار غیر معمولی تیز ہوگئی۔ اس کے بعد مشینی نظام کے تحت جہاز کا مخصوص الارم بجنے لگا۔ الارم کی وجہ سے پائلٹ جاگ اٹھے اور فوراً انجن کو سنبھال لیا۔

فارن بورو (انگلینڈ) کے ہوائی جرنل (Feed back) میں ایک ہوا باز نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں یہ سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں کہ کیا کچھ ہو سکتا تھا:

I Shudder to think what could have happened.

موجودہ زندگی کو اگر "20" منٹ کا لمحہ فرض کریں اور اس کے بعد 21 ویں منٹ کو آخرت میں داخلہ کے ہم معنی قرار دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت نے انسان کو صرف 20 منٹ تک غلطی کرنے کی اجازت دی ہے، اگر وہ آخر وقت تک ہوشیار نہ ہو تو قدرت اس کو 21 ویں منٹ میں غلطی کرنے کی اجازت نہ دے گی۔ 20 منٹ کے بعد اس کے لیے یا تو اپنی اصلاح کر لینا ہے یا موت کی گرفتاری۔

آرزوؤں کی دنیا

جنت کا انکار اپنے آپ کا انکار ہے۔ جو شخص جنت کو نہیں مانتا وہ خود اپنی نفی کر رہا ہے۔ جو شخص جنت کو مانتا ہے مگر اس کے لیے عمل نہیں کرتا وہ ایسا خریدار ہے جو ایک چیز خریدنا چاہتا ہے۔ مگر اس کی قیمت دینے کے لیے تیار نہیں۔

ہر انسان سب سے زیادہ کیا چاہتا ہے۔ ہر انسان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے خوابوں کی دنیا کو پا سکے۔ وہ ابدی طور پر جیتا رہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں کی تکمیل کر سکے وہ ایسی زندگی کا مالک بنے جو ہر قسم کی محدودیت (Limitations) اور ناخوشگواری (Disadvantage) سے خالی ہو۔

یہ آدمی کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ ہر آدمی اپنی اس تمنا کی تکمیل کے لیے دوڑ رہا ہے۔ مگر کوئی بھی آدمی اپنی اس تمنا کو پورا نہیں کر پاتا۔ آدمی اپنی صحت بناتا ہے مگر بہت جلد اس کی صحت کسی حادثہ یا بڑھاپے کا شکار ہو جاتی ہے۔ آدمی دولت جمع کرتا ہے مگر

دولت اس کے قلب و دماغ کو سکون نہیں دیتی۔ وہ اقتدار پر قبضہ کرتا ہے مگر اقتدار صرف اس کے مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ وہ عیش وعشرت کے سامان اکٹھا کرتا ہے مگر جلد ہی وہ اکتاہٹ (Boredom) کا شکار ہوجاتا ہے۔

ہر آدمی اپنے لیے ایک جنت کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ مگر وہ اپنی جنت بنا نہیں پاتا کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو لیے ہوئے دنیا سے چلا جاتا ہے۔

آدمی موت کے بعد کہاں جاتا ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے جہاں اس کے خوابوں کی جنت بنی ہوئی ہے۔ مگر یہ جنت اس شخص کو ملتی ہے جس نے موت سے پہلے والی زندگی میں اس کی قیمت ادا کی ہو۔ جو شخص موجودہ دنیا میں جنت کی قیمت ادا نہیں کرتا وہ گویا اسی چیز کی محرومی کا خطرہ مول لے رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔

جنت ہماری آرزوؤں کا محل ہے۔ مگر جنت صرف اس شخص کے حصہ میں آتی ہے جس نے اس کو آخرت میں تعمیر کیا ہو۔ جو شخص اپنی جنت موجودہ دنیا میں تعمیر کرے اس کے لیے ابدی محرومی کے سوا کچھ اور نہیں۔

کیسی عجیب ہے وہ محرومی جب کہ آدمی عین اِسی چیز سے ابدی طور پر محروم ہو جائے۔ جس کے لیے وہ ساری عمر سب سے زیادہ آرزومند بنا ہوا تھا۔

ہر چیز میں سبق

خواجہ حسن نظامی (1878-1955) کا ایک مضمون ہے "مچھر کی کہانی" خواجہ صاحب نے مچھر سے شکایت کی کہ تم اتنا کیوں پریشان کررہے ہو۔ ہم کو سونے کیوں نہیں دیتے۔ مچھر نے جواب دیا "سونے اور ہمیشہ سونے کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔ جب آئے گا تو بے فکر ہوکر سونا۔ ابھی تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا وقت ہے"— اگر نصیحت لینے کا

ذہن ہوتو مچھر کی بھنبھناہٹ میں بھی آدمی کوزندگی کا پیغام مل جاتا ہے۔ اور اگر نصیحت لینے کا ذہن نہ ہوتو بم دھماکے اور ٹینکوں کی گڑ گڑاہٹ بھی جمود کوتوڑنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ایسے لوگوں کو قیامت کا طوفان ہی بیدار کرسکتا ہے۔ مگر افسوس کہ قیامت کے طوفان سے بیدار ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کاوقت ہوگا نہ کہ عمل کرنے کا۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ — جنتی وہ ہے جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے (26:89)۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ — اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ دے دیتا ہے: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 71)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی سب بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کا ذہن کھلا ہوا ہو۔ وہ حق کو اس کی اصل شکل میں دیکھ سکے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوکر رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے آدمی کے سامنے جب کوئی سچائی یا کوئی سبق کی بات آتی ہے تو اس کو سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگتی۔ وہ اس کو فوراً پالیتا ہے اور اپنی زندگی میں اس کو شامل کرلیتا ہے۔

دنیا میں ہر طرف اللہ کی نشانیاں بکھری ہوئی ہیں، کہیں جمادات خاموش زبان میں کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کہیں "مچھر" اپنی زبان میں کوئی پیغام دیتا ہے۔ کہیں انسانوں کے درمیان کوئی واقعہ ہوتا ہے اور اس میں ایک چھپا ہوا سبق موجود ہوتا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ کھلی ہوئی نصیحت کی زبان میں کسی امر حق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان تمام مواقع پر وہی شخص سچائی کو پائے گا جس نے اپنا سینہ سچائی کے لیے کھلا رکھا ہو۔ اگر آدمی کے اندر سبق لینے اور بات کو پکڑنے کا مزاج نہ ہوتو کوئی بھی چیز اسے فائدہ نہیں دے سکتی۔ کھلے ذہن کا آدمی "مچھر" سے سبق لے سکتا ہے۔ اور جس نے اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کرلی ہوں اس کے لیے خدا کی کتاب اور رسول کا کلام بھی ہدایت کو پانے کے لیے ناکافی ہے — سب سے بڑی چیز سبق لینے کا مزاج ہے۔ جس شخص

کے اندر یہ مزاج پیدا ہوجائے اس کے لیے خدا کی ساری دنیا ایک زندہ کتاب بن جائے گئی۔اور جواس مزاج سے محروم ہووہ ایک قسم کا جانور ہے جوسب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی نہیں جانتا کہ کیا دیکھا اور کیا سنا۔

خرچ سے اضافہ

مسٹر رام رتن کپلا (پیدائش1918) نے 1937 میں پندرہ روپیہ ماہوار کی ایک ملازمت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔اب دہلی میں نرائنا انڈسٹریل ایریا میں ان کی فیکٹری ہے اور آصف علی روڈ پر بہت بڑا شوروم ہے۔انھوں نے اپنے ابتدائی دور کا ایک واقعہ اس طرح بتایا۔

یہ 1945ء کی بات ہے جب کہ میں ایک میکینک کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔میں نے کافی محنت سے کام کیا اور دھیرے دھیرے 25ہزار روپئے بینک میں جمع کر لیے۔ میں بہت خوش تھا کہ میں نے کارنامہ انجام دیا ہے۔اس کے بعد ایسا ہوا کہ راولپنڈی کے ایک بزرگ "خواجہ صاحب" انہیں دنوں میرے پاس آئے۔ہمارے ان کے درمیان بہت پرانے مراسم تھے۔میں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔انھوں نے مجھ سے میرے کام کے بارے میں پوچھا۔میں نے فخر کے ساتھ انہیں بتایا کہ میں نے 25ہزار روپیہ بچا لیا ہے جو بنک میں جمع ہے۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھ کو شاباشی دیں گے۔ اِس کے برعکس، انھوں نے مجھ کو لعنت ملامت کی اور کہا کہ تم نے اپنا وقت خراب کیا۔تم کو شرم آنی چاہیے کہ تمہارے پاس 25 ہزار روپیہ بے کار پڑا ہوا ہے ،صرف اس لیے کہ بنک کا سود ملتا رہے۔اگر تم یہ بتاتے کہ میرے اوپر بنک کا قرض ہے تو البتہ مجھے خوشی ہوتی۔تم فوراً بمبئ جاؤ۔کلکتہ جاؤ۔وہاں جا کر کاروبار دیکھو،ایجنسی لو،روپیہ کو کام میں لاؤ۔

شری رام رتن کپلا نے بتایا کہ اس کے بعد میں 1945-1946 میں بمبئ گیا۔وہاں

ریفریجریٹر بنانے والی بڑی کمپنیوں کی ایجنسیاں لیں۔ اس کے بعد ہمارا کاروبار خوب بڑھا۔ کافی پیسہ ہاتھ آیا۔ اس کے بعد میں نے بارہ روپیہ ماہوار کا گیرج (garage) چھوڑ دیا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار کرایہ پر موجودہ شوروم لیا۔

خدا نے اپنی دنیا کا نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ یہاں خرچ کرنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ آپ چند دانے "خرچ" کرتے ہیں تو کھیت اس کے بدلے میں آپ کو ہزاروں دانے لوٹاتا ہے۔ کاروبار میں آدمی روپیہ لگاتا ہے تو وہ کئی گنا زیادہ ہو کر اس کی طرف واپس آتا ہے۔ معاشرہ میں صدقات وخیرات کی صورت میں جو خرچ کیا جاتا ہے وہ بھی اس طرح اضافہ ہو کر آدمی کی طرف لوٹتا ہے کہ اس سے سماج میں باہمی اعتماد، ایک دوسرے کا لحاظ، حقوق کی ادائیگی، دوسرے کے معاملے کو اپنا معاملہ سمجھنا جیسے احساسات پرورش پاتے ہیں اور وہ بے شمار صورتوں میں خود دینے والے کو نفع پہنچاتے ہیں۔

آخرت کے لیے خرچ کا معاملہ بھی یہی ہے۔ اگر آخرت کی راہ میں خرچ کریں تو وہ دس گنا سے سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی صورت میں آپ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ آخرت کی راہ میں خرچ سے جو اضافہ ہوتا ہے وہ سب سے بڑا اضافہ ہے، کیونکہ وہ نہ صرف مقدار میں زیادہ ہے بلکہ وہ دائمی بھی ہے۔ آخرت کے سوا کوئی دوسرا اضافہ دائمی نہیں۔

جب پردہ کھلے گا

خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ان سب کے ساتھ ایک ہی مشترک حادثہ پیش آیا۔ وقت کے اکابر نے ان کو نظر انداز کر دیا۔ جو لوگ ماحول کے اندر بڑائی کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے انھوں نے ان کو قابل التفات نہیں سمجھا۔

وقت کے یہ اکابر سب کے سب وہ لوگ تھے جو خدا کو مانتے تھے۔ وہ اس کو بھی

مانتے تھے کہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام دینے والا آتا ہے۔حتی کہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو آنے والے پیغمبر خدا کا پہلے سے انتظار کررہے تھے۔ وہ اس کی یاد میں پُر جوش تقریریں کرتے تھے مگر جب وہ آنے والا آیا تو انھوں نے اس کو نہیں پہچانا۔ انھوں نے حقارت کے ساتھ اس کو رد کر دیا۔

چونکہ وہ تقلید آباء کی سطح پر جی رہے تھے، وہ صرف ان پچھلے پیغمبروں کو پہچان سکے جن کا نام ان کے آبائی مذہب میں شامل تھا۔ جو ان کی قومی تقلید کا حصہ بن چکا تھا۔ جو انھیں تاریخی روایات کے تسلسل میں مل رہا تھا۔ وقت کا پیغمبر ابھی ان اضافی خصوصیات سے خالی تھا اس لیے وہ ان کو دکھائی بھی نہیں دیا۔ وقت کے نمائندہ خدا کو پہچاننے کے لیے جو ہر شناسی کی صلاحیت درکار تھی اور یہ لوگ اس سے محروم تھے، پھر وہ وقت کے پیغمبر کو کس طرح پہچانتے۔

یہ سب کرتے ہوئے وہ مذہب کا جھنڈا بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے پیغمبروں کا مومن ہونے پر فخر کرتے تھے۔ عوام کے درمیان وہ خدا کے دین کے سب سے بڑے حامی بنے ہوئے تھے۔ مگر خدا کے یہاں وہ بالکل بے قیمت قرار پائے۔ کیوں کہ ان کا مذہب آباء کی تقلید کی سطح پر پیدا ہوا تھا نہ کہ حقیقت کے اعتراف کی سطح پر۔

آخرت میں جب ان پر کھلے گا کہ انھوں نے جس کو نظر انداز کیا وہی وہ تھا جس کی زبان سے خدا نے اپنا کلام جاری کیا تھا۔ جو دنیا میں خدا کا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا گیا تھا تو یہی واقعہ ان کی ابدی روسیاہی کے لیے کافی ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ ہائے ہمارا اندھا پن، ہم نے اسی کو نہ دیکھا جس کو ہمیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہیے تھا۔ ہم نے اسی کو نہ پہچانا جس کو ہمیں سب سے زیادہ پہچاننا چاہیے تھا۔

جھوٹی عظمت

نپولین بونا پارٹ (1821-1769) ایک فوجی افسر تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھا کر وہ فرانس کی حکومت پر قابض ہو گیا۔ 1804 میں اس نے فرانس کے تاعمر شہنشاہ ہونے کا اعلان کردیا۔ نپولین نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں تک کہ انگلینڈ کو چھوڑ کر وہ پورے یورپ کا فاتح بن گیا۔ اس نے فرانس کی ایک دلکش خاتون جوزفین (Josephine) سے شادی کی۔مگر 1810 میں اس نے جوزفین سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کیونکہ وہ شہنشاہ یورپ کا جانشین پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اس کے بعد نپولین نے آسٹریا کے بادشاہ کی لڑکی میری لوئی (1791-1847) سے شادی کی۔ 1811 میں اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فرانسس جوزف چارلس رکھا۔ نپولین خوش تھا کہ اس نے اپنی بادشاہت کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اپنا ایک ولی عہد پالیا ہے۔مگر اس کے جلد ہی بعد یہ واقعہ ہوا کہ نپولین کی سیاسی حرص نے اس کو روس سے ٹکرا دیا۔ روس کی فوجیں اگرچہ نپولین کی فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ تاہم روس کا جغرافیہ اس کی مدد پر آ گیا۔ نپولین کی فوجیں روس کی شدید برفباری کی تاب نہ لاسکیں۔ نپولین اس حال میں روس سے واپس آیا کہ اس کی فوج کا بڑا حصہ راستہ میں برباد ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ 1812 میں ہوا۔ بعد کے حالات اس کے لیے اور بھی ناموافق ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ 1815 میں نپولین کو برطانوی فوجوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔اس کو گرفتار کر کے جزیرہ سینٹ ہیلینا بھیج دیا گیا۔ یہاں 1821 میں وہ قید کی حالت میں مر گیا۔

انسان اپنی اولاد تک کے لیے عظمت کا خواب دیکھتا ہے، حالانکہ وہ خود بہت جلد بے

عظمت ہو جانے والا ہے۔اس دنیا میں ہر روز کوئی نپولین بےعظمت ہو کر مر رہا ہے۔مگر کوئی نہیں جو اس سے سبق لے۔ کوئی نہیں جو اس کو اپنی زندگی کے لیے رہنما بنائے۔

موجودہ دنیا میں ہر انسان کو صرف محدود موقع دیا گیا ہے۔مگر ہر انسان اپنے لیے لامحدود منصوبہ بناتا ہے۔ ہر شخص کی عظمت آخر کار یہاں خاک میں مل جاتی ہے۔ ہر دیکھنے والا اس کو دیکھتا ہے مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ہر آدمی اس کہانی کو دوبارہ لکھنا چاہتا ہے جس کو اس کے پیش رو نے لکھنا چاہا تھا مگر وہ اس کو لکھنے میں ناکام رہا۔

خدااورانسان

آنے والا دن

موجودہ دنیا میں جب کوئی آدمی خدا کو مانتا ہے تو وہ دلیل کی بنیاد پر خدا کو مانتا ہے۔ آخرت میں جو لوگ خدا کو مانیں گے وہ خدا کے زور وقوت کی بنیاد پر خدا کو مانیں گے۔ گویا موجودہ دنیا میں دلیل خدا کی نمائندہ ہے۔ اس کے برعکس، آخرت میں یہ ہوگا کہ خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ اپنے آپ کو منوانے کے لیے انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں خدا کو ماننے والا کون ہے اور اس کو نہ ماننے والا کون۔ خدا کو ماننے والا وہ ہے جو معقولیت کے وزن کو مانے۔ جو حق کے آگے اس وقت جھک جائے جب کہ اس کے ساتھ لفظی دلیل کے سوا کوئی اور زور شامل نہ ہو۔ اس کے برعکس، جس کا یہ حال ہو کہ کوئی بات محض اپنی سچائی کی بنا پر اس کو متاثر نہ کر سکے، وہ کسی سچائی کو صرف اس وقت مانے جب کہ وہ کسی وجہ سے اس کو ماننے کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔ جس سچائی کے ساتھ ایسا کوئی دباؤ موجودہ نہ ہو وہ اس کو ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتا ہو، ایسا آدمی خدا کو ماننے والا نہیں ہے۔ اس کا معبود ظاہری طاقت ہے نہ کہ غیبی خدا۔

خدا اپنے ماننے کا ثبوت غیب کی سطح پر لے رہا ہے اور لوگ اس کو ماننے کا ثبوت شہود کی سطح پر دینا چاہتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے مگر آدمی صرف طاقت کے آگے جھکنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی محض خدا کے خوف کی بنا پر انصاف کے طریقہ کو اپنا لے۔ مگر انسان صرف اس وقت انصاف کرنے پر راضی ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لیے مجبور ہو گیا ہو۔ جہاں مجبوری نہ ہو وہاں وہ فوراً سرکشی کرنے لگتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو چھپا لے۔ مگر قیامت ہر آدمی کو برہنہ کردے گی۔ اس وقت بہت سے خدا پرست غیر خدا پرستوں کی صف میں نظر آئیں گے، بہت سے حق کو ماننے والے حق کو نہ ماننے کے مجرم قرار دیے جائیں گے۔ بہت سے لوگ جو جنت کا الاٹمنٹ لیے ہوئے ہیں وہ اپنے کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں گے۔ انسان کتنا زیادہ بے ڈر بنا ہوا ہے، حالانکہ کتنا زیادہ ڈر کا لمحہ اس کے لیے آنے والا ہے

عجیب یادگار

مسز اندرا گاندھی (1984-1917) پہلی بار 1966 میں ہندستان کی وزیر اعظم بنیں۔ اس وقت ان کی سرکاری رہائش گاہ کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ صفدر جنگ روڈ (نئی دہلی) کے دو مکانات کو ملا کر ایک بڑا مکان بنایا گیا۔ یہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ اس رہائش گاہ میں اور اس کے آس پاس بہت دور تک وزیر اعظم کی حفاظت کے لیے انتہائی غیر معمولی حفاظتی انتظامات کیے گئے تھے۔ مگر 31 اکتوبر 1984 کو مسز گاندھی کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ مسز گاندھی کے حفاظتی دستہ کے دو آدمیوں (بینت سنگھ اور ستونت سنگھ) نے انہیں اسی ہتھیار کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جو وزیر اعظم کی جان کی حفاظت کے لیے انہیں خصوصی طور پر مہیا کیے گئے تھے۔

صفدر جنگ روڈ کے اس مکان کو اب مسز اندرا گاندھی کی یادگار میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت کے منصوبہ کو بتاتے ہوئے اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، 10 نومبر 1984) میں یہ الفاظ درج تھے:

....that the house should be maintained as a place where people

could come and pay their tributes to the memory of the most powerful woman in the world who died a martyr.

حکومت کا خیال ہے کہ اس گھر کو ایک ایسے مقام کی حیثیت سے باقی رکھا جانا چاہیے جہاں لوگ آئیں اور اس خاتون کو خراج عقیدت پیش کریں جو دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور خاتون تھیں اور یہاں ایک شہید کی حیثیت سے مریں۔

مسز اندرا گاندھی کی زندگی کے دو رخ ہیں۔ ایک ان کا ہندستان کا وزیر اعظم ہونا۔ دوسرا ان کا بے یارومددگار انسان کی حیثیت سے مارا جانا۔ دونوں کو ملا کر دیکھیے تو مسز اندرا گاندھی کی زندگی انسان کے کمال عجز کی داستان سنا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایک وزیر اعظم بھی اتنا ہی کمزور ہے۔ جتنا ایک معمولی انسان۔ مگر جن لوگوں نے مسز گاندھی کے پہلے رخ کو ان کے دوسرے رخ سے الگ کر کے دیکھا ان کے لیے یہ واقعہ بالکل الٹے مفہوم کا حامل بن گیا۔

کیسی عجیب بات ہے۔ جو واقعہ انسانی عجز کا سبق دے رہا ہے، اس سے نادان لوگ انسانی کبریائی کا سبق لے رہے ہیں۔ جو واقعہ انسان کے لیے بے طاقت ہونے کا ثبوت ہے اس کو اس بات کی یادگار بنایا جا رہا ہے کہ انسان کس قدر طاقت ور ہے۔

یہ سونے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ جہنم جیسی چیز سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کو چاہنے والا سو گیا ہو: مَا رَأَيْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا، وَلاَ مِثْلَ الجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2601)۔

جہنم کا عذاب کتنا ہولناک ہے۔ مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ جنت کی نعمتیں کتنی لذیز ہیں مگر آدمی کو اس کا کوئی شوق نہیں یقیناً یہ زمین پر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔

لوگ سو رہے ہیں تاکہ اس وقت جاگیں جب کہ جہنمی آگ کے شعلے ان کے لیے سونے کو ناممکن بنا دیں۔ لوگ غافل ہیں تاکہ اس وقت ہوشیار ہوں جب کہ محرومی اور رسوائی ان کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کے لیے اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دو چار رہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ بااختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا ہے۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشوں میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لیے نااہل ثابت کر رہا ہے۔

آہ! وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق ہونا چاہیے۔

آہ! وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اس کو سب سے زیادہ خوف کرنا چاہیے۔

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گردوپیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لیے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے۔ نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پا کر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارے میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

انسان کی غلطی

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کرلیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہیے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہیے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدائے لم یزل پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لیے اس نے خدا کے وجود کا انکار کردیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کرلیے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنالیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کرلیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرلے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال وحرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں۔ کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی۔ فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ (1856-1939) نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا۔ ایڈلر (1870-1937) نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا۔ میک ڈوگل (1871-1938) نے غلط طور کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے۔ مارکس (1818-1883) نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لیے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے، مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پالیا ہے۔ اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے

زوراور مفلس آدمی۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لیے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے اور قریب سے اس کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔

دو قسم کی روحیں

قرآن کی سورہ الشّمس میں ارشاد ہوا ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (91:9-10)۔ یعنی، وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہو گیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا۔ موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرمسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُر عذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تا کہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لیے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لیے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجھک اس کا اعتراف کرلیتا ہے۔لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیر خواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔اس کو اس کا خدا جنت کی پُر بہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی لڑائی میں گم رہتا ہے۔اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لیے قبول نہیں کرے گا۔وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تا کہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

مقبول بندے

جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصہ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے جس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے جس کو آٹو گریفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا اور بالآخر کھال کا مذکورہ ٹکڑا الگ ہو کر گر جائے گا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (1885-1979) نے اپنی پیتھالوجی (pathology) کی کتاب (صفحہ 177) میں لکھا ہے کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی:

Self will not accept not-self.

یہ چھوٹے سِلف (انسان) کی خودداری کی ایک مثال ہے۔ اسی پر بڑے سِلف (خدا) کی غیرت اور خودداری کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند اور تمام یکتا پسندوں سے زیادہ یکتا پسند ہے۔ خدا کسی حال میں بھی کسی قسم کی دوئی کو گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ہر دوسرے قصور کو معاف کر دے گا مگر شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے مقبول بندے ٹھہریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سلف کے خول کو توڑ کر خدا کے سلف میں گم ہونے پر راضی ہو گئے۔ جو اپنی یا کسی دوسرے کی یکتائی کو بھلا کر خدا کی یکتائی کے آگے جھک گئے۔ جنھوں نے

ہر قسم کے شرک کو چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کرلیا۔ انسان کے لیے اگرچہ یہ مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا اقرار کرے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کو مانتا ہوا نظر آئے تو وہ یا تو خوف کی بنیاد پر ہوگا یا مصلحت کی بنیاد پر۔ تاہم یہی وہ عطیہ ہے جو کوئی انسان کبھی کسی کو نہیں دیتا اور اسی کا مطالبہ انسان کے خالق نے انسان سے کیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ مسلم وہی ہے جو اپنی خودی کا اثاثہ اپنے خالق کو دینے پر راضی ہو جائے۔ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی سپردگی میں دے دے۔ جو ہر اعتبار سے خدا کا تابع فرمان بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسان کے لیے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اسی کو خدا نے اپنی جنت کی قیمت بنا دیا ہے۔ جنت کی انوکھی نعمت اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گی جو اس انوکھے عطیہ کی صورت میں اس کی قیمت پیش کر دے۔

خوراک

والٹر ڈی لامیر (Walter De La'Mare) ایک انگریز شاعر ہے۔ وہ 1873 میں پیدا ہوا اور 1956 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے انسان کے بارے میں ایک طنزیہ نظم کہی ہے جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

It is a very odd thing
As odd as can be
That whatever Miss T eats
Turns into Miss T

یہ ایک نہایت عجیب بات ہے، اتنی عجیب جتنی کہ کوئی چیز عجیب ہو سکتی ہے۔ مس ٹی جو کچھ بھی کھاتی ہے وہ سب مس ٹی بن جاتا ہے۔

ہر آدمی کی اپنی ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا رنگ، اس کے بدن کی ساخت، اس کے بولنے کی زبان، اس کا طرزِ فکر، سب اس حد تک دوسروں سے مختلف ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے مقابلہ میں پہچانا جاسکے۔ آدمی روزانہ طرح طرح کی چیزیں کھاتا ہے۔ مگر وہ جو کچھ کھاتا ہے وہ اس کے اندر رجا کر اس کی اپنی شخصیت میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی کھانے کی چیز باہر خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ آدمی کے اندر داخل ہونے کے بعد وہی بن جاتی ہے جو وہ خود ہوتا ہے۔ ہر آدمی جو خوراک کھاتا ہے یا پانی وہ اپنے جسم میں داخل کرتا ہے اس کو وہ تحلیل کر کے اپنے وجود کا حصہ بنالیتا ہے۔

یہی معاملہ خیالات ونظریات کا بھی ہے۔ آدمی بہت کم ایسا کرتا ہے کہ جو کچھ وہ دیکھے یا سنے اس کو اس طرح دیکھے یا سنے جیسا کہ فی الواقع وہ ہے۔ اکثر وہ چیزوں کو اس شکل میں دیکھتا ہے جیسا کہ وہ خود دیکھنا چاہتا ہے۔ ہر بات جو آدمی کے اندر داخل ہوتی ہے وہ اس کے اپنے ذوق کے مطابق بدل کر اس کی فکر کا جزء بن جاتی ہے۔

اسی مثال میں مومن اور غیر مومن کا فرق دیکھا جاسکتا ہے۔ دنیا طرح طرح کے واقعات وحقائق سے بھری ہوئی ہے۔ یہ واقعات وحقائق مومن کے سامنے بھی آتے ہیں اور غیر مومن کے سامنے بھی مگر دونوں انہیں اپنے اپنے زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک کے لیے وہ اس کے ایمان کی غذا بن جاتے ہیں۔ مگر دوسرے کو ان سے اس کے سوا کچھ اور نہیں ملتا کہ اس کی سرکشی اور گمراہی میں اضافہ ہوجائے۔

کم سمجھنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ایک غیر امیر خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پیدائش کے جلد ہی بعد آپ کی

والدہ بھی اس دنیا سے چلی گئیں۔آپ کو حلیمہ سعدیہ نے دودھ پلایا۔حلیمہ کے شوہر کو ابو کبشہ کہا جاتا تھا۔ یہ ایک نہایت غریب خاندان تھا جو محنت مزدوری پر گزر کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ایک یتیم بچہ کی حیثیت سے پرورش پائی۔وہ قلیل معاوضہ پر مکہ والوں کی بکریاں چراتے تھے۔آپ کے ساتھ کوئی عظیم ماضی شامل نہ تھا۔ چنانچہ مکہ والوں کی نظر میں آپ کی تصویر ایک حقیر تصویر بن گئی۔آپ کا شمار مکہ کے بڑے لوگوں میں نہ تھا۔ بلکہ ان لوگوں میں تھا جو لوگوں کے نزدیک قابل تذکرہ نہیں ہوتے۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر جب آپ پر وحی آئی اور آپ نے مکہ میں اپنی پیغمبری کا اعلان کیا تو لوگوں کو یہ ایک مذاق کی بات معلوم ہوئی۔مکہ والوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ شخص جو کل تک ایک معمولی آدمی تھا وہ آج خدا کا رسول کیسے بن گیا۔انھوں نے حقارت کے ساتھ کہا کہ یہ ابو کبشہ کے لڑکے کو دیکھو، وہ کہتا ہے کہ اس کو آسمان سے وحی آتی ہے:هَذَا ابْنُ أَبِي كَبْشَةَ يُكَلَّمُ مِنَ السَّمَاءِ (نور الیقین، جلد 1، صفحہ 10)۔

یہی چیز ہر دور میں پیغمبروں کے ہم زمانہ لوگوں کے لیے پیغمبروں کے انکار کا سبب بن گئی۔خدا نے کبھی بادشاہوں یا وقت کی عظیم شخصیتوں کو پیغمبر نہیں بنایا۔ بلکہ غیر معروف لوگوں میں سے ایک شخص کو پیغمبری کے لیے چن لیا۔اب جن لوگوں نے اس شخص کو پیغمبری سے پہلے کم سمجھا تھا وہ پیغمبری کے بعد بھی اس کو کم سمجھتے رہے۔ خدا نے انہیں بڑا کر دیا مگر جو لوگ انہیں پہلے چھوٹا دیکھ چکے تھے ان کے لیے ممکن نہ ہوا کہ وہ ان کی بڑائی کو پہچانیں اور ان کو اپنا بڑا بنائیں۔

یہ سب سے بڑا انفسیاتی فتنہ ہے جو ہر دور میں لوگوں کے لیے حق کو ماننے میں رکاوٹ بنا رہا ہے۔موجودہ دنیا میں انسان کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ حقیقت کو "غیب" کی سطح پر پالے۔وہ سچائی کو اس کے مجرد روپ میں پہچان سکے۔لوگ عظمتوں کی سطح پر اعتراف کا ثبوت دے رہے ہیں۔ حالاں کہ اعتراف کا ثبوت وہاں دینا پڑتا ہے جہاں بظاہر دیکھنے

والوں کو عظمت دکھائی نہیں دیتی۔لوگ رونقوں کے مقام پر خدا پرستی کا مظاہرہ کررہے ہیں حالانکہ خدا اکثر وہاں ہوتا ہے جہاں کسی قسم کی رونق نظر نہیں آتی۔

خدا سے بغاوت

خدا نے اپنی دنیا کا ایک منصوبہ بنایا۔اس منصوبہ کے مطابق وہ اپنی دنیا کو چلا رہا ہے۔جولوگ اس منصوبہ سے مطابقت کر کے اس دنیا میں رہیں وہ خدا کے فرماں بردار بندے ہیں۔خدا ان کو اپنے ابدی انعامات سے نوازے گا۔اس کے برعکس، جولوگ اس منصوبہ سے مطابقت نہ کریں وہ خدا کی دنیا میں فساد پھیلانے کے مجرم ہیں۔خدا انہیں عنقریب پکڑ لے گا اوران کو ایسی سزادے گا جس سے ابدتک نکلنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

خدا ہر صبح سورج کو روشن کرتا ہے تا کہ اس کے بندے اس کی روشنی میں چلیں۔مگر ایک انسان دوسرے انسان کو اندھیرے میں دھکیل دینا چاہتا ہے۔خدا زمین سے رزق اگاتا ہے تا کہ اس کے بندے اس سے اپنی بھوک مٹائیں۔مگر ایک انسان دوسرے انسان کو بھوک سے تڑپا کر خوش ہوتا ہے۔خدا اپنے پاس سے بارش برساتا ہے تا کہ تمام انسان اور جاندار اس سے سیراب ہوں۔مگر انسان اپنے مفروضہ دشمنوں کو پیاس سے تڑپا کر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے۔

خدا لوگوں کے لیے مواقع کھولتا ہے تا کہ وہ ان مواقع کا استعمال کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔مگر انسان یہ منصوبہ بناتا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کے ملے ہوئے مواقع کو چھین لے۔خدا ایک انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔مگر دوسرا انسان حسد میں مبتلا ہو کر چاہتا ہے کہ اس کو بے عزت کر کے اوراس کو ناکام بنا کر چھوڑ دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں فساد فی الارض کہا گیا ہے۔یعنی خدا نے اپنی دنیا کا

نقشہ جس ڈھنگ سے بنایا ہے اس میں بگاڑ پیدا کرنا۔ خدا کی دنیا میں خدا کے منصوبہ کے خلاف زندگی گزارنا۔ خدا کی زمین میں خدا کی پسند کو چھوڑ کر وہ روش اختیار کرنا جو آدمی کی پسند اور خواہش کے مطابق ہو۔

انسان خدا کی اسکیم کی نفی کرتا ہے۔ انسان خدا کے فیصلہ کو بدل دینا چاہتا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ سب سے بڑا جرم ہے جو کوئی انسان اس زمین پر کر سکتا ہے۔ آج یہ سب سے بڑا جرم خدا کی زمین پر سب سے بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس بغاوت کے مرتکب وہ لوگ بھی ہیں جو خدا کی بغاوت کو خدا کی زمین سے ختم کرنے کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں۔

اہلیت

ایک شخص اچھے خاندان میں پیدا ہوا۔ بعد کو اس کے حالات خراب ہو گئے۔ معاشی اعتبار سے وہ بالکل مفلس ہو کر رہ گیا۔ اس زمانہ میں اس کے تمام دوست اور رشتہ دار اس سے جدا ہو گئے۔ کوئی اس کا بھی روادار نہ تھا کہ اس سے ملاقات اور سلام کلام کا تعلق رکھے۔

پھر وہ وقت آیا کہ اس کے حالات بدل گئے۔ وہ اپنی بستی کا سب سے زیادہ خوش حال آدمی بن گیا۔ اب اس کے پرانے دوست اور رشتہ دار اس کے پاس آنے لگے۔ وہ اس کو یقین دلاتے کہ ہم تو ہمیشہ تمہارے خیر خواہ تھے۔ مگر آدمی پر ان لوگوں کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے ان میں سے کسی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ ایک شخص جو ہر حال میں اس کا ساتھی بنا رہا۔ اس کو اس نے بہت بڑے پیمانہ پر نوازا۔ اس کو اس نے اپنا سب سے قریبی ساتھی اور مشیر کار بنا لیا۔

یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قدر وہ ہے

جو ناموافق حالات میں قابل قدر ہونے کا ثبوت دے۔ جو دعوت حق کو اس وقت پہچانے جب کہ دعوت حق ماحول میں اجنبی بنی ہوئی ہو۔ جو دین خداوندی کے ساتھ ایسے حالات میں اپنے کو وابستہ کرے جب کہ دین ظاہر بینوں کو بے قیمت نظر آتا ہو۔

اللہ تعالیٰ دلوں کو دیکھتا ہے نہ کہ جسموں کو۔ اللہ کے یہاں حقیقت کی قدر ہے نہ کہ ظاہری دکھاوے کی۔ اللہ کو وہ بندے پسند ہیں جو اس وقت جھک گئے ہوں جب کہ اس کی قوتیں ابھی غیب میں چھپی ہوئی ہیں۔ اللہ کو وہ بندے درکار ہیں جن کی بصیرت کی نگاہیں کھلی ہوئی ہوں۔ اللہ کو وہ بندے درکار نہیں جن کے اندھے پن کا یہ حال ہو کہ وہ پیشانی کی آنکھ سے دکھائی دینے والی چیزوں کے سوا کسی اور چیز کو دیکھ ہی نہ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ دینے والے دور میں دئے جانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ پہچاننے والا وہ قرار پاتا ہے جس نے نہ پہچاننے والے حالات میں پہچاننے کا ثبوت دیا ہو۔ انعام کا مستحق وہ ہے جس نے اس وقت ساتھ دیا ہو جب کہ لوگوں نے اس کو غیر اہم سمجھ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا۔

پانے کے باوجود محروم

چارلی چپلن (1977-1889) فلمی دنیا کا ایک مشہور ترین آدمی تھا۔ وہ فلموں میں ہنسانے کا کردار ادا کرتا تھا۔ اس نے 52 سالہ فلمی زندگی میں بے شمار دولت کمائی۔ چارلی چپلن ایک انگریز تھا۔ اس نے امریکا میں فلمی ترقی حاصل کی اور پھر سوئزرلینڈ میں اس نے 137 ایکڑ زمین خرید کر وہاں اپنے لیے ایک شاندار مکان بنایا۔ جب وہ مرا تو اس کی ملکیت میں دس ملین پونڈ موجود تھے۔ اس کو بڑے بڑے انعامات اور خطابات سے نوازا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ چارلی چپلن کو دنیا کے ہر حصہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی تقریباً 80 فلمیں ایسی ہیں جو مسلسل کہیں نہ کہیں دکھائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ 17-1914 میں اپنی ابتدائی زندگی میں اس نے جن فلموں میں کام کیا تھا وہ فلمیں بھی ابھی تک تاجرانہ حیثیت سے کامیاب ہیں۔ یہ ابتدائی فلمیں بھی آج محض تاریخی یادگار کے طور پر نہیں دکھائی جاتیں بلکہ جدید تفریح کے معیار سے ان کو دیکھا جاتا ہے۔ چارلی چپلن موجودہ زمانہ کا واحد فلمی کردار ہے جو اب بھی اتنے شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں 300 ملین ایسے لوگ ہیں جنھوں نے چارلی چپلن کی 80 فلموں میں سے ایک ایک فلم کو دیکھا ہے۔

چارلی چپلن کی ابتدائی زندگی نہایت غربت میں گزری تھی۔ چنانچہ بعد کو کثیر دولت کا مالک ہونے کے باوجود اس کو ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ دوبارہ مفلس نہ ہوجائے۔ اس نے ایک کے بعد ایک چار شادیاں کیں۔ آخر عمر میں وہ بالکل ناکارہ ہوگیا۔ اس کی زندگی وہیل چیر (پہیہ دار کرسی) پر گزرتی تھی۔ اس کی نگاہ بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ اس کے بولنے اور سننے کی طاقتیں جواب دے گئی تھیں۔ حقیقی چارلی چپلن بستر پر ناکارہ پڑا تھا۔ مگر فلمی چارلی چپلن بدستور سنیما ہاؤسوں میں لوگوں کی تفریح کا مرکز بنا ہوا تھا۔

چارلی چپلن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "اس نے کسی بھی دوسرے انسان کے مقابلہ میں لوگوں کو زیادہ خوشی دی اور زیادہ ہنسایا" مگر اس کا اپنا انجام یہ ہوا کہ وہ آخر عمر میں اپنے بڑھاپے کو بے بسی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس کا ہنسنا اس سے رخصت ہو چکا تھا۔ 25 دسمبر 1977 کو چار بجے صبح اس وقت اس کا انتقال ہوگیا جب کہ صرف چند گھنٹے بعد اس کا خاندان کرسمس کی سالانہ تقریبات منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

چارلی چپلن کے ایک سوانح نگار ڈینس گیفرڈ (Denis Gifford) نے اس کے انجام کی بابت یہ الفاظ لکھے ہیں:

وہ جب کام کرتا تھا تو وہ محض فلم سے کچھ زیادہ کی تخلیق کرتا تھا۔ ہنسی اور محبت کے ساتھ جینا، خواب اور امیدیں۔ مگر ہمیشہ خوشیوں پر خاتمہ کہاں تھا، اگر بالآخر وہ کل کی سڑک پر قدم رکھنے سے زیادہ کچھ نہ ہو(آر۔ڈی جون 1978)۔

چارلی چپلن کی موت کے بعد ایک مبصر نے اس کی بابت حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:

> Chaplin's life has been filled to the brim with what most lives consist of yearning after...wealth and fame and creative play and beautiful women...but he does not know how to enjoy any of the four.
>
> *Max Eastman in Ladies Home Journal.*

چارلی چپلن کی زندگی ان چیزوں سے آخری کنارے تک بھری ہوئی تھی جس کی دوسرے اکثر لوگ صرف تمنا کرتے ہیں — دولت، شہرت، تخلیقی اداکاری اور خوبصورت عورتیں۔ مگر اس کو نہیں معلوم تھا کہ ان چاروں میں کسی ایک سے بھی وہ کس طرح لطف اندوز ہو۔

چارلی چپلن کی یہ کہانی تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ چارلی چپلن کی طرح پا کر محروم رہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ پائے بغیر محروم۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس سب سے بڑی حقیقت کو جانتے ہوں۔

امریکا کی ایک نوجوان عورت نے خودکشی کرلی۔ اس کی جیب میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک پرچہ تھا۔ اس میں درج تھا: مجھے خوشی کی تلاش تھی۔ اس کے لیے میں نے نشہ کا استعمال کیا۔ میں جنسی آوارگی کی حد تک گئی۔ مگر مجھے کہیں خوشی نہیں ملی۔ اب میں مایوس ہو کر اپنے آپ کو ختم کر رہی ہوں۔

اکثر آزاد خیال مردوں اورعورتوں کا یہی حال ہے۔ وہ خوشی کی تلاش میں سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ مگر آخر میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کے بعد کچھ مایوسانہ زندگی گزار کر طبعی موت مرتے ہیں اور کچھ لوگ جھنجھلاہٹ میں آ کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

امتحان گاہ

قرآن وحدیث میں زندگی کا یہ تصور دیا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ملتا ہے۔ وہ اس کا حق نہیں ہوتا۔ آدمی ان چیزوں سے صرف ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھاتا ہے اس کے بعد موت آتی ہے اور اس کے سازوسامان سے اسے جدا کر دیتی ہے۔ موت سے پہلے یہ چیزیں ہر ایک کو ملتی ہیں مگر موت کے بعد صرف اس کو ملیں گی جو آزمائش میں پورا اترے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

ایک طالب علم امتحان کے کمرہ میں ہے۔ وہ اپنا تعلیمی امتحان دے رہا ہے۔ اس وقت بظاہر وہ ایک مکان میں ہے۔ اس کے پاس میز اور کرسی اور دوسرے ضروری سامان ہیں۔ اس کے خدمت گار بھی وہاں موجود ہیں۔

بظاہر دیکھنے والوں کو وہ صاحب مِلک آدمی نظر آتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ محض وقتی ہے۔ جیسے ہی وقت پورا ہونے کا الارم بجتا ہے۔ اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا کچھ بھی نہ تھا۔ ہر چیز جو وہاں اس کے پاس تھی اس سے واپس لے لی جاتی ہے۔ اور وہ بلا تاخیر امتحان گھر کے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ وسیع ترمعنوں میں دنیا کا بھی ہے۔ یہ دنیا انسان کے لیے ایک خدائی امتحان گاہ ہے۔ یہاں ہر آدمی صرف اس لیے ہے کہ وہ اپنا امتحان دے۔ خدا نے ہر آدمی کے لیے مدت مقرر کر رکھی ہے۔ جیسے ہی یہ مدت پوری ہوتی ہے۔ فوراً موت کا فرشتہ آتا ہے اور آدمی کو جبراً اس دنیا سے نکال کر خدا کے سامنے حاضر کر دیتا ہے تا کہ ہر آدمی کو اس کے عمل کے مطابق اس کا بدلہ دیا جائے۔

موت کا لمحہ امتحان کی مدت ختم ہونے کا لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی جان لیتا ہے کہ ان چیزوں میں سے اس کا کچھ نہ تھا جس کو وہ اپنا سمجھے ہوئے تھا۔ جس مکان کو اس نے بنایا تھا وہ اس سے جدا کر دیا جاتا ہے۔ جس جائیداد کو وہ اپنی چیز سمجھتا تھا وہ اس سے چھین لی جاتی ہے۔ جن آدمیوں کو وہ اپنے آدمی سمجھتا تھا وہ اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔

یہ لمحہ ہر آدمی پر آنے والا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ جو اس کے آنے سے پہلے اس کو جان لے جو آنے سے پہلے اس کی تیاری کر لے۔

قانون کی حد

26 اگست 1978 کو دہلی میں بھیانک جرم کا ایک واقعہ ہوا۔ ایک فوجی افسر ایم ایم چوپڑا کے دو بچے سنجے (15) اور گیتا (17) انتہائی بے قصور طور پر مار ڈالے گئے۔ نوجوان بہن بھائیوں کے اس قتل پر ملک کا ضمیر جاگ اٹھا۔ مجرمین کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر قتل کے دونوں مجرمین جبیر سنگھ عرف بلا (25) اور کلجیت سنگھ عرف رنگا (23) ایک ٹرین میں سفر کرتے ہوئے آگرہ اسٹیشن پر پکڑ لیے گئے۔ اس کے بعد دونوں پر قتل کا مقدمہ چلا۔ لمبی عدالتی کارروائی کے بعد دونوں کو پھانسی دینے کا فیصلہ

ہوا۔مختلف قانونی مراحل سے گزر کر بالآخر دونوں کو 31 جنوری 1982 کو دہلی کے تہاڑ جیل میں پھانسی دے دی گئی۔

ایڈیشنل سیشن جج ایم۔کے چاولا نے پانچ صفحات کے فیصلہ میں دونوں کے لیے موت کا حکم دیتے ہوئے لکھا:

The ends of justice would be met only if the two accused were put to eternal sleep, thereby allowing others to live in peace.

انصاف کے مقاصد صرف اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ دونوں مجرم ہمیشہ کی نیند سلا دیے جائیں تاکہ دوسروں کو امن کے ساتھ جینے کا موقع ملے (ہندستان ٹائمس، 1 فروری 1982)۔

جج کے یہ الفاظ انسانی قانون کی حد کو بہت اچھی طرح بتاتے ہیں۔انسانی قانون کے بس میں صرف یہ ہے کہ وہ مجرم اور سماج کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔وہ مجرم کو اس کے جرم کی حقیقی سزا نہیں دے سکتا۔ایک شخص جب کسی معصوم جان کو ناحق ذبح کر دے تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ موجودہ محدود دنیا کی کوئی سزا اس کے جرم کے برابر نہیں ہو سکتی۔دنیا کا جج بس اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جس شخص کے اندر اس قسم کا مجرمانہ ذہن دیکھے اس کو آئندہ کے لیے سماج سے ہٹا دے۔

موجودہ دنیا کی یہ محدودیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کے بعد ایک اور لامحدود دنیا آئے جہاں یہ کمی پوری ہو۔جہاں کے جج کے امکان میں صرف یہ نہ ہو کہ وہ ظالم اور مظلوم میں جدائی کر دے بلکہ وہ ظالم کو اس کے ظلم کی ایسی سزا دے سکے جو انصاف کے تقاضے کو پورا کرنے والی ہو۔

دلیل اور شخصیت

قرآن میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ مختلف مقامات پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ فرعون نے جب مصر کے جادوگروں کو بلایا اور حضرت موسیٰ سے ان کا مقابلہ ہوا تو یہ واقعہ پیش آیا کہ جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں ڈالیں۔ وہ جادو کے زور سے سانپ کی مانند چلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس وقت حضرت موسیٰ نے خدا کے حکم سے اپنا عصا ڈالا تو وہ تمام سانپوں سے بڑا سانپ بن کر میدان میں دوڑنے لگا۔ اس نے جادوگروں کے جادو کو نگل لیا۔ وہ جدھر جدھر گیا۔ جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں بس رسیاں اور لاٹھیاں بن کر رہ گئیں۔

یہ دیکھ کر جادوگروں نے سمجھ لیا کہ حضرت موسیٰ کا معاملہ کوئی جادو کا معاملہ نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا معاملہ ہے۔ حضرت موسیٰ کے مظاہرے میں جادوگروں کو خدا کی معرفت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے اسی وقت اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔ یہ فرعون کی کھلی ہوئی شکست تھی۔ اس نے غصہ میں آ کر جادوگروں کے لیے مصر کی سخت ترین سزا کا اعلان کر دیا۔ وہ یہ کہ جادوگروں کے ہاتھ اور پاؤں کو مخالف سمتوں سے کاٹ کر انھیں تڑپایا جائے اور پھر انھیں کھجور کے تنوں پر لٹکا کر سولی دے دی جائے۔

اس سزا کو سن کر جادوگروں کی زبان سے نکلا ــــ ہم تجھ کو ان دلائل پر ترجیح نہ دیں گے جو ہمارے پاس آئے ہیں: لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ (20:72)۔

جادوگروں کے سامنے ایک طرف عظیم شخصیت تھی اور دوسری طرف کھلی ہوئی دلیل شخصیت اور دلیل کے اس مقابلہ میں انھوں نے وہی کیا جو ایک سچے انسان کو کرنا چاہیے۔ انھوں نے شخصیت کو نظرانداز کر دیا اور دلیل کو لے لیا۔

جب آدمی کے سامنے ایسی دلیل آجائے جو بات کو اس طرح ثابت شدہ بنا دے کہ وہ اس کی تردید کے لیے کوئی جوابی دلیل پیش کرنے سے عاجز رہے تو اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دلیل کو لے لے اور اس کے خلاف شخصیتوں کو چھوڑ دے۔ دلیل کا اس طرح ظہور دراصل خدا کا ظہور ہے۔ جو لوگ دلیل کے مقابلہ میں شخصیت کو ترجیح دیں انھوں نے گویا خدا کے مقابلہ میں غیر خدا کو ترجیح دی۔ ایسے لوگوں کے لیے زمین وآسمان کے اندر کوئی جگہ نہیں۔ یہ غیر خدا کو اپنا بنانا ہے۔ پھر خدا کی دنیا میں جو لوگ غیر خدا کو اپنا خدا بنائیں وہ کیسے یہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

کائنات کا دسترخوان

قرآن میں ہے کہ — اللہ آسمان وزمین کا نور ہے (24:35)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا تمام کی تمام خدائی صفات کا مظہر ہے۔ حساس قلب کو یہاں کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ رزق خداوندی کا دسترخوان ہے۔

خدا پر ایمان اگر کسی آدمی کو وہ حساسیت دے دے جو خدا پر سچے ایمان سے پیدا ہوتی ہے تو کائنات میں فی الواقع اس کو ہر طرف خدا کا نور دکھائی دے گا۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوئیں گے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اسے مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمت حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آئے گا۔ چڑیوں کے چہچہے جب اس کے کان میں رس گھولیں تو اس کے دل کے تاروں پر زمزمۂ خداوندی کے نغمے جاگ اٹھیں گے۔ پھولوں کی مہک جب اس کے مشام جان کو معطر کرے گی تو وہ اس کے لیے خدائی خوشبو میں نہانے کے ہم معنی بن جائے گی۔

ساری کائنات مومن کے لیے رزق روحانی کا دسترخوان ہے، ویسے جیسے جنت اس

کے لیے رزق مادی کا دسترخوان ہوگی۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پالے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لیے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لیے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی بندہ خدا اس کو دیکھ کر کہے — "اے خدا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سر سبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے۔"

صرف "کرنا" کافی نہیں

بالٹی کے پیندے میں سوراخ ہو اور اوپر سے آپ اس میں پانی ڈالیں تو سارا پانی بہہ کر نکلتا رہے گا اور بالٹی کے اپنے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ایسا معاملہ انسان کا بھی ہے۔ آدمی کا وہی عمل حقیقۃً عمل ہے جو خود اس کو کچھ دے رہا ہو۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں

دکھارہا ہواور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہوتو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔اس کے دل میں سوزوتڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہل چل پیدا ہو۔اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لیے کھول دے۔یہی یافت کسی عمل کی کامیابی کا اصل معیار ہے۔وہی عمل عمل ہے جو آدمی کو اس قسم کے تحفے دے رہا ہو۔جس عمل سے آدمی کو یہ چیزیں نہ ملیں وہ ایسا ہے جیسے سوراخ دار بالٹی میں پانی گرانا۔

دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کررہے ہیں۔دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔اگر آپ کی "مصروفیات" بہت بڑھی ہوئی ہوں، اگر بتانے کے لیے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو، آپ خود کچھ نہ ہورہے ہوں تو آپ کی مصرفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں (idle business) ہیں۔اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔اسی طرح جو عمل آدمی کی اپنی غذا نہ بن رہا ہو وہ عمل نہیں صرف بے عملی ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی چیز۔

پتھر کے اوپر آپ پانی ڈالیں تو وہ بظاہر پانی سے بھیگ جائے گا۔اس کے چاروں طرف پانی پانی نظر آئے گا۔مگر پتھر پانی کے مزہ اور تراوٹ کو نہیں جانتا، اس نے پانی کی اِس دوسری حیثیت کا تجربہ نہیں کیا۔اس کے برعکس، ایک زندہ آدمی جب پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کی رگیں تر ہو جاتی ہیں، وہ پانی کی حقیقت کا ایک "اندرونی تجربہ" کرتا ہے۔اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور ہونا کیا۔کرنا یہ ہے کہ آدمی کچھ

مقررہ اعمال کو بس رسمی طور پر دہرا لے۔ آدمی کی زبان کچھ الفاظ بولے مگر وہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بن رہے ہوں۔ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کچھ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کی روح کو نہ چھوئے۔ اس کی حرکات وسکنات اس کے دل ودماغ میں ارتعاش نہ پیدا کریں۔ اس کے برعکس، ہونا یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے لیے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی اندرونی ہستی کو بار بار کیفی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کا جسمانی عمل اس کے غیر جسمانی وجود میں ہل چل پیدا کر رہا ہو۔ وہی کرنا کرنا ہے جس کے درمیان آدمی خود بھی کچھ ہو رہا ہو۔ جو کرنا ہونا نہ بنے، حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ گویا ایک ایسا پتھر ہے جو بظاہر پانی سے بھیگ رہا ہے مگر وہ پانی کا مزہ نہیں پاتا۔

الفاظ کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یک جا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی لیبارٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (sperm) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹیسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ جولائی 1978 میں تاریخ کا پہلا "test tube baby" وجود میں

آ گیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئس براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل" یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز اوما چوپڑہ کو 26 اگست 1978 کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (17 سال) اور سنجے (15 سال) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین وملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین وملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد وغم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پا لیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

امتحان

حضرت ابراہیم کوخواب میں دکھایا گیا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم خواب کے مطابق بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر جیسے ہی آپ نے بیٹے کے گلے پر چھری رکھی، آواز آئی کہ بس تم نے خواب کو پورا کر دکھایا۔ اس کے بعد آپ کو خصوصی طور پر ایک مینڈھا فراہم کیا گیا اور آپ نے بیٹے کے بدلے اسی مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ — اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قربانی مانگی جاتی ہے مگر قربانی لی نہیں جاتی۔ گلے پر چھری رکھی جاتی ہے مگر قبل اس کے کہ چھری آدمی کا گلا کاٹے، چھری کو گلے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

اس دنیا میں ہر آدمی کا اصل امتحان نفسیاتی امتحان ہے نہ کہ جسمانی امتحان۔ خدا انسان کی آمادگی کو دیکھتا ہے نہ کہ کر ڈالنے کو۔ خدا کبھی کسی کو غیر ضروری مشقت میں نہیں ڈالتا۔ مگر مشقت سے نجات اس کو ملتی ہے جو اپنے آپ کو مشقت کے حوالے کرنے کا واقعی ثبوت دے دے۔

جو لوگ قربانی کے راستہ سے بھاگتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ خدائے رحمان و رحیم پر یقین نہیں رکھتے۔ خدا تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ شفیق ہے جتنا کوئی باپ اپنے عزیز بیٹے کے لیے شفیق ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں قربانی کے راستہ سے بھاگنا خدا کے خلاف بے اعتمادی کا اظہار ہے۔ حالاں کہ خدا جتنا لیتا ہے اس سے بہت زیادہ دیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کو صرف ایک بیٹا پیش کیا تھا اور خدا نے ان کو سارے عالم کی امامت دیدی۔

انسان کو چاہیے کہ وہ کسی تحفظ کے بغیر خدا کے راستہ پر چل پڑے۔ وہ قربانی کے مواقع پر ہرگز اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کرے۔ اسی کے ساتھ وہ یقین رکھے کہ شفیق باپ سے

بھی زیادہ مہربان اور طاقت ور خدا ہر آن اس کو دیکھ رہا ہے۔ خدا آدمی کا امتحان ضرور لیتا ہے مگر قبل اس کے کہ آدمی ہلاکت میں پڑے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیتا ہے۔

کیسا عجیب ہے وہ بیٹا جو باپ کی پکار پر یقین نہ کرے۔ کیسا عجیب ہے وہ بندہ جو خدا کے بارے میں اپنا اعتماد کھودے۔

کوئی فرق نہیں

ایک آدمی ایک درخت کے نیچے آرام کررہا تھا۔اس کا ایک دوست ادھر سے گزرا۔اس نے پکار کر کہا"میرے بھائی، تم کیوں نہیں جاتے کہ کچھ لکڑیاں کاٹ کر لاؤ"۔

"کس لیے" سوئے ہوئے آدمی نے پوچھا۔

"تاکہ تم ان لکڑیوں کو بیچ کر پیسہ حاصل کرو اور اپنے لیے ایک گدھا خریدو اور پھر لکڑی کو گدھے پر لاد کر گھر گھر بیچو۔اس طرح ایک وقت آئے گا تم اور نفع کما کر ایک ٹرک خرید لوگے۔ پھر تم اور ترقی کروگے اور تمہارے یہاں آرہ کی مشین اور بہت سے ٹرک ہوجائیں گے"۔

"یہ سب کس لیے" سونے والے نے دوبارہ پوچھا۔

"تم لکھ پتی ہوجاؤگے اور آرام سے رہوگے"۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے، اب میں کیا کررہا ہوں"۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ جو آرام ایک آدمی کوٹھی بنا کر حاصل کرنا چاہتا ہے وہی آرام ایک آدمی درخت کے سایہ میں بھی حاصل کررہا ہے۔دیکھنے والوں کے نزدیک ضرور دونوں میں فرق ہے۔مگر خود آرام کرنے والے کے لیے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ درخت کے نیچے سونے والا جس سکون میں ہے وہ کوٹھی والے کو شاید میسر نہیں۔

ایک تاجر ایک بار مجھے اپنا نیا مکان دکھانے کے لیے لے گئے۔ کافی بڑا دو منزلہ مکان تھا۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے کے لیے الگ الگ کمرے اور اس کے ساتھ تمام ضروری سہولتیں مہیا تھیں۔ سارے گھر میں قیمتی قالین بچھے ہوئے، تمام دروازے اور کھڑکیاں خوبصورت پردوں سے ڈھکی ہوئی۔ ہر کمرہ میں اعلیٰ درجہ کا فرنیچر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پورا گھر جدید سامانوں کی ایک نمائش گاہ ہے۔

مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک خوبصورت قید خانہ میں بند کر دیا گیا ہوں۔ یہ مکان ایک کھلی جگہ پر تھا وہ قدرت کی ہر چیز سے خالی اور قسم قسم کی مصنوعی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف بجلی کی روشنی کا اعلیٰ انتظام تھا مگر سورج کی روشنی کو اجازت نہ تھی کہ وہ بند مکان میں داخل ہو۔ ہر کمرہ میں ایرکنڈیشنر لگا ہوا تھا مگر قدرتی ہوا کا کہیں گزر نہ تھا۔ انسانی آرٹ کے نمونے دیوار پر تھے مگر قدرت کے آرٹ کو دیکھنے کے لیے وہاں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی نہ تھی۔ کمرہ میں میوزک کا انتظام تھا مگر باہر کے درخت پر چہچہانے والی چڑیوں کی آواز سننے کے تمام راستے بند تھے — جدید تمدن نے انسان کو قدرت سے کتنا دور کر دیا ہے۔

پچپن سال کے بعد

طبیہ کالج (قرول باغ، دہلی) نے ایک بار رات کی کلاسیں شروع کی تھیں تاکہ ملازمت پیشہ لوگ اس میں داخلہ لے کر طبی کورس کریں اور اپنے خالی اوقات میں پریکٹس کرسکیں۔ انہیں داخلہ لینے والوں میں سے ایک مسٹر رمیش دتہ تھے۔ وہ اکاؤنٹ آفس میں کام کرتے تھے اور اسی کے ساتھ رات کے کلاس میں شریک ہوکر بی آئی ایم ایس

(B.I.M.S) کا کورس کر رہے تھے۔ 1955 کا واقعہ ہے، ان کے استاد ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے ایک باران سے پوچھا: دتہ جی، آپ تو ایک اچھی ملازمت میں ہیں۔ پھر آپ بی آئی ایم ایس کا کورس کیوں کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

"نوکری پچپن سال کی ہے اور زندگی سو سال کی۔ پھر نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد کیا کروں گا"۔ کہنے والے نے زندگی کی جو تقسیم موجودہ دنیا کے اعتبار سے کی ہے وہی تقسیم وسیع تر معنوں میں دنیا اور آخرت کے اعتبار سے بھی ہے۔ دنیا میں انسان کی عمر کو اگر پچپن سال سمجھیں اور آخرت کی طویل تر زندگی کو علامتی طور پر "سو سال" سمجھیں تو معلوم ہو گا کہ ہر آدمی وسیع تر معنوں میں اسی سوال سے دو چار ہے۔ تاہم ہر آدمی کو صرف اپنے "55" سال کی فکر ہے، کسی کو اپنے "سو سال" کے بارے میں کوئی پریشانی نہیں۔

دنیا کی "55 سالہ" زندگی کے لیے ہر آدمی سرگرم ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری طاقت خرچ کر کے اس کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ اس معاملہ میں ہر آدمی اتنا زیادہ سنجیدہ ہے کہ وہ فوراً اس کے نشیب و فراز کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ اس کے کسی موقع کو کھونا کسی حال میں گوارا نہیں کرتا۔

دوسری طرف "سو سالہ" زندگی جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے، اس کی کسی کو پروا نہیں۔ اس معاملہ میں آدمی نہ کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتا اور نہ کچھ کرنے کی۔ یہاں کوئی یہ کہنے والا نہیں ملتا کہ — موت سے پہلے کی زندگی تو صرف "55 سال" کی ہے اور موت کے بعد کی زندگی "سو سال" کی۔ پھر اگر ابھی سے میں نے تیاری نہ کی تو موت کے بعد کی "سو سالہ زندگی" میں میں کیا کروں گا۔ کیسا عجیب ہے وہ انسان جو تھوڑی زندگی کے لیے تو بہت زیادہ کر رہا ہے مگر زیادہ زندگی کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں (26 جنوری 1984)۔

غالباً یہی صورت حال ہے جس کی طرف حدیث میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے — میں نے جہنم سے زیادہ سخت چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا سو گیا ہو۔ اور میں نے جنت سے زیادہ قیمتی چیز نہیں دیکھی جس کا چاہنے والا سو گیا ہو (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2601)۔

خدا کی عبادت

پرستش کیا ہے

نیلما دیوی (Nilima Devi) ہندستان کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ رقص کو ایک خدائی آرٹ (Divine art) سمجھتی ہے۔ وہ اپنے فن میں اتنا ڈوبی ہوئی ہے کہ وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ رقص کی صورت میں جو کچھ ظاہر کرنا چاہتی ہے وہ ان کو ظاہر نہیں کر پاتی۔ جسمانی حرکات کی محدودیت اس کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ایک انٹرویو (ہندستان ٹائمس 30 دسمبر 1983) میں اس نے کہا کہ رقص وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں جسمانی حرکات ختم ہوجاتی ہیں:

The dance starts where the gymnastics end.

نیلما دیوی کا کہنا ہے کہ وہ رقص کا کام بطور پیشہ کے نہیں کرتی۔ یہ میرے لیے ایک طریق زندگی ہے۔ انٹرویو لینے والے کے الفاظ میں، جب وہ رقص نہیں کرتی تو وہ اپنے آپ کو خالی محسوس کرتی ہے۔ ایسے لمحات میں اس کے پاس کوئی نقطۂ ارتکاز نہیں ہوتا جس میں وہ اپنی زندگی کو مرتکز کر سکے:

She says when she is not dancing, she feels empty. There is no focal point in her life at such moments.

رقاصہ نے جس چیز کو طریق زندگی (Way of life) کہا، اسی کا دوسرا نام پرستش ہے۔ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ فن کی پرستش ایک رقاصہ کے اندر پیدا ہوجائے تو وہ اس کے اندر گہرے جذبات پیدا کر دیتی ہے — وہ رقص کو اس کے لیے زندگی بنا دیتی ہے۔ اس کے اندر جذبات کا ایسا طوفان برپا ہوتا ہے جس کے اظہار سے وہ اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگے۔ اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اپنے رقص کے ذریعہ وہ کچھ کہہ سکی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی خالی

ہوجاتی ہے۔ اس سے الگ ہوکر وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کے لیے کوئی ایسا مرکزی نقطہ باقی نہیں رہا جہاں وہ اپنے وجود کو سمیٹ سکے۔

خدا کی پرستش کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ ایک خدائی رقص ہے۔ جب کوئی بندہ اپنے رب کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے اتنا عظیم واقعہ ہوتا ہے کہ وہ رقص کر اٹھتا ہے۔ اس کا وہی حال ہوجاتا ہے جو مذکورہ مثال میں فن کے پرستار کا نظر آتا ہے — خدا اس کے تمام وجود کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ خدا سے الگ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ خدا کے بارے میں اس کے اندر ایسے گہرے جذبات اٹھتے ہیں جن کو بیان کرنے کے لیے وہ الفاظ نہ پا سکے۔

اللہ سے ڈرنے والے

دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کے ڈر سے خالی ہوں۔ ایسے لوگ خواہ زبان سے اللہ کا نام لیتے ہوں، مگر ان کے سینہ میں اللہ کے ڈر کا کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح رہتے ہیں جیسے کہ وہ آزاد ہیں کہ جو چاہیں کریں۔ ان کے سامنے سارا سوال بس دنیا کے نفع نقصان کا ہوتا ہے۔ جس کام میں نفع نظر آئے اس کی طرف دوڑنا اور جس کام میں نقصان کا اندیشہ ہو اس سے رک جانا، یہ ان کا مذہب ہوتا ہے۔ کسی چیز کا اصولی طور پر برحق ثابت ہوجانا ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ "دلیل" کے بجائے "مفاد" کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ کوئی کام کرتے ہوئے وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس معاملہ میں اللہ کی مرضی کیا ہے یا یہ کہ وہ اللہ کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہوسکتے ہیں۔ وہ وہاں جھک جاتے ہیں جہاں ان کا نفس جھکنے کے لیے کہے۔ اور وہاں اکڑ جاتے ہیں جہاں ان کا نفس اکڑنے کی ترغیب دے۔ وہ اللہ سے بےخوف زندگی گزارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تاکہ اللہ کی عدالت میں حساب دینے کے لیے کھڑے کر دیے جائیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے دل میں حرام وحلال کا لحاظ رہتا ہے۔ ان کوخیال آتا رہتا ہے کہ مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب کتاب کے لیے حاضر ہونا ہے۔ عام حالات میں وہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں کسی کو ان سے حق تلفی اور بے اخلاقی کا تجربہ نہیں ہوتا۔ تاہم وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں سے اٹھے ہوئے نہیں ہوتے۔ ان کا خوفِ خدا اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ وہ ان کے نفس کے اندر چھپے ہوئے جذبات کا احاطہ کرلے۔ عام حالات میں وہ خداترس زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیش آئے تو اچانک وہ دوسری قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ کبھی کسی کی محبت کا لحاظ، کبھی کسی کے خلاف نفرت کا جذبہ، کبھی اپنی عزت کا سوال ان کے اوپر اس طرح غالب آتا ہے کہ ان کا خوف خدا اس کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔ یہ عمل چونکہ اکثر غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اس لیے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اوپر نفس کے اس حملہ سے آگاہ ہوں اور اپنے آپ کو تھامے ہوئے اپنے کو متقیانہ روش پر قائم رکھیں۔ معمول کے حالات میں خداترسی کی زندگی گزارنے والا غیر معمولی حالات میں وہی کچھ کر گزرتا ہے جو پہلی قسم کے لوگ اپنی عام زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔

تیسرا انسان وہ ہے جو پورے معنوں میں اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ جو اللہ کو پہچاننے کے ساتھ خود اپنے کو بھی پوری طرح پہچان چکا ہو۔ ایسا شخص صرف عام حالات ہی میں اللہ سے نہیں ڈرتا بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی اللہ کا خوف اس کا نگراں بنا رہتا ہے۔ کسی کی محبت جب اس کو بے خوفی کے راستہ پر لے جانا چاہتی ہے تو وہ فوراً اس کو دیکھ لیتا ہے۔ کسی سے چھپی ہوئی نفرت جب اس کے نفس میں تیرتی ہے اور اس کو بے انصافی پر اکساتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے اور اس سے باخبر ہو کر اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ذاتی عزت ووقار کا سوال جب اس کے اندر داخل ہو کر اس کو کسی حق کے اعتراف سے

روکتا ہے تو وہ بلا تاخیر اس کو جان لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی تمام خامیوں سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اس کا مسلسل احتساب اس کو ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو انتہائی بے لاگ نظر سے دیکھ سکے۔ بالفاظ دیگر، وہ اپنے کو اس حقیقی نظر سے دیکھنے لگتا ہے جس نظر سے اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

دین داری

دینداری اصل میں اپنی ذات کی سطح پر دیندار بننے کا نام ہے۔ اپنی انا کو کچلنا اور اپنے اندرون میں خدا کو بسانا وہ چیز ہے جو اسلام کا اصل مطلوب ہے۔ جب آدمی اپنے آپ میں جینے کے بجائے خدا میں جینے لگے۔ جب دنیا کے بجائے آخرت اس کا مقصود بن جائے جب پانے سے زیادہ کھونا اس کو محبوب نظر آتا ہو تو اس نے دین کو پایا، اس نے اپنے خدا کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا۔

آدمی اکثر حالات میں باہر باہر جیتا ہے اس لیے وہ ایسے دین کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے جو اس کو اپنے سے باہر کی زندگی میں کوئی مشغلہ دیتا ہو۔

جو دین لاؤڈ اسپیکر کی سطح پر چیخ پکار کا پروگرام دے، جس دین میں آدمی کو جلسے اور جلوس کی سطح پر کارنامے دکھانے کا موقع ملتا ہو۔ جس دین میں سیر و سیاحت کی چاشنی موجود ہو۔ جس دین میں حکمرانوں سے نوک جھونک کرنے کا جواز ہاتھ آتا ہو۔ جو دین بحث و مناظرہ کی دلچسپیاں فراہم کرتا ہو۔ جس دین میں شامیانہ سجانے اور کھانے پینے کی دھوم مچانے کے مواقع ملتے ہوں۔ جس دین میں دوسروں کو گولی کا نشانہ بنا کر اس کی تڑپتی ہوئی لاش دیکھنے کا منظر نصیب ہوتا ہو۔ جس دین میں دوسروں کے پیسہ پر مفت کی لیڈری قائم

کرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہوں — دین کی یہ تمام صورتیں دین کو اپنے سے باہر پانے کی صورتیں ہیں۔ اس لیے وہ لوگ بہت جلد ایسے دین کی طرف دوڑ پڑتے جو اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہوں اور اپنے سے باہر دین کا ثبوت دے کر دیندار بننا چاہتے ہوں۔

دین اپنے اندر سفر کرنے کا نام ہے۔ دین اپنے آپ کو انانیت کے تخت سے اتارنا ہے۔ دین خود اپنے اندر جھانکنے کا نام ہے نہ کہ دوسروں کا ماہر بننے کا۔ درخت اپنے آپ میں جیتا ہے، اسی طرح مومن اپنے آپ میں جیتا ہے۔ درخت اسی وقت درخت بنتا ہے جب کہ اسکی جڑیں زرخیز زمین میں قائم ہو جائیں۔ اسی طرح مومن ایک روحانی درخت ہے جو خدا کی زمین میں اگتا ہے۔ وہ زمین و آسمان سے ایمانی رزق لے کر بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کی دنیا تک پہنچ جاتا ہے جس کا نام جنت ہے۔

محسوس پرستی

قرآن میں خدا کے مقبول بندوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں: يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (2:3) اور غیر مقبول بندوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں: يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (30:7)۔

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ شرک کیا ہے اور توحید کیا۔ اگر لفظ بدل کر کہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ — شرک نام ہے حقائق کو محسوسات کی سطح پر پہچاننے کا، اور توحید نام ہے حقائق کو معنویت کی سطح پر پہچاننے کا۔ مشرک انسان صرف ان خداؤں کو جانتا ہے جو محسوس طور پر اس کو اپنی آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس، موحد انسان اس خدا کو جان لیتا ہے جو صرف تصور کی آنکھ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ موحد مومن بالغیب ہوتا ہے اور مشرک مومن بالشہود۔

غیر مومن دکھائی دینے والی چیزوں میں جیتا ہے اور مومن نہ دکھائی دینے والی چیزوں میں۔ غیر مومن کی یافت عضویاتی یافت ہوتی ہے اور مومن کی یافت ذہنی یافت۔ غیر مومن کی پہنچ صرف ان چیزوں تک ہوتی ہے جن کو دیکھ کر جانا جاتا ہے اور مومن کی پہنچ ان چیزوں تک ہوجاتی ہے جن کو صرف سوچ کر جانا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں یہی انسان کی سب سے بڑی گمراہی رہی ہے۔ پیغمبر لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے تھے مگر خدا چونکہ دکھائی نہیں دیتا اس لیے بہت کم لوگ ایسے نکلے جو خدا کی طرف متوجہ ہوسکیں۔ بیشتر لوگوں نے انہیں محسوس چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنالیا جن کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔ روشن ستاروں کی پرستش سے لے کر دریاؤں اور پہاڑوں کی پرستش تک ہر جگہ یہی ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ پیغمبروں کی دعوت کو نہ ماننے کی سب سے بڑی وجہ ہر دور میں یہ تھی کہ ان کے مخالفین صرف محسوس خداؤں سے آشنا تھے، اس لیے پیغمبروں کی زبان سے غیر محسوس خدا کی پکار کو سن کر وہ متاثر نہ ہوسکے۔

بزرگوں اور ممتاز شخصیتوں کی پرستش کی نفسیات بھی یہی ہے۔ خدا چونکہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا اس لیے لوگ خدا کی عظمت کو پکڑ نہیں پاتے۔ بزرگ اور ممتاز شخصیتیں دکھائی دیتی ہیں اس لیے لوگ ان کی عظمت کو پکڑ لیتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ بزرگ پرستی نام ہے محسوس پرستی کا، اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

محبت کا نذرانہ

آدمی اپنی فطرت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ خارجی سہارا چاہتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور جو اس کے لیے اعتماد ویقین کی بنیاد ہو۔ کسی کو اس حیثیت سے زندگی میں شامل کرنا اس کو اپنا معبود بنانا ہے۔ جب آدمی کسی ہستی کو اپنا معبود بناتا ہے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور عقیدت کے جذبات اس کے لیے خاص ہو جاتے ہیں۔ آدمی عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ کسی سے حبّ شدید کرے اور جس سے کوئی شخص حبّ شدید کرے وہی اس کا معبود ہے۔

موجودہ دنیا میں چوں کہ خدا نظر نہیں آتا اس لیے ظاہر پرست انسان عام طور پر نظر آنے والی ہستیوں میں سے کسی ہستی کو وہ مقام دے دیتا ہے جو دراصل خدا کو دینا چاہیے۔ یہ ہستیاں اکثر وہ سردار یا پیشوا ہوتے ہیں جن کو آدمی "بڑا" سمجھ لیتا ہے۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کے اس طرح گرویدہ ہو جاتے ہیں جیسا گرویدہ انہیں صرف خدا کا ہونا چاہیے۔ آدمی کی فطرت کا خلا جو حقیقۃً اس لیے تھا کہ اس کو خدا سے پر کیا جائے وہاں وہ کسی غیر خدا کو بٹھا لیتا ہے (البقرہ، 2:165)۔

مذہبی احساس جب اپنے اعلیٰ ترین اسٹیج کو پہنچتا ہے تو وہ محبت میں ڈھل جاتا ہے۔ خدا ہر قسم کی خوبیوں کا اعلیٰ ترین مجموعہ ہے۔ انسان جتنی بھی چیزوں کا مالک ہے وہ سب کی سب خدا کا عطیہ ہیں۔ کائنات کا گہرا مشاہدہ ایک ایسے خالق کا تعارف کراتا ہے، جو حیرت ناک حد تک حسن وکمال کی خصوصیات رکھنے والا ہے۔

یہ ہے خدااور کوئی آدمی جب ایسے خدا کو پالیتا ہے تو وہ بالکل فطری طور پر اس کی عقیدت ومحبت میں سرشار ہوجاتا ہے۔

انسان کے پاس کسی کو دینے کے لیے جوسب سے بڑی چیز ہے وہ محبت ہے۔ایسی حالت میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص خدا جیسی باکمال ہستی کو پائے اوراس کی خدمت میں محبت سے کم تردرجہ کی کوئی چیز پیش کرے۔محبت سے کم کوئی چیز نہ تو خدا قبول کرتااور نہ کسی انسان کے لیے جائز ہے کہ وہ خدا کے حضور میں محبت سے کم کسی چیز کا نذرانہ پیش کرے۔

خدا کی نصرت

محمد ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں مکی دور کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اورعقبہ بن ابی معیط کو مدینہ بھیجا۔وہاں وہ یہود کے علما سے ملے اوران سے پوچھا کہ ہم کومحمد کے بارے میں بتاؤ کہ ہم ان کو کیا سمجھیں۔علما یہود نے کہا کہ ان سے تم اصحاب کہف اورذوالقرنین کا حال پوچھو۔اگر وہ بتادیں تو وہ نبی مرسل ہیں اوراگر نہ بتا سکیں تو وہ متقول ہیں۔

یہ لوگ مکہ واپس آئے اوررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ان چیزوں کے بارے میں ہمیں بتائیں۔آپ نے فرمایا کہ تم نے جوسوال کیا ہے اس کا جواب میں تم کوکل دوں گا: أُخْبِرُكُمْ غَدًابِمَا سَأَلْتُمْ عَنْهُ۔آپ نے یہ جملہ کہا مگر ان شاء اللہ نہ فرمایا۔آپ کو خیال تھا کہ کل کے دن جبریل آئیں گے تو میں ان سے پوچھ کر بتادوں گا۔مگرانشاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے اگلے دن وحی نہ آئی۔یہاں تک کہ پندرہ دن تک وحی رکی رہی۔

وحی نہ آنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگلے دن جواب نہ دے سکے۔یہ مکہ کے مشرکین کے لیے سنہراموقع تھا۔انھوں نے لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ محمد نے

وعدہ کیا تھا مگر وہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کر سکے۔ دن پر دن گزرتے رہے اور آپ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ مکہ کے مشرکین نے اس کو خوب استعمال کیا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اب ثابت ہو گیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہیں۔ اگر وہ پیغمبر ہوتے تو ضرور اپنے وعدہ کے مطابق جواب دیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رات دن سخت بے چینی میں گزر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔ بظاہر یہ سراسر آپ کے خلاف بات تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو زبردست طور پر آپ کے موافق بنا دیا۔ وہ یہ کہ پندرہ دن وحی رکنے کی وجہ سے قریش نے سارے شہر میں اتنا پروپیگنڈا کیا کہ ایک ایک آدمی اس معاملہ سے باخبر ہو گیا۔ ہر آدمی کو اشتیاق ہو گیا کہ وہ جانے کہ اس کی بابت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہتے ہیں۔ گویا مکہ والوں نے بہت بڑے پیمانے پر سننے کی فضا بنا دی۔ چنانچہ پندرہ دن کے بعد جب سورہ کہف اتری اور اس میں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا تو سارے لوگ اس کو سننے کے لیے دوڑ پڑے۔ سورہ کہف کے اترتے ہی وہ سارے شہر میں ایک ایک آدمی کی زبان پر تھی۔ جو تبلیغ مہینوں میں ہوتی وہ صرف ایک دن میں ہو گئی — اگر اللہ چاہے تو وہ اپنے کسی بندے کی غلطی کو بھی صحت کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ اس کے ناموافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر دے (البدایہ والنہایہ، جلد 3، صفحہ 69)۔

دل کا سکون

آج کی دنیا ترقی یافتہ دنیا کہی جاتی ہے۔ مگر یہ تمام ترقیاں صرف "چیزوں" کی ہوئی ہیں۔ جہاں تک "انسان" کا تعلق ہے، وہ بدستور غیر ترقی یافتہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔ انسان پیچھے ہے اور چیزیں آگے۔

سب سے بڑی چیز جو انسان چاہتا ہے وہ سکون ہے۔مگر آج کسی کو سکون حاصل نہیں۔جدید مادی ترقیوں نے صرف یہ کیا ہے کہ انسان سے اس کا سکون چھین لیا ہے۔ یہ ترقیاں انسان کو سکون دینے میں سراسر ناکام ثابت ہوئی ہیں۔

موجودہ دنیا میں ایک عجیب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں سامانِ سکون ہے مگر سکون نہیں یہاں قہقہوں کا شور ہے مگر دل کا چین نہیں۔ یہاں خوشی کے اسباب کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں مگر حقیقی خوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ہم روح جیسی برتر چیز کو مادہ جیسی کمتر چیز کے ذریعہ خوش کرنا چاہتے ہیں۔اور ایسا ہونا کبھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔جولین آف ناروچ (1342-1416) نے صحیح کہا ہے کہ ہماری روح کبھی ان چیزوں میں سکون نہیں پاسکتی جو خود اس سے نیچی ہوں:

Our soul may never rest in things that are beneath itself.

انسان اشرف المخلوقات ہے۔وہ ہماری معلوم دنیا کی سب سے برتر مخلوق ہے۔اس کائنات میں انسان کے اوپر صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ خود خالق ہے۔یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انسان کے لیے سکون اور راحت کا واحد ذریعہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو پالے۔اس سے کمتر کوئی چیز اس کے لیے سکون اور راحت کا سبب نہیں بن سکتی۔

یہی حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللهِ أَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (13:28)۔

جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان ملتا ہے۔جان لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (1985-1900) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رکٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رکٹر نے کیلی فورنیا کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لیے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہیے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکا کی 48 ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لیے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس، 17 اکتوبر 1980)۔

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اِس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت بر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔

ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لیے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہیے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لیے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

خدا کی یاد

اخبار ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (15 مئی 1982) کے ذریعہ ہندستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے:

When a catastrophe strike, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندستانیوں کے لیے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لیے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب

سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہوتو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگراس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہیے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور بااختیار مخلوق ہے۔اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے،جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہوسکتی ہے۔

مومن کا ذہن

ایک روز کا واقعہ ہے۔میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔اچانک مجھ پر ایک عجیب تجربہ گزرا۔مجھ کو محسوس ہوا کہ کاغذ پر چھپے ہوئے انگریزی زبان کے الفاظ کو میں اردو زبان میں سمجھ رہا ہوں۔میری آنکھ اگرچہ ان کو انگریزی زبان میں پڑھ رہی ہے مگر میرا ذہن ان کو اردو زبان میں لے رہا ہے۔

یہی ہر شخص کا معاملہ ہے، خواہ وہ اردو کا آدمی ہو یا کسی دوسری زبان کا۔ آدمی کسی بات کو ہمیشہ اپنی مادری زبان میں سمجھتا ہے۔ کان یا آنکھ کے راستہ سے بظاہر آدمی کے اندر ٹیبل کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ مگر اردو کا ایک آدمی ٹیبل کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو میز میں تبدیل کرلے۔ اسی طرح انگریزی کا ایک آدمی جب میز کا لفظ سنتا ہے تو وہ اس کو صرف اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس کا ذہن اس کو ٹیبل کی صورت میں ڈھال لے۔ انسانی ذہن کے اندر ایک اجنبی زبان کا لفظ داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک حیرت ناک واقعہ ہوتا ہے۔ ذہن اس کو ایک انتہائی پیچیدہ نظام سے گزار کر پراسرار طور پر اس کو اپنی مادری زبان میں تبدیل کرلیتا ہے۔

یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتاتا ہے کہ مومن کا معاملہ اس دنیا میں کیا ہے۔ مومن اس دنیا میں اس طرح رہتا ہے کہ ہر چیز جو اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ فی الفور خدائی حقیقت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ باہر جو چیز ایک مادی واقعہ ہے وہ مومن کے ذہنی سانچہ میں آکر روحانی واقعہ بن جاتی ہے۔ ایک معاملہ جو باہر بظاہر انسانی معاملہ تھا وہ مومن کے ذہن میں داخل ہوتے ہی خدائی معاملہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ایک دنیوی چیز مومن کے ذہن میں پہنچ کر اخروی چیز کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ مومن کا ذہن ایک انتہائی پیچیدہ کارخانہ ہے جو ہر واقعہ کو ربانی واقعہ میں تبدیل کردیتا ہے۔

اس خدائی کارخانہ میں ہر وقت ایک عظیم عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے اندر ”خام مال“ داخل ہوتا ہے اور وہ ”تیار مال“ بن کر باہر آتا ہے۔ ایک بظاہر بے معنی چیز اس سے گزر کر ایک انتہائی بامعنی چیز کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ شخص مومن ہے جس کا وجود اس قسم کا ایک ربانی کارخانہ بن جائے۔

خدائی کارخانہ

سورج گویا قدرت کا ایک کارخانہ ہے جو مادہ کو روشنی میں تبدیل کرتا ہے۔ گائے ایک زندہ کارخانہ ہے جس میں گھاس داخل ہوتی ہے اور گوشت اور دودھ میں تبدیل ہوجاتی ہے اسی طرح درخت قدرت کا ایک کارخانہ ہے جس میں مٹی اور پانی اور گیس داخل ہوتے ہیں اور وہ پھول اور پھل میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔

یہ عمل جو سورج اور درخت اور جانور میں کامیابی کے ساتھ ہورہا ہے، یہی عمل انسان سے بھی اس کے خالق کو مطلوب ہے۔ فرق یہ ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں میں تبدیلی کا عمل قانون قدرت کے تحت مجبورانہ طور پر انجام پاتا ہے۔ اور انسان میں تبدیلی کا یہ عمل خود انسان کے اپنے ارادہ کے تحت اختیارانہ طور پر انجام دیا جاتا ہے۔ دوسری چیزوں میں تبدیلی مادی اعتبار سے ہورہی ہے اور انسان کے اندر خدائی اعتبار سے۔

انسان سے اس کے پیدا کرنے والے کو یہ مطلوب ہے کہ خارجی دنیا کے مشاہدات کو دلائل خداوندی میں تبدیل کرے۔ جو چیز اس کے اندر صرف بطور "معلومات" داخل ہوئی تھی اس کو اپنے ذہن میں "معرفت" کی صورت دے سکے۔ اس کو جب دنیا میں کوئی کامیابی حاصل ہوتو اس کو وہ تمام تر خدا کے خانہ میں ڈال دے۔ اس کو جب کوئی ناکامی ہوتو اس کے ذریعہ وہ عجز انسانی کی حقیقت کو دریافت کرے۔ اس کو جب کسی سے شکایت ہوتو اس کا اندرونی نظام اس کو معافی اور درگذر کی صورت میں تبدیل کردے۔ وغیرہ

جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل کرے اس کو زخیز زمین کہا جاتا ہے۔ اور جو زمین اپنی مٹی کو درخت کی صورت میں تبدیل نہ کرسکے وہ بنجر زمین کہلاتی ہے۔ یہی معاملہ انسانوں کا بھی ہے جو انسان اپنے اندرونی نظام کو اس طرح بیدار کرے کہ

وہ خام چیزوں کو اعلیٰ چیزوں میں تبدیل کرنے لگے وہ مومن ہے جس انسان کا اندرونی کارخانہ ایسا کرنے میں ناکام رہے وہ کافر ہے۔

زرخیز زمین اور بنجر زمین میں جو فرق ہے وہی فرق مومن اور غیر مومن کے درمیان پایا جاتا ہے۔زرخیز زمین کے حصہ میں شادابی آتی ہے اور بنجر زمین صرف اجاڑ پڑی رہتی ہے۔اسی طرح مومن انسان کے لیے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جنت ہے اور غیر مومن انسان کے لیے خدا کے یہاں ہمیشہ کی جہنم۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے اوپر زیادتی کرے اور تم صبر نہ کرسکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کرسکتے ہو جتنا اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کردو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہوگا: فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللهِ (42:40)۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پا کر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق

دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہوجاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اوراس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرلے تو اس کا یہ عمل کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پاسکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بینک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جاسکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائیگی سے انکار کردیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لیے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرلے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا جو چیک انسانی بینک میں کیش نہ ہوسکا وہ خدائی بینک میں کیش ہوگا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انہیں اسی دنیا میں کرائی جاچکی ہوگی: وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (47:6)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ — جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی

توفیق انہیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی: وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (2:25)۔حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جوآدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں: إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ إِلَيْكُمْ (حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، جلد 5، صفحہ 125)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اِسی دنیا سے ہوجاتا ہے۔جنتی انسان اپنی جنت کواسی دنیامیں پالیتا ہے۔گویا کہ جنت کا ایک مثنیٰ اسی دنیامیں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنیٰ کو پالیا ہو۔جنت کا یہ دنیوی مثنیٰ گویا نقدانعام ہے جواصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔یہ وہ شخص ہے جس نے دنیامیں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہوجو آخرت میں اس کوجنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔جس کے رونگٹے کھڑے ہوکراس کوخدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔جس کے قلب پرٹکڑے کردینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔جس نے بغض وانتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفوخداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقااپنے خادم کے اعتراف قصور پراس سے درگزر فرماتا ہے۔جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پرقابو پانے کے باوجود وہ اس کواس لیے چھوڑ دے کہ اس کا خدابھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔جوایک امرحق کے آگے اس طرح گرپڑے جیسےلوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کرڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کاایک پھول ہے۔وہ موجودہ دنیامیں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیامیں گزرجاتے ہیں جو

دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کرکے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کرکے کوئی شخص جنت کا۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خود روگھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک خودرو پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔وہ اصلی فصل کو بھر پور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خودرو پودوں کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کر دیں۔کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔اس لیے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نرائی (weeding) کا عمل کرتا ہے۔وہ ایک ایک خودرو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کردے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ نرائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے

اوراس کا دینی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "خودرو گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔اس خودرو گھاس کو جاننا اوراس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کیے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خوداعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خود روگھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھاجانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "خودرو گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہوجائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہوگئی ، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہوگئی۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اورماتحت کارکنوں کی تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے تو وہ ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے

معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس، اداروں اور ملی کاموں میں رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہہ میں اصل بات کچھ اور ہے یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں چھپی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے ۔غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (social status) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شاندار معاوضہ ملے گا۔ جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پر زور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ۔

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقتہً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہوجاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کرلیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لیے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہوجائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اوراس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اورہریالی کو ختم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا ہے جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض ،حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی ہے۔ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لیے کچھ نہ ہوگا جو اس کا سہارا بنے۔

زندہ قبرستان

میں اسپتال کے اندر کھڑا تھا۔میرے سامنے طرح طرح کے مریض تھے۔ہر مریض درد والم کی تصویر بنا ہوا تھا کسی کے ہاتھ میں تکلیف تھی اور کسی کے پاؤں میں۔کسی کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا،کسی کی پیٹھ حادثہ کا شکار ہوگئی تھی۔اسپتال کی دنیا کا ہر آدمی مصیبت زدہ تھا۔یہاں کا ہر باشندہ انسانی عجز کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔

میں نے سوچا" جسم کی کوئی ایک بات بگڑ جاتی ہے تو آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے۔پھر اس وقت آدمی کا کیا حال ہوگا جب کہ اس کی ساری بات بگڑ جائے گی۔جب انسان سے اس کی ہر وہ چیز چھن جائے گی جس کو وہ اپنی چیز سمجھ کر سرکشی کر رہا تھا"۔

پہلے زمانہ میں آدمی عبرت کے لیے قبرستان جاتا تھا۔اب اس کو عبرت کے لیے اسپتال جانا چاہیے۔قبرستان میں "مصیبت زدہ" زمین کے نیچے ہوتا ہے۔اور اسپتال میں مصیبت زدہ زمین کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔قبرستان میں عبرت کی چیز کو سوچ کر تصور میں لانا پڑتا

ہے۔اوراسپتال میں عبرت کی چیز بالکل زندہ حالات میں آنکھ کے سامنے موجود ہوتی ہے۔

اسپتال گویا زندہ قبرستان ہے۔اسپتال کی دنیا سراپا عبرت کی دنیا ہوتی ہے۔کوئی آدمی حادثہ کا شکار ہوکر یہاں آیا ہے۔کوئی سخت بیماری میں مبتلا ہے۔کسی کے جسم میں کوئی ضروری چیز کم ہوگئی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کراہ رہا ہے۔کوئی چیخ رہا ہے۔ غرض بےبسی و بے چارگی کے عبرت ناک مناظر ہیں جو اسپتال میں ہر طرف بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ مناظر اس لیے دکھائے جاتے ہیں کہ آدمی ان سے سبق لے۔وہ دوسروں کی تکلیف میں اپنی تکلیف کا عکس دیکھے۔وہ جزئی واقعہ میں کلی حقیقت کا مشاہدہ کرے۔وہ دنیا کے واقعہ میں آخرت کے واقعات کا احساس کرلے۔

ایسے مناظر ہر آدمی کے سامنے آتے ہیں۔مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان سے سبق لیتے ہوں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سبق لینے کے لیے غیر کی حالت کو اپنے اوپر طاری کرنا پڑتا ہے۔جو کچھ ابھی پیش نہیں آیا اس کا احساس اس طرح کرنا پڑتا ہے گویا کہ وہ پیش آچکا ہے۔یہ مستقبل کو حال کے اندر دیکھنا ہے اور کتنے لوگ ہیں جو مستقبل کو حال کے اندر دیکھنے والی نظر رکھتے ہوں۔

اسم اعظم کیا ہے

ایک بزرگ سے ان کے شاگردوں نے پوچھا کہ اللہ کا اسم اعظم کیا ہے۔بزرگ نے فرمایا: جب آدمی کا پیٹ غذا سے خالی ہو اور اس کا دل کینہ سے خالی ہو تو وہ اللہ کے ناموں میں سے جس نام سے بھی اپنے رب کو پکارے گا وہی اسم اعظم ہوگا (تذکرۃ الاولیاء)۔گویا اسم اعظم کا تعلق "اسم" سے نہیں بلکہ کیفیت سے ہے۔اسم اعظم وہ ہے جو اعلیٰ

کیفیات کے ساتھ زبان سے نکلے۔کیفیات کی عظمت کسی اسم کو اسمِ اعظم بناتی ہے نہ کہ حروف تہجی کی عظمت۔ پیٹ خالی ہونا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی مادیات کے غلبہ سے آزاد ہے اور دل میں کینہ نہ ہونا بتاتا ہے کہ آدمی اپنے سینہ میں کسی قسم کی نفسیاتی پیچیدگی لیے ہوئے نہیں ہے۔جب کوئی آدمی اپنے کو مادی رونقوں سے اور انسانی شکایتوں سے اوپر اٹھا لیتا ہے تو وہ خدا کے بہت قریب ہوجاتا ہے۔اس کو خدا کے خصوصی فیضان میں سے حصہ ملنے لگتا ہے۔ایسے وقت میں خدا کے صفاتی ناموں میں سے کوئی نام جب اس کی زبان پر آتا ہے تو وہ ربانی کیفیات میں نہایا ہوا ہوتا ہے۔ان کیفیات کے ساتھ جو بہتر نام آدمی کی زبان سے نکلے وہی اس کے لیے اسم اعظم ہے۔

کچھ لوگ اسلام کے معاملہ کو پاک کلمات کا ایک پراسرار معاملہ سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اسلام کے کچھ خاص عربی الفاظ ہیں جن میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں۔اگر کوئی شخص ان پاک الفاظ کو یاد کرلے اور زبان سے ان کو ادا کرے تو ان کی صرف ادائیگی سے کراماتی نتائج ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گے۔دنیا میں آل واولاد میں برکت ہوگی اور آخرت میں جنتی محل بننے لگیں گے۔ان کے نزدیک ان بابرکت کلمات میں سب سے زیادہ اونچا "اسم اعظم" ہے۔مگر یہ محض بے بنیاد خیال ہے جس کا کوئی ثبوت کتاب وسنت میں موجود نہیں۔

اسم اعظم حقیقۃً حروف کے کسی مجموعہ کا نام نہیں بلکہ کیفیات کے مجموعہ کا نام ہے۔اللہ کو جب کوئی بندہ اس طرح یاد کرتا ہے کہ وہ ہر دوسری چیز سے اپنا رخ موڑ کر صرف اس کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے۔وہ اللہ میں اپنے آپ کو اس طرح شامل کرتا ہے کہ انسانوں کے لیے اس کے دل میں خیرخواہی کے سوا کوئی اور جذبہ باقی نہیں رہتا تو اس وقت اس کی زبان سے اللہ کے لیے جو کلمات نکلتے ہیں، اسی کا نام اسم اعظم ہے۔اسی لیے

قرآن میں کہا گیا ہے ترجمہ: ”کہو کہ تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکاروگے تو اس کے سب نام اچھے ہیں“ (17:110)۔ اللہ خالق بھی اور مالک بھی وہ رحیم بھی ہے اور اکبر بھی۔ وہ سب کچھ ہے۔ جس برتر نام سے بھی آدمی اس کو پکارے وہ اس کے لیے جائز ہوگا۔ البتہ پکارنے والے کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ کبھی اس کے لیے ”اسم اعظم“ بن جاتا ہے۔ یہ پکارنے والے کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ اللہ کو اس کی صفتوں میں سے کسی صفت سے پکارنا کبھی سادہ اور عام حالت میں ہوتا ہے اور کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ خدا کا نام لیتے ہوئے آدمی کی شخصیت پھٹ پڑتی ہے۔ خدا کا نام لینا اس کی روح میں برپا ہونے والے طوفان کی آواز ہوتا ہے۔ اس طرح دل کے بھونچال کے ساتھ خدا کا نام لینا عام حالت میں اس کا نام لینے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ وہ اس کی زبان سے ادا ہونے والے اسم کو اسم اعظم بنا دیتا ہے۔ بندہ جب اللہ کی عظمتوں کے احساس سے سرشار ہو اور اس کی سرشاری زبان پر لفظ کی صورت میں ڈھل جائے تو یہی اللہ کو اسم اعظم کے ساتھ یاد کرنا ہے۔

جھوٹی دھوم

ٹائمس آف انڈیا (30 مئی 1985) میں ہندستانی شادیوں کے بارے میں ایک سبق آموز رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے: ہیلی کاپٹر بارات (Copter Barat)۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ سوائی مادھوپور کی مینا برادری میں خوش حالی کی علامت اب یہ بن گئی ہے کہ بارات دلہن کے گھر آئے تو ہیلی کاپٹر کے ذریعہ آئے، خواہ دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر تک کا فاصلہ 10 کلومیٹر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے پہلے شادیوں میں جہیز

اورتلک کی دھوم تھی۔اب اس سے آگے بڑھ کر بمبئی کی ایک فرم سے ہیلی کاپٹر کرایہ پر حاصل کیے جارہے ہیں۔

شادیوں میں ہیلی کارپٹر کا استعمال کیوں کیا جارہا ہے،اس کا جواب اخباری رپورٹر نے ان الفاظ میں دیا ہے:

The parents of the bride expect the barat to reach village with adequate pomp and show.

دلہن کے والدین امید کرتے ہیں کہ بارات ان کے گاؤں میں دھوم دھام کے ساتھ آئے۔

انسان سمجھتا ہے کہ اس کی سواری کسی دولہا یا کسی دلہن کے گھر اترنے والی ہے۔اس لیے وہ شان وشوکت کے ساتھ اپنی سواری لے جانے کا اہتمام کررہا ہے۔اگر انسان کو یہ معلوم ہو کہ اس کی سواری بالآخر جہاں پہنچنے والی ہے وہ مالک کائنات کی عدالت ہے تو انسان کی سوچ یکسر بدل جائے۔اس کو معلوم ہو کہ شان والی شادی اور بے شان والی شادی میں کوئی فرق نہیں۔

کوئی شخص اپنی قتل گاہ کی طرف دھوم مچاتا ہوا نہیں جاتا۔کوئی شخص ایک ایسی عدالت میں جشن کے ساتھ داخل نہیں ہوتا جہاں ایک بااختیار جج اس کے خلاف فیصلہ سنانے کے لیے بیٹھا ہوا ہو مگر اپنی آخری منزل کے بارے میں ہر آدمی اسی نادانی میں مبتلا ہے۔

کامیاب انسان وہ ہے جس کی سواری خدا کے یہاں باعزت طور پر اتاری جائے اور ناکام انسان وہ ہے جو خدا کے یہاں اس حال میں پہنچے کہ وہاں اس کی حیثیت ایک غیر مطلوب انسان کی ہو۔وہاں نہ کوئی اس کا استقبال کرنے والا ہو اور نہ کوئی اس کی خبر گیری کرنے والا۔

لطیف تجربات

الاصمعی عبدالملک بن قریب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں دیکھا کہ دو قبریں ہیں ، ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہوئی رو رہی ہے۔غم کی وجہ سے اس کا برا حال ہو رہا ہے۔میں قریب ہوا تو میں نے سنا کہ وہ ان الفاظ میں دعا کر رہی ہے:

اللَّهُمَّ إِنَّكَ لَمْ تَزَلْ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ، وَأَنْتَ الْكَائِنُ بَعْدَ كُلِّ شَيْءٍ، وَقَدْ خَلَقْتَ وَالِدَيَّ قَبْلِي وَخَلَقْتَنِي بَعْدَهُمَا مِنْهُمَا أَنِسْتَنِي بِقُرْبِهِمَا مَا شِئْتَ، ثُمَّ أَوْحَشْتَنِي مِنْهُمَا، إِذَا شِئْتَ، فَكُنْ لِي وَلَهُمَا مُؤْنِسًا، وَكُنْ لِي بَعْدَهُمَا حَافِظًا (ترتیب الآمالی الخمیسیۃ للشجری:1454) ۔یعنی، اے اللہ،تو ہی سب سے پہلے ہے اورتو ہی سب سے بعد ہے۔تو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے،اے میرے رب تو نے ہی میرے ماں باپ کو مجھ سے پہلے پیدا کیا،اس کے بعد ان دونوں سے مجھ کو پیدا کیا۔تو نے ان کے ساتھ مجھے سکون دیا جب تک تو نے چاہا اور پھر جب چاہا تو نے ان کو مجھ سے جدا کر دیا۔اے اللہ،تو مجھ پر اور ان دونوں پر رحم فرما اور ان کے بعد میری حفاظت فرما۔

اصمعی کا بیان ہے کہ اس لڑکی کے حسن کلام نے میری عقل کو مبہوت کر دیا۔میں نے اس سے کہا کہ اے بیٹی اپنے کلام کو پھر ایک بار دہراؤ۔یہ سن کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولی:اے شیخ،خدا کی قسم میں تمہاری بیوی نہیں کہ تم مجھ سے اس قدر بے تکلف ہو۔تم کو اپنے گھر والوں سے بے تکلف ہونا چاہیے۔اصمعی کہتے ہیں:خدا کی قسم میں یہ سن کر شرما گیا اور وہاں سے بھاگ آیا(ففررت واللہ عنھا حیاء منھا)۔

ایک معمولی لڑکی کے لیے یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ اتنے گہرے انداز میں دعا کرے۔اس کی وجہ وہ حادثہ تھا جو اس پر گزرا۔آدمی جب کسی جھٹکے سے دوچار ہوتا ہے تو اس کے اندر

چھپے ہوئے لطیف جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔وہ ایسی باتیں پالیتا ہے جو اس نے اس سے پہلے نہیں پائی تھی۔وہ ایسے الفاظ بولنے لگتا ہے جو اس سے پہلے کبھی اس کی زبان پر نہیں آئے تھے۔آدمی طبعی طور پر آسودگی کے حالات کو پسند کرتا ہے۔مگر آسودگی کسی آدمی کو صرف اس قیمت پر ملتی ہے کہ وہ ان ربانی تجربات سے محروم رہ جائے جو اس کی فطرت کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تھے۔

دعا

"میرے لیے بائیسکل خرید دیجیے" ایک غریب خاندان کے لڑکے نے اپنے باپ سے کہا۔ باپ کے لیے بائیسکل خریدنا مشکل تھا۔اس نے ٹال دیا۔لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔آخر کار ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں بائیسکل نہیں خریدوں گا۔آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا"۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھ میں آنسو آگئے۔وہ کچھ دیر تک چپ رہا۔اس کے بعد روتے ہوئے بولا " آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں" اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔اچانک اس کا انداز بدل گیا۔اس نے کہا "اچھا بیٹے، اطمینان رکھو۔ میں تم کو ضرور بائیسکل دوں گا" یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کر کے بیٹے کے لیے نئی بائیسکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔مگر یہ ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی۔جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو

ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سر پرست کے لیے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا وہ خود اس کے اپنے لیے تھی۔

یہ انسانی واقعہ خدائی واقعہ کی تمثیل ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سی دعا ہے جو لوٹائی نہیں جاتی۔ یہ وہ دعا ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین وآسمان بھی نہ کرسکیں۔جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔

یہ وہ لمحہ ہے جب کہ دعا محض زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہوجاتے ہیں۔ قادر مطلق عاجز مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

خدائی اخلاقیات

کائنات کی شاہراہ

انسان ایک کامل دنیا کے اندر غیر کامل وجود ہے۔ ستارے اور سیارے ، ہوا اور پانی ، درخت اور جانور سب ویسے ہی ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔ وہ فطرت کی مقرر شاہراہ سے نہیں ہٹتے۔ اس کے برعکس، انسان فطرت کی شاہراہ سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان ویسا بنتا ہے جیسا اسے نہیں بننا چاہیے۔ انسان وہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔

انسان کا یہ تضاد سوال بھی ہے اور اسی کے اندر اس کا جواب بھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے تمام مسائل کا سبب یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ سے ہٹ گیا ہے۔ اور اس کے تمام مسائل کا حل یہ ہے کہ وہ کائنات کی شاہراہ کو دوبارہ اختیار کر لے۔

فطرت کی جو شاہراہ بقیہ چیزوں کے لیے اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ان کو ایک معیاری دنیا میں ڈھال دے، وہی شاہراہ یقینی طور پر اس بات کی بھی ضمانت ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کو معیاری معاشرہ میں تبدیل کر سکے۔

ہماری غیر معیاری دنیا کے باہر جب ایک وسیع تر معیاری دنیا موجود ہے تو یقینی طور پر ہمارے لیے پہلا صحیح ترین انتخاب یہی ہوسکتا ہے کہ ہم اس دنیا کو سمجھیں اور اس کے اصولوں کو اپنی زندگی پر منطبق کریں۔

کائنات کے مطالعہ سے جو واضح ترین بات سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ پوری مادّی کائنات ایک متعین قانون فطرت میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مالیکیول سے پانی بننے کا جو اصول ہے وہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ مختلف عناصر کے امتزاج سے کیمیائی مرکبات ہمیشہ ایک ہی لگے بندھے اصول کے تحت بنتے ہیں۔ معدنیات کا پگھلنا اور پانی کا بھاپ بننا ہمیشہ ایک ہی معلوم قانون فطرت کے مطابق وقوع میں آتے ہیں۔ یہی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان

کے کردار کو اس حد تک معلوم اور متعین ہونا چاہیے کہ اس کی پیشین گوئی کی جا سکے۔ انسان کا کردار قابل پیشین گوئی کردار ہونا چاہیے، نہ یہ کہ خواہشات کے تحت وہ کبھی ایک قسم کے کردار کا مظاہرہ کرے اور کبھی دوسرے قسم کے کردار کا— اخلاقیات کا ایک ہی صحیح معیار ہے۔ انسان کے لیے بھی اور بقیہ کائنات کے لیے بھی۔

حسن سلوک

سماج میں جو لوگ بے سہارا ہو گئے ہوں ان کا سہارا بننا بہت بڑی عبادت ہے۔ ماں باپ آخری عمر کو پہنچ جائیں۔ ایک بچہ یتیم ہو گیا ہو۔ ایک شخص اپنے وطن سے دور سفر کی حالت میں کسی مشکل میں پھنس جائے۔ اس طرح کی دوسری صورتیں جب کہ آدمی کی ضروریات تمام تر دوسروں کے اوپر منحصر ہو جاتی ہیں، اس وقت کسی کی مدد کرنا، ایسے نازک وقتوں میں کسی کے کام آنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس کا بہت ثواب ہے۔ اس کی اہمیت قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی۔

اس طرح کے عمل کی اتنی افضلیت کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی عاجزانہ حیثیت کا عملی اقرار ہے۔ ہر انسان خدا کے سامنے کامل طور پر عاجز ہے۔ ہر آدمی کو خدا کے دئے سے ملتا ہے اور اسی کے چھیننے سے چھن جاتا ہے۔ اسی کی معرفت کا نام ایمان ہے اور اسی کو مراسم عبودیت کی شکل میں ادا کرنے کا نام پرستش ہے۔

لیکن آدمی اپنے ایمان اور اپنی عبادت میں سچا ہے یا نہیں، اس کی صحیح جانچ اس وقت ہوتی ہے جب کہ ایک کمزور اور بے سہارا انسان سے اس کا سابقہ پڑے۔ ایسے ہر موقع پر گویا ایک شخص ہمارے سامنے اسی حالت عجز میں لایا جاتا ہے جس حالت عجز میں خود ہم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اپنے جس احتیاج کی بنا پر ہم کسی خدا سے اپنے لیے مدد کے طلب

گار ہیں اسی احتیاج میں مبتلا ایک شخص ہمارے سامنے کر دیا جاتا ہے تاکہ ہم کسی استحقاق اور دباؤ کے بغیر اس کے ساتھ اچھا سلوک کر کے خدا سے کہیں کہ خدایا تو بھی ہمارے ساتھ بہتری کا معاملہ فرما جب کہ تیرے اوپر نہ ہمارا کوئی حق ہے اور نہ کوئی دباؤ۔

عاجز انسان کے ساتھ حسن سلوک دراصل خدا کے سامنے اپنی حیثیت عجز کا اقرار ہے۔ یہ اپنی دعا کو خدا کے آگے عمل کی صورت میں دہرانا ہے۔ یہ خدا کے سامنے اپنی بے یارومددگار حیثیت کی دریافت ہے ایک مومن جب کسی ایسے آدمی کو دیکھتا ہے تو اس کے روپ میں وہ خود اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں دیکھنے لگتا ہے۔

یہ ادراک اس کو تڑپا دیتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے اس بے سہارا آدمی کو وہ سب کچھ دے دے جو اس کے پاس ہے تاکہ وہ اپنے خدا سے وہ سب کچھ پا سکے جو خدا کے پاس ہے۔ دوسرے کی مدد کرنا گویا خدا سے یہ دعا کرنا ہے کہ خدایا تو بھی اسی طرح میری مدد کر۔

سرسبز درخت

درخت جب بلند ہو کر فضا میں اپنی شاخیں پھیلاتا ہے اور ایک ہرے بھرے وجود کی صورت میں زمین پر کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ دیکھنے والوں کی نظر میں کتنا حسین ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں ایک کامل وجود ہے۔ اس نے وہ سب کچھ پالیا ہے جو اسے پانا تھا، اس نے کائنات میں اپنے لیے وہ جگہ حاصل کرلی ہے جو اسے درکار تھی۔

اس کے برعکس، انسان کو دیکھیے تو انسان ایک محروم اور ناکام وجود نظر آتا ہے۔ یہاں پائے ہوئے لوگ بھی اندر سے خالی ہیں۔ کامیاب لوگ بھی مستقل طور پر ناکامی کے احساس سے دوچار ہیں۔ انسان اس کائنات کی اعلیٰ ترین مخلوق ہے۔ وہ دوسری تمام چیزوں سے برتر اوصاف اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا دوسری انواع سے پیچھے ہونا کس قدر عجیب ہے۔

ایک درخت کا دوسرے درخت سے کوئی ٹکراؤ نہیں، جب کہ ایک انسان دوسرے انسان سے لڑتا ہے۔ جس درخت سے جس پھل کی امید کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اپنی شاخ پر وہی نکالتا ہے۔ جب کہ انسان کا حال یہ ہے کہ اس سے جو امید کی جائے اس پر وہ پورا نہیں اترتا۔ درخت اپنے دشمن کو بھی سایہ دیتا ہے اور اپنے دوست کو بھی۔ جب کہ انسان اپنے دوست کے لیے کچھ ثابت ہوتا ہے اور غیر دوست کے لیے کچھ۔

اس فرق کا کوئی پراسرار سبب نہیں۔ اس کا سبب دونوں کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ درخت اور دوسری چیزیں اپنے خالق کے نقشہ پر قائم ہیں۔ اس کے برعکس، انسان اپنے خالق کے نقشہ پر قائم نہیں۔

یہ کائنات ایک مرکزی اور مجموعی نقشہ کے مطابق بنی ہے۔ یہاں امن وسکون اس مرکزی اور مجموعی نقشہ سے مطابقت کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کامیابی کائناتی منصوبہ سے ہم آہنگی کی قیمت ہے اور ناکامی اس سے ہم آہنگ نہ ہونے کی قیمت۔

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آتے ہیں وہ دراصل اسی خلا کو پر کرنے کے لیے آتے ہیں۔ پیغمبروں کی تعلیمات یہ بتاتی ہیں کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو کائنات کی مجموعی اسکیم سے ہم آہنگ کرے۔ وہ کس اسلوب حیات کو اختیار کرے کہ وہ بھی خدا کی دنیا میں ایک "ہرا بھرا درخت" بن کر کھڑا ہوسکے۔

چڑیا اور انسان

سالم علی (1896-1987) چڑیوں کے مطالعہ کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ ابھی وہ صرف دس سال کے تھے کہ انہیں چڑیوں کے مطالعہ سے دلچسپی ہوگئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اس طرح گذارا ہے کہ ہاتھ میں دوربین ہے۔ ایک کندھے سے کیمرہ لٹک رہا ہے اور چڑیوں کے مشاہدہ اور مطالعہ میں مصروف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں

نے اس سلسلے میں جو اہرلال نہرو سے بھی زیادہ سفر کیے۔ حتیٰ کہ لوگ انہیں چڑیا والا (Birdman) کہنے لگے۔ اس فن میں مہارت کی وجہ سے ان کو بہت سے ملکی اور غیر ملکی انعامات مل چکے ہیں۔

ہندستان میں دو ہزار سے زیادہ اقسام کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ سالم علی نے ان کا مطالعہ کر کے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام (*The Handbook of Indian Birds*) ہے۔ یہ کتاب انھوں نے 20 سال کے مطالعہ کے بعد لکھی۔

ایک اخبار کا نمائندہ بمبئی میں ان کے مکان پر ان سے ملا۔ اس نے سالم علی کو نہایت شریف اور مہذب انسان پایا۔ اس کا خیال ہے کہ سالم علی میں یہ غیر معمولی شرافت چڑیوں کے مطالعہ سے آئی ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، 25 ستمبر 1983) میں لکھا کہ انسان کو زیادہ انسانیت والا بنانے کے لیے غالباً یہ تجویز کیا جانا چاہیے کہ چڑیوں کے مطالعہ کو داخل نصاب کر دیا جائے:

> Perhaps a course in bird-watching should be recommended to make men more human.

دنیا میں بے شمار قسم کی چڑیاں اور جانور پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ کا انسان ان کے بارے میں بہت کم جانتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں زمین پر پائے جانے والے مختلف جانوروں کا وسیع مطالعہ کیا گیا ہے اور ان سے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں۔ جانوروں کے طرز زندگی سے انسان کو باخبر کرنے کے لیے آج کل مختلف ذریعہ اختیار کیے گئے ہیں۔ جانور کے کھلے پارک اور چڑیا گر قائم کرنے کا مقصد یہ بھی ہے۔ حتیٰ کہ اب بہت سی یونیورسٹیوں میں جنگلی جانوروں کی زندگی کے مضامین باقاعدہ نصاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ جانوروں میں انسان کے لیے بہتر نمونے موجود ہیں۔ ہر جانور نہایت صحیح فطری زندگی گذارتا ہے۔ جب کہ انسان بار بار فطرت کے راستہ سے ہٹ جاتا ہے۔ انسان اگر جانوروں کی تقلید کرے تو یہی اس کی نجات کے لیے کافی ہو جائے۔

جنت صبر کے اُس پار ہے

صالح سماج بنانے کا سارادارومدار اس چھوٹی سی بات پر ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ اس طرح رہے کہ دونوں اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

جس چیز کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے وہ کسی قسم کے سیاسی اکھیڑ پچھاڑ سے وجود میں نہیں آتا۔ اور نہ گولی اور پھانسی کی منطق سے اس کو برپا کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے اسلامی نظام قائم کرنے کا اعلان کرتے ہیں، وہ یقینی طور پر یا تو غیر سنجیدہ ہیں یا مجنون ہیں۔

اسلامی نظام یا اسلامی سماج اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی انسانی مجموعہ کی قابل لحاظ تعداد میں یہ مزاج پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر زندگی گزارنے لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر جینا جانتے ہوں۔ جو اپنے خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کر دینے کی طاقت رکھتے ہوں۔ جو اپنی غلطی کو فوراً محسوس کر لیں اور اس کا اعتراف کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے خود ذمہ داری قبول کرلیں۔ جو غلط فہمی کے مواقع پر خوش فہمی سے کام لینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جو کسی انسان کو اس کے "آج" کے بجائے اس کے "کل" کے لحاظ سے دیکھ سکیں۔

یہ سب کچھ ٹھنڈے طریقہ سے نہیں ہوتا۔ اس کے لیے آدمی کو برداشت کی تلخیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ الفاظ رکھتے ہوئے آدمی نہ بولے۔ وہ ہر وار کو اپنے اوپر سہے۔ وہ اپنے سینہ کو دبے ہوئے جذبات کا قبرستان بنادے۔ مختصر یہ ہے کہ اپنے تمام حقوق کو وہ آخرت کے خانہ میں ڈال دے اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو دنیا کے خانہ میں۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جہنم کو لذتوں سے ڈھانک دیا گیا ہے اور جنت کو

ناخوش گواریوں سے ڈھانک دیا گیا: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ ،وَحُجِبَتِ الجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6487)۔ جو آدمی اپنے جی کی راہ پر بے روک ٹوک چلے وہ سیدھا جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔اس کے برعکس، جو شخص جنت میں اپنی جگہ لینا چاہے اس کو اپنی خواہشات پر روک لگانا ہوگا۔اپنے اٹھنے والے محرکات کو دبانا ہوگا۔ ناپسندیدہ باتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا،خواہ ان کا پورا کرنا اس کے لیے کتنا ہی تلخ ہو۔حقیقت یہ ہے کہ جنت صبر کے اُس پار ہے،اگرچہ لوگ اپنی نادانی سے اس کو بےصبری کے اُس پار سمجھ لیتے ہیں۔

عمل کا فرق

ایک ایسا کمپیوٹر بنایا جاسکتا ہے جو اپنی صورت کے اعتبار سے بالکل انسان کی طرح دکھائی دیتا ہو۔اس سے آپ کہیں کہ "پانی لاؤ" اور وہ چل کر مقررہ مقام پر جائے اور وہاں سے پانی کا گلاس لاکر آپ کو پیش کردے۔مگر کمپیوٹر کے اس عمل پر اس کے لیے کوئی جزا نہیں ہے۔

دوسری طرف ایک انسان ہے۔اس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ پیاس سے بیتاب ہے۔اس کی حالت دیکھ کر اسے رحم آ گیا۔وہ روانہ ہوا کہ ٹھنڈا پانی لا کر اس پیاسے آدمی کو پلائے۔اس وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔اس کی زبان سے نکلا: خدایا تو اس دن مجھے ٹھنڈا پانی پلا جس دن تیرے سوا کسی کے پاس پانی نہیں ہوگا۔اس دن مجھ کو اپنے سایہ میں لے لے جس دن تیرے سوا کسی کے لیے سایہ نہ ہوگا۔اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لیا اور اس کو لے کر پیاسے کے پاس اس حال میں آیا کہ ایک طرف بھرے ہوئے پانی سے گلاس چھلک رہا تھا۔اور دوسری طرف خدا کے خوف سے آنسوؤں کا

طوفان اس کی آنکھوں میں امڈ رہا تھا۔عین ممکن ہے کہ آدمی کا یہ عمل اللہ کو اتنا زیادہ پسند آجائے کہ اس عمل پر اس کی بخشش ہوجائے۔

کمپیوٹر اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔جو کام انسان نے کیا وہی کام کمپیوٹر نے بھی کیا۔مگر انسان کو ایک گلاس پانی کے بدلے جنت دے دی گئی۔جب کہ کمپیوٹر کو اسی قسم کے ایک گلاس پانی پر کوئی انعام نہیں ملا۔اس کی وجہ جذبہ کا فرق ہے۔کمپیوٹر کا عمل بے شعوری کی سطح پر تھا اور انسان کا عمل شعور کی سطح پر۔کمپیوٹر نے بے حسی کے تحت اپنا کام انجام دیا اور انسان نے احساس کے تحت۔اسی فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک کو اپنے کام پر کوئی جزا نہیں ملی اور دوسرے کو اسی عمل پر ابدی جنت لکھ دی گئی۔

یہی وہ فرق ہے جس کو شریعت میں قساوت اور احتساب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قساوت کا مطلب ہے بے حسی۔اس سے مراد وہ عمل ہے جو محض ظاہری اعضاء سے انجام دیا جائے،جس میں انسان کی اپنی نفسیات شامل نہ ہو۔اس کے مقابلہ میں احتساب کا مطلب ہے اللہ کی رضا کو سامنے رکھ کر کوئی کام کرنا۔

قساوت اور احتساب کا یہ فرق تمام معاملات میں ہے۔کوئی بھی دینی عمل اللہ کے یہاں اسی وقت مقبول ہوتا ہے جب کہ وہ حساسیت کی سطح پر انجام دیا گیا ہو،بے حسی کی سطح پر کیا ہوا عمل ایک قسم کا مشینی عمل ہے اور مشینی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب نہیں۔

پلاسٹک کے پھل اور پھول

آجکل پلاسٹک کے پھول اور پھل بنتے ہیں۔دیکھنے میں بالکل پھول اور پھل کی طرح معلوم ہوں گے لیکن سونگھئے تو اس میں پھول کی خوشبو نہیں اور منہ میں ڈالیے تو اس

میں پھل کا مزہ نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں دین داری کی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے۔ بظاہر اس میں دھوم کی حد تک دین دکھائی دے گا۔ لیکن قریب سے تجربہ کیجئے تو وہی چیز موجود نہ ہوگی جو دین کا اصل خلاصہ ہے: اللہ کا ڈر اور انسان کا درد — پلاسٹک کے دور میں شاید دین داری بھی پلاسٹک کی دین داری بن کر رہ گئی ہے۔

لوگ دین دار ہیں مگر کوئی شخص اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کوئی شخص اللہ کی خاطر اپنی اکڑ ختم کرنا نہیں جانتا۔ ذاتی فائدہ کی خاطر بے شمار لوگ اپنے اختلاف اور شکایت کو بھول کر دوسروں سے جڑے ہوئے ہیں مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کے لیے اپنے اختلاف وشکایت کو بھول کر دوسروں سے جُڑ جائے۔

دین اصلاً اس کا نام ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پا جائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ حقیقت اتنی سنگین ہے کہ اگر وہ فی الواقع کسی کے دل ودماغ میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں انتہائی حساس ہو جاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں اور ان تمام چیزوں کا انتہائی مشتاق ہو جاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی ہستی کو خدا کی عظیم تر ہستی میں کھو دیتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے بدخواہی کرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کو سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم

کے فرشتوں کی فوج لیے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں محض ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا اپنے تمام فرشتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

دونوں ایک سطح پر

31 مارچ 1981 کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی "صدر امریکا پر قاتلانہ حملہ"۔ ایک نوجوان نے خود کار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کیے۔ ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی۔

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے۔ فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر 1980 کے الیکشن میں امریکا کے صدر منتخب ہوگئے۔ گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left.

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس، 1 اپریل 1981)۔ دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (1955) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (1962) سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا:

Now you'll know who I am (*Hindustan Times*, April 2, 1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں۔اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکا پر قاتلانہ حملہ کیا۔اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کرلیا۔صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کرلی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے۔دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا۔ایک شخص نام ونمود کے لیے دین کا علم بردار بنے، دوسرا شخص نام ونمود کے لیے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے۔

جانور سے بدتر

شیخ سعدی نے کہا تھا "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔اور خدا کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو خدا سے نہیں ڈرتا"۔اسی بات کو شیکسپیئر نے ایک اور انداز سے اس طرح کہا ہے — "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے میں بزدل کی طرح ڈرتا ہوں"۔

اس دنیا میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔آگ کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تبھی وہ آپ کو جلائے گی۔اگر آپ اپنے ہاتھ کو اس سے دور رکھیں تو وہ ایسا نہیں کرے گی کہ وہ کود کر آپ کے ہاتھ پر آ گرے۔یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے حتیٰ کہ موذی جانوروں کے بارے میں بھی ہم کو پیشگی طور پر معلوم ہے کہ

وہ یک طرفہ طور پر کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ان کا حملہ ہمیشہ دفاعی ہوتا ہے نہ کہ جارحانہ۔

اس کا مطلب ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدہ کے تحت کام کر رہی ہے اوراس قاعدہ کی رعایت کر کے آپ اس کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔مگر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے عمل کا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے اور جس وقت جو چاہے کرسکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو یک طرفہ طور پر دوسرے کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو کسی واقعی سبب کے بغیر دوسرے کے اوپر حملہ کرتا ہے۔انسان کے حرص اورانتقام کی کوئی حد نہیں۔آپ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں اور محض ذاتی محنت کی بنیاد پر ترقی کریں تب بھی آپ محفوظ نہیں۔ کیونکہ دوسروں کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہوگااوروہ آپ کو گرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔انسان لامحدود طور پر اپنی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے اور بے حساب حدتک دوسرے کو برباد کرکے اس کی بربادی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی بدترین موذی جانور بھی اس کو نہیں جانتا کہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنائے۔وہ کسی کو نیچا دکھا کر اپنے غرور کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرے۔کسی کو خواہ مخواہ مصیبتوں میں پھنسا کر اس کی پریشانی کا تماشا دیکھے۔ یہ صرف انسان ہے جو ایسا کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔مگر انسان اپنی نادانی سے اپنے آپ کو اسفل سافلین کی پستی میں گرالیتا ہے۔

امتحان کا کام

کالج میں امتحان ہورہا تھا۔ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا

آیا۔اس کے بعد وہ لائبریری پہنچا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہوتو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہوگا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کرسکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کرر ہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کیے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھار ہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمہ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کررہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے فضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم وفساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کے حامی ثابت کرنے لگے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب علم کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذ ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لیے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جا رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے اٹل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا، مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے، وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس

نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا، مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لیے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

دنیا کی خاطر عمل کرنے والے

لوگ خوش اخلاق ہیں۔ وہ ہدیے دیتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کام آنے کے لیے دوڑتے ہیں۔ وہ دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بناتے ہیں۔ وہ غمی کے موقع پر اظہار درد کے لیے پہنچتے ہیں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ وہ اختلاف کے باوجود اختلاف کو بھول جاتے ہیں اور شکایت کے باوجود شکایت کو پی جاتے ہیں۔

لوگ خوش ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ویسے ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہیے۔

مگر لوگوں کی یہ خوش معاملگی کس کے ساتھ ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ جن سے انہیں امید ہے کہ وہ وقت پر ان کے کام آسکتے ہیں۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ جن کے زور قوت کا رعب ان کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ جن سے کٹ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے کٹ جائیں گے، جن سے جڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے جُڑے رہیں گے۔

لوگوں کی یہ خوش اخلاقی تمام تر مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت معلوم ہوجاتا ہے جب کہ معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لیے مذکورہ محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر اچانک وہی آدمی بالکل بد اخلاق بن جاتا ہے جو اس سے پہلے نہایت خوش اخلاق دکھائی دے رہا تھا۔

اب اس کو یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اب وہ اپنی دعوتوں میں اس کو بلانا بھول جاتا ہے۔ اب وہ اس کی مشکلوں میں کام آنے کے لیے نہیں دوڑتا۔ اب وہ معمولی شکایت پر بگڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے جذبات کی رعایت کرے۔ دنیوی فائدہ کے لیے اخلاق دکھانے والا آدمی اس وقت بے اخلاق ہوجاتا ہے جب کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

لوگوں کو جاننا چاہیے کہ اس قسم کی خوش اخلاق اور انسانیت کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ وہ کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے والی نہیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں آدمی کے اندر پائی جارہی ہو۔ خدا کے ہاں جو کچھ بدلہ ہے صرف اس عمل کا ہے جو خالص خدا کی رضا اور آخرت کی نجات کے لیے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل دنیا میں اپنا معاملہ درست رکھنے کے لیے کیا جائے اس کا خدا کے یہاں کوئی بدلہ نہیں۔ ایسے اعمال لے کر خدا کے یہاں پہنچنے والوں سے خدا کہہ دے گا — تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی دنیا کے لیے کیا۔ تم دنیا میں اس کا بدلہ پاچکے۔ اب آخرت میں تمہارے لیے اس کے بدلے میں کچھ نہیں۔

شکار کرنے والے

کرنل جے پال نے اپنی شکاری یادداشتوں پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے عظیم شکار:

Great Hunt, Lt. Col. Jaipal, Carlton Press. New York 1982.

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک شکاری تھا، وہ شیر کو گولی مار کر ہلاک کرنے سے خاص دل چسپی رکھتا تھا، تاہم اپنے اس قاتلانہ فعل کے لیے اس کے پاس ایک خوبصورت توجیہ تھی۔ "میں گاؤں والوں کو مردم خور شیروں سے بچانے کے لیے ان کا شکار کرتا ہوں" اسی طرح اکثر شکاریوں کے پاس اپنے وحشیانہ کھیل کی خوبصورت تاویلات موجود ہوتی ہیں۔ مگر کرنل جے پال کو اس قسم کی فرضی توجیہات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرلیا ہے جس کو دوسرے لوگ صفائی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔

کرنل جے پال کے لیے گھڑیال کو مارنا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا تھا جب کہ میں گھڑیال کے پیچھے رینگ کر چلتا۔ پھر کبھی گھڑیال چھپ سے پانی میں کود پڑتا۔ اور جب اس کو گولی لگتی تو وہ عجیب طریقے سے اپنی دم پٹکتا اور اپنا منہ کھول دیتا۔ یہ سب چیزیں مجھ کو بڑی عجیب قسم کی پُر جوش مسرت دیتی تھیں:

All this gave me quite a lot of thrills.

انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے کی گھات میں لگے۔ وہ دوسرے کو ستانے کے منصوبے بنائے اور جب دوسرے کو ستانے میں کامیاب ہو جائے تو اپنی کامیابی پر خوشی کے قہقہے لگائے۔ یہی مزاج انسان کے امتحان کا اصل پرچہ ہے۔ جو اپنے اس مزاج سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کا شکار کرنے لگے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اپنے اس مزاج پر قابو پالے اور دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے رحمت بنا ہوا ہو وہی وہ شخص ہے جس کے لیے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

دو قسم کے انسان

قرآن میں ہے کہ ہر جی اپنے کیے میں پھنسا ہوا ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (74:38)۔ لوگ خود اپنے کیے کے حوالے کر دیے جائیں گے: أُولَئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا (6:70)۔ قیامت میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے: ذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ (39:24)۔ یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ یہ تمہارا اپنا کیا ہے جو تمہاری طرف لوٹایا جائے گا: إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ إِلَيْكُمْ (حیاۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، جلد 5، صفحہ 125)۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ایک انڈسٹری (کارخانہ) ہے۔ مومن خدا کی انڈسٹری ہے اور غیر مومن شیطان کی انڈسٹری۔ ہر آدمی جو کچھ ہے اس کے مطابق وہ اپنی پیداوار کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ خدا کے علم کے مطابق آدمی جب اپنے حصہ کا کام کر چکا ہوتا ہے تو اس پر موت آجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی اگلی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ ابدی طور پر اپنی اگائی ہوئی فصل کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جس نے کانٹوں کی فصل اگائی تھی وہ اپنے آپ کو کانٹوں میں پھنسا ہوا پاتا ہے اور جس نے پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی وہ پھول اور خوشبو والے باغوں میں ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔

انڈسٹری کیا ہے۔ انڈسٹری وہ نظام ہے جس کے اندر خام مال ڈالا جائے اور پھر وہ تیار شدہ سامان کی صورت میں برآمدہ ہو۔ ایک انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کا ردعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے خدا کے راستہ میں اس کا استعمال ڈھونڈ نکالا۔ اس کو مواقع ملے تو وہ ان مواقع میں اپنے آپ کو خدا کی خاطر دفن کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لیے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔ یہ

وہ شخص ہے جس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس نے اپنے اندر خدا کی انڈسٹری قائم کی تھی۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی انڈسٹری سے صرف زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس کو اس نے اپنی نمود ونمائش میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کو کسی سے اختلاف ہوا تو اس کو اس نے زہریلے کلام اور آتشیں عمل کا مزہ چکھایا۔ اس سے جب کسی کا معاملہ پڑا تو اس کو اس سے خود غرضی، بے انصافی اور دھاندلی کا تجربہ ہوا۔

ایسا آدمی گویا اپنے اندر شیطان کی انڈسٹری قائم کیے ہوئے ہے۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر اور آگ اور بدبو بن کر اس کے باہر آتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیر لے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا — 6500 ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔تاہم بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرالیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منہ میں ڈالا اور نگل لیا۔پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کرلیا گیا (ہندستان ٹائمس، 5 نومبر 1981ء)۔

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہو سکا۔وہ مجبور ہو گیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دباتا ہے، وہ کسی کو وہ کلمہ اعتراف دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو از روئے واقعہ سے دینا چاہیے۔ یہ سب کر کے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپالیتا ہے۔مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔موت ہر آدمی کے لیے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لیے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

یہ جہنمی قافلے

"ہر آدمی جنت کی تلاش میں ہے مگر ہر آدمی اپنی جنت کو دوزخ میں تلاش کر رہا ہے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا "لوگ کانٹوں میں پھول کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کو کھنڈر کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت جلد ان کے لیے ایک شان دار محل کھڑا ہونے والا ہے"۔

ہر آدمی اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی تجارت اور ملازمت کے میدان میں محنت کر رہا ہے۔ کوئی قیادت کے میدان میں اپنا نام اونچا کرنے کے لیے سرگرم ہے۔ کسی کا دماغ خوبصورت الفاظ کا کارخانہ بنا ہوا ہے تاکہ وہ عوام کی بھیڑ کو زیادہ اپنے گرد جمع کر سکے۔ ہر آدمی اپنے ذہن میں اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب لیے ہوئے ہے اور ہر آدمی اپنے خواب کو واقعہ بنانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر لوگوں سے قریب ہو کر ان کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کو حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے پاس عملِ غیر صالح کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔

آدمی اپنے رشتہ داروں کے حقوق سے بے پروا ہو کر اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دکھ پہنچا کر دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کرکے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا میں انسان کے لیے وہ سب کچھ رکھا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر اچھی چیز کو پانے کا ذریعہ اچھا عمل ہے — خدا کا انعام ان

لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کے اوپر اپنی زندگیوں کو اٹھائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لیے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

دوسرے درجہ پر

آئن سرویوچ تورجنیف (1818-1883) روس کا مشہور ناول نگار ہے۔ اس کے ایک دوست نے ایک بار اس کو لکھا: "میرے نزدیک اپنے آپ کو ہمیشہ دوم درجہ میں رکھنے پر رضامند کر لینے ہی میں زندگی کی ساری اہمیت پوشیدہ ہے" یہ بات صد فی صد درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام اجتماعی اور قومی برائیاں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں دوم درجہ پر رکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ہر ایک اپنے آپ کو اول درجہ پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جہاں ہر شخص اور ہر قوم اپنے کو اول درجہ پر رکھنا چاہے وہاں لازماً یہی ہوگا کہ باہمی ٹکراؤ ہو، اور کوئی دوسرے کا خیر خواہ نہ رہے۔

انسانیت کے اکثر فلسفے اسی بنیادی فکر کے گرد گھومتے ہیں۔ سماجی مفکرین کی کوششوں

کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے سامنے کچھ ایسے اعلیٰ معیار رکھ دئے جائیں جن کو آدمی ہر حال میں اپنے سے بالاتر سمجھے، وہ اپنی ذات کو مرکز بنانے کے بجائے ان معیاری قدروں کو اپنے فکر وتوجہ کا مرکز بنا لے۔ مگر عملاً کوئی فلسفی اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز کو بھی انھوں نے اس حیثیت سے دریافت کیا کہ وہ انسان کی توجہات کا مرکز اول بنے (مثلاً امن، محبت، خیر خواہی) وہ خود انسان کی اپنی تخلیق تھی۔ انسانی ذہن کے باہر ان کا کوئی ذاتی وجود نہ تھا۔ پھر اپنے تخلیق کیے ہوئے معبود کے بارے میں کوئی شخص سنجیدہ ہوتا تو کیوں ہوتا۔

اس مسئلہ کا واحد حل خدا کا عقیدہ ہے۔ خدا ایک حقیقی وجود ہے۔ وہ ہمارا خالق اور مالک ہے۔ وہ آج بھی ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے سارے عالم کو اپنے قبضہ میں لیے ہوئے ہے۔ تمام چیزیں مکمل طور پر اس کی محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ ایسے خدا کو ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں آدمی اپنے آپ کو "دوسرے درجہ" پر رکھ رہا ہے۔ وہ خدا کو ہر اعتبار سے اول حیثیت دے کر خود ہر اعتبار سے دوسری حیثیت پر راضی ہو گیا ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ خیال پوری طرح بیٹھ جائے، جو اپنے سارے دل ودماغ کے ساتھ خدا کے مقابلہ میں اپنے کو دوسرے درجہ کی حیثیت دینے پر راضی ہو جائے۔ وہ عین وہی انسان بن جاتا ہے جس کو تمام دنیا کے مفکرین تلاش کر رہے ہیں مگر وہ اس کو کہیں نہیں پاتے۔

انسان کی نفسیات ایک بسیط شے ہے۔ نفسیات میں تقسیم ممکن نہیں۔ اگر کسی کی نفسیات حقیقی معنوں میں یہ بن جائے کہ اس کائنات میں وہ خدا کے مقابلہ میں "دوسرے درجہ" پر ہے تو انسانوں کے مقابلہ میں بھی اس کے اندر یہی مزاج بنے گا۔ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کہ اس کائنات میں وہ دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس سے "اول درجہ" والا بننے کا احساس چھین لے گا۔ اس کی انانیت بے نفسی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس کی سرکشی تواضع

کی صورت اختیار کرلے گی۔اس کی ڈھٹائی اعتراف کے روپ میں ڈھل جائے گی۔اوریہی وہ اوصاف ہیں جو بہتر سماج بناتے ہیں۔جہاں لوگوں کے اندر یہ مزاج آجائے وہاں نہ انفرادی جھگڑوں کا کوئی وجود ہوگا اور نہ قومی جھگڑوں کا۔

دو قسم کی غذائیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لیے آیا ہے کہ وہ پاک چیزوں کو جائز بتائے اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے: وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (7:157) گویا ایمان سے آدمی کے اندر ایسی روح پیدا ہوتی ہے جو خبیث چیزوں کو قبول نہ کرے، وہ صرف طیب چیزوں کو اپنی غذا بنائے۔اس کے برعکس، غیر مومن وہ ہے جو خبیث چیزوں پر جی رہا ہو اور طیب چیزیں اس کی روح کی غذا نہ بنتی ہوں۔

جانوروں میں دو قسم کے جانور ہوتے ہیں۔ایک وہ جو مردار اور غلیظ چیزیں تلاش کر کے کھاتے ہیں۔دوسرے وہ جو ستھری غذاؤں سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک وہ جو خبیث جذبات پر جیتے ہیں۔دوسرے وہ جو طیب جذبات پر پرورش پاتے ہیں۔ایک انسان وہ ہے جو نفرت اور عداوت میں جی رہا ہے۔جو ذاتی نمائش اور شخصی مصالح کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے۔جس کی روح کو اس سے غذا ملتی ہے کہ وہ حق کا اعتراف نہ کرے۔جس کے قلب و دماغ کو انانیت،خود پرستی ،اظہار برتری سے خوراک ملتی ہے۔وہ کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کرتا ہے اور پھر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے—ایسے لوگ خدا کی دنیا میں طیب خوراک کو چھوڑ کر خبیث خوراک پر جی رہے ہیں۔

دوسرا انسان وہ ہے جو قلب سلیم کے ساتھ جی رہا ہے۔اس کی روح دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔وہ دوسرے پر قابو یافتہ ہو کر بھی اس کو چھوڑ دینے میں راحت محسوس کرتا

ہے۔اس کا دل دوسروں کے لیے خیر خواہی اور محبت کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔اس کی ہستی کو عجز اور تواضع میں لذت ملتی ہے۔وہ خدا اور آخرت کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ اختلاف کے وقت اپنے کو جھکا لینے میں اس کو سکون ملتا ہے۔جب کوئی اس پر تنقید کرتا ہے تو تنقید کو قبول کر لینے میں اس کا دل ٹھیراؤ پاتا ہے۔کسی کا حق اس کے ذمہ ہو تو جب تک وہ اس کا حق ادا نہ کر لے تو اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی — ایسے لوگ خدا کی دنیا سے اس کی طیب خوراک لے رہے ہیں اور اس کی خبیث خوراک سے اپنے کو بچائے ہوئے ہیں۔

دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں بار بار غیر معمولی حالات آتے ہیں، کبھی کسی سے معاملہ پڑنے کی صورت میں، کبھی کسی سے شکایت پیدا ہوجانے کی صورت میں۔یہ غیر معمولی مواقع وہ غیر معمولی لمحات ہیں جب کہ خدا دونوں قسم کی روحوں کو چھانٹتا ہے تاکہ ایک کے لیے جنت کا اور دوسرے کے لیے جہنم کا فیصلہ کرے۔جنت پاک روحوں کی آبادی ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جنھوں نے دنیا کی جانچ میں تواضع اور انصاف کا ثبوت دیا اور جہنم ناپاک روحوں کا جیل خانہ ہے جہاں وہ لوگ داخل کیے جائیں گے جو معاملہ کے وقت بے انصاف ہوگئے اور خدا کے دئے ہوئے وسائل کو اس لیے خرچ کیا تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی متکبرانہ نفسیات کی تسکین حاصل کریں۔جنتی اخلاقیات کے لوگ جنت میں ہوں گے اور جہنمی اخلاقیات کے لوگ جہنم میں۔

خدا کی قدرت

ابو العلاء المعری کا ایک شعر ہے:

تَبَارَکتْ أَمْوَاهُ البِلَادِ بِأَسْرِهَا عِذَابٌ وَخُصَّتْ بِالمُلُوحَةِ زَمْزَمُ

”خدایا تیری برکت، دنیا کی تمام نہریں میٹھا پانی لے کر بہہ رہی ہیں اور زمزم ہی کو خاص طور پر کھاری بنا دیا گیا“ (الدر الفرید وبیت القصید: 6303)۔

یہ تمثیل کے انداز میں گہری حقیقت کا اظہار ہے۔دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تمام سطحی چیزیں مزہ دار ہیں اور تمام گہری چیزیں بے مزہ ہیں۔ اگر آپ کو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا ہو تو آپ کو غصہ اور نفرت کا کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا جب کہ تنگ ظرفی کے لیے اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ آدمی کے اندر جو تلخی یا کڑواہٹ پیدا ہو وہ اس کو دوسرے کے اوپر انڈیل دے۔اگر آپ کو کوئی حقیقی کام کرنا ہو تو آپ کو بااصول آدمی بننے کی سختی برداشت کرنی ہوگی ، جب کہ بے مقصد انسان بن کر جینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جہاں جیسا موقع ہو وہاں اسی روش کا مظاہرہ کر دیا جائے۔اگر آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جینا ہے تو پوری زندگی پر طرح طرح کی روک لگانی پڑے گی، جب کہ بے مقصد زندگی گزارنے کے لیے صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔

آزادی کے بعد ہندستان کی جو پہلی منتخب پارلیمنٹ بنی اس کے ممبر پروفیسر ہیرینددر ناتھ مکھرجی (1907-2004) تھے۔پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں شرکت کے بعد جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان پر ایک عجیب کیفیت گزری۔تیز رفتار ٹرین کی فرسٹ کلاس بوگی ان کو لیے ہوئے دہلی کے جنوبی علاقہ سے گزر رہی تھی۔انھوں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے کنارے جھگی جھونپڑیوں اور گندے محلّوں کا سلسلہ ہے جو دور تک چلا گیا ہے۔ان کو یہ سوچ کر سخت صدمہ ہوا کہ آزادی کے انقلاب نے چند خوش قسمت لوگوں کو تو بہت کچھ دیا ہے مگر کروڑوں عوام کے لیے اس انقلاب کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔کلکتہ پہنچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا جس میں اپنے مذکورہ تاثر کا ذکر کرتے ہوئے یہ درج تھا کہ جب میں دہلی کی ان غریب بستیوں سے گزرا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ تمھاری آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میرے پاس اس کا کیا جواب

ہوگا۔ پنڈت نہرو نے پروفیسر مکھرجی کے اس خط کو جو جواب دیا اس کا ایک فقرہ یہ تھا — " تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو":

You are paying the price of being sensitive.

بے ضمیر انسان کو کروڑوں جھونپڑیوں کا منظر کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ مگر جس شخص کا ضمیر زندہ ہو اس کو یہ گندی جھونپڑیاں اس طرح تڑپا دیں گی کہ اس کا نرم گدّا اس کے لیے کانٹوں کا بستر بن جائے — اعلیٰ انسانیت ہمیشہ تلخ گھونٹ پی کر ملتی ہے جب کہ گھٹیا انسان بننے کے لیے سطحیت اور موقع پرستی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

خدا کی طرف سفر

جب سفر ختم ہوگا

ایکسپریس ٹرین لمبا سفر طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ظاہر ہونے والے آثار بتا رہے تھے کہ آخری اسٹیشن قریب آ گیا ہے۔ ٹرین کے سینکڑوں مسافروں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا۔ کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کوئی اشتیاق بھری نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن تیز ہورہی تھی، ہرایک آنے والے پُر مسرت لمحہ کا منتظر تھا جبکہ وہ ٹرین سے اتر کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ ایکسپریس ٹرین یارڈ میں کھڑی ہوئی دوسری ٹرین سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں — خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہوگئیں۔ زندگیاں موت کی آغوش میں سوگئیں، امیدوں کے محل کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔ ایک کہانی جس کا اختتام بظاہر طربیہ (Comedy) پر ہورہا تھا، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ کر اچانک المیہ (Tragedy) میں تبدیل ہوگیا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آدمی بے شمار کوششوں کے بعد پُر اعتماد معاشی زندگی بناتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک بنے ہوئے گھر کی صورت میں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر وہ قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہوجاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہوجاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

"کوٹھی" کا خواب دیکھنے والا مجبور کردیا جاتا ہے کہ وہ "قبر" میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی

دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہوجاتی ہے۔اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔اس کا زور اس سے رخصت ہوجاتا ہے۔ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لیے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کررہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین اختتام پر پہنچ کر حادثہ کا شکار ہوجائے۔

25واں گھنٹہ

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے۔اس کا نام ہے 25واں گھنٹہ:

25th Hour

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔انھوں نے دکھایا ہے کہ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کی ایسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف انسانیت کی مجموعی ہلاکت ہو۔ہتھیاروں کی اندھادھند ریس نے دنیا کو خطرناک ہتھیاروں کا گودام بنادیا ہے۔مسلسل جنگی تیاریوں نے دنیا کو اپنی بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہمارا 24واں گھنٹہ ختم ہوچکا ہے (24th hour is past)۔اب پچیسواں گھنٹہ (خاتمہ کا گھنٹہ) شروع ہونے والا ہے۔

مصنف نے جو بات "انسانی جنگ" کے بارے میں کہی ہے وہ "خدائی قیامت" کے بارے میں زیادہ صحیح ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا کو محدود مدت کے لیے امتحان کے واسطے پیدا کیا ہے۔یہ مدت صرف خدا کے علم میں ہے، وہ ہم کو تعین کے ساتھ معلوم نہیں۔کسی بھی لمحہ خدا اس مدت کے خاتمہ کا اعلان کر سکتا ہے۔اور اس کے بعد دنیا اور اس کا سارا تمدن عظیم زلزلہ کے ذریعہ تباہ ہوجائے گا۔اور اس کے بعد ایک نئی ابدی اور کامل دنیا تخلیق کی جائے گی۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو موجودہ زمین پر ہمارا ہر لمحہ گویا آخری لمحہ ہے۔ اگر ہم اپنی صبح میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم شام نہ کر سکیں۔ اگر ہم اپنی شام میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں دوبارہ صبح دیکھنے کو نہ ملے۔

موجودہ دنیا میں ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلت عمر پوری کر چکی ہو۔ انسان اپنے "24 ویں گھنٹے" کو ختم کر کے 25 ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہو جائے۔

لوگ نیوکلیر جنگ کے خطرہ سے ڈر رہے ہیں۔ حالاں کہ انہیں خدا کی طرف سے قیامت کا صور پھونکا جانے سے ڈرنا چاہیے۔ کیوں کہ نیوکلیر جنگ کا ہونا یقینی نہیں۔ مگر قیامت کا آنا یقینی بھی ہے اور اس کا انجام ابدی بھی۔

آخری منزل

ماؤنٹ ایورسٹ (Mount Everest) دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ہمالیہ کی یہ مشہور چوٹی سطح سمندر سے 29028 فٹ (8848 میٹر) بلند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا قابل ذکر شخص جس نے اس بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھنے کی سنجیدہ کوشش کی وہ ایک انگریز موریس ولسن (1898-1934) تھا۔ اس نے 1934 میں اس کے اوپر چڑھائی کی۔ مگر جس چیز کو اس نے اپنی زندگی کا کلائمکس سمجھا تھا وہ اس کے لیے اینٹی کلائمکس (Anti -climax) بن گیا۔

موریس ولسن پہلی جنگ عظیم میں ایک سپاہی تھا۔ اس کو دنیا کی "آخری بلندی" پر پہنچنے کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی کامیاب تجارت کو اس کے اوپر قربان کر دیا۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ خرچ کر کے ذاتی طور پر ایک سکنڈ ہینڈ ہوائی جہاز خریدا۔ وہ انگلستان سے ہندستان تک چھ ہزار میل کا سفر طے کر کے پورنیہ میں اترا۔ اس کو اپنا ہوائی

جہاز آگے لے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ اس نے اپنا جہاز فروخت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دارجیلنگ اور تبّت کے راستے سے ایورسٹ کی طرف سفر شروع کر دیا۔

آخر میں اس کے پاس ایک چھوٹا خیمہ، کچھ چاول، ایک خود کار کیمرہ اور چند دوسری چیزیں باقی رہ گئیں۔ تاہم وہ اوپر چڑھتا رہا۔ وہ کامیابی کے ساتھ 19500 فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا۔ 21 اِپریل 1934 کو اس کی 36 ویں برتھ ڈے تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس تاریخی دن کو ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں چند دن پہلے یہ الفاظ لکھے:

Only 1300 feet more go. I have the distinct feeling that I'll reach the summit on April 21

صرف تیرہ ہزار فیٹ جانا اور باقی ہے۔ مجھے یہ واضح احساس ہورہا ہے کہ میں 21 اپریل (1934) کو چوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔

ان پُر فخر سطروں کو لکھنے کے بعد ہمالیہ کا سخت طوفان اور موسم کی شدت اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ وہ مجبور ہو گیا کہ پیچھے لوٹے۔ چنانچہ وہ اتر کر اپنے نچلے ٹھکانہ پر آ گیا۔ مگر اس کے بعد اس کو دوبارہ اوپر چڑھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا پیش آیا۔ اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ایک سال بعد تِن زِنگ نارگے (1914-1986) اوپر چڑھ رہا تھا کہ اس کو ایک مقام پر موریس ولسن کی لاش ملی اور اسی کے ساتھ اس کی ڈائری بھی۔ جس کا آخری اندراج وہ جملہ تھا جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

موریس ولسن ہمالیہ کی بلندترین چوٹی پر خود کار کیمرہ کے ذریعہ اپنی تصویر کھینچنا چاہتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ کیمرہ کی آنکھ اس کو فتح کی چوٹی پر دیکھے گی۔ جب یہ تاریخ آئی تو وہاں نہ کوئی ولسن تھا جو اپنی فتح وکامیابی کو دیکھ کر خوش ہو، اور نہ کوئی کیمرہ تھا جو اس کی فتح وکامیابی کے واقعہ کو ریکارڈ کرے۔

یہ کہانی بدلی ہوئی صورت میں ہر آدمی کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہاں ہر آدمی صرف ایک ایسی منزل کی جانب چلا جارہا ہے جہاں موت کے سوا کوی دوسری چیز نہیں جو اس کا استقبال کرنے کے لیے موجود ہو۔

موجودہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیوی کامیابیوں کی صرف تمنا کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر اس طرح مرجاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی خوابوں کی دنیا کی طرف سفر بھی شروع نہیں کیا تھا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنی زندگی میں، کم یا زیادہ، ان خواہشوں کو پالیتے ہیں۔ مگر پانے والے بھی ان چیزوں سے اتنا ہی دور رہتے ہیں جتنا کہ نہ پانے والے۔ کیونکہ ان کو پالینے کے بعد آدمی پر کھلتا ہے کہ اس کو وہ طاقت اور موقع حاصل نہیں جو ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

انسان کتنا زیادہ محروم ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ پانے والا سمجھتا ہے۔ زندگی کس قدر غیر یقینی ہے مگر آدمی اس کو کس قدر یقینی سمجھ لیتا ہے۔ آدمی صرف نامعلوم کل کے راستہ پر جارہا ہے مگر وہ گمان کر لیتا ہے کہ وہ معلوم آج میں اپنی کامیاب دنیا تعمیر کر رہا ہے۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

موت کے دوسری طرف

سکندر اعظم نے بڑی بڑی فتوحات کیں۔ مگر جب آخر وقت آیا تو اس نے کہا: ”میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مجھ کو فتح کر لیا۔ افسوس کہ مجھ کو زندگی کا وہ سکون بھی

حاصل نہ ہوسکا جوایک معمولی آدمی کو حاصل ہوتا ہے"۔ نپولین بونا پارٹ (1769-1821) کے آخری احساسات یہ تھے: "مایوسی میرے نزدیک جرم تھی مگر آج مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت، دوسری محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے بہت تلاش کیا مگر میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔ انسان کی زندگی اگر یہی ہے جو مجھ کو ملی تو یقینا انسانی زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ کیونکہ کہ اس کا انجام مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں"۔ ہارون الرشید ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمران تھا۔ مگر آخر عمر میں اس نے کہا: "میں نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی، پھر بھی میں غم غلط نہ کرسکا۔ میں نے بے حد غم اور فکر کی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں جو میں نے بےفکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے ہوں۔ جلد ہی قبر میرے جسم کو نگل لے گی"۔ یہی ہر انسان کا آخری انجام ہے۔ مگر ہر انسان اپنے انجام سے غافل رہتا ہے۔ خلیفہ منصور عباسی کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا: اگر میں کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس حکومت کو آگ لگا دیتا جس نے مجھے باربار سچائی سے ہٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نیکی اس ساری حکومت سے بہتر ہے۔ مگر یہ بات مجھ کو اس وقت معلوم ہوئی جب موت نے مجھے اپنے چنگل میں لے لیا۔

دنیا کے اکثر کامیاب ترین انسانوں نے اس احساس کے ساتھ جان دی ہے کہ وہ دنیا کے ناکام ترین انسان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر آدمی پر جو کچھ گزرتا ہے اگر وہی اس پر موت سے پہلے گزر جائے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ ہر آدمی جب موت کے کنارے کھڑا ہوتا ہے تو اس کو وہ تمام رونقیں راکھ کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جن میں وہ اس قدر گم تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے پیچھے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ کھو چکا اور آگے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کے لیے اس نے کچھ نہیں کیا۔

موت جب سر پر آجائے اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت کو

یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے۔ جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں کوعین انصاف کہے اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہیے۔ مگر جب اس کی طاقت ختم ہوجاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتہ کے قبضہ میں ہے اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں۔ حالاں کہ یاد آنے کا وقت وہ تھا جب کہ وہ غلطیاں کر رہا تھا۔ اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

آخرت تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جوان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لیے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آ گیا۔ اس نے گنّے کا ایک گٹّھا تحفہ کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کرلیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کروالو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمہارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے کہا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا۔''

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔دنیا میں کوئی "گارڈ" وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہوجانے والی ہو،خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور ہوتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو،خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لیے آج خوبصورت الفاظ پالیتا ہے۔مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے،آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے موجود نہیں ہے۔آدمی کے سازوسامان اس کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ سازوسامان اس سے بہت دور ہوچکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کردیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

موت کی طرف

آج وہ بے وقت مجھ سے ملنے آگیا تھا اور بہت کم میرے پاس ٹھہرا۔خلافِ معمول اس نے چائے بھی قبول نہیں کی۔"مجھے بہت جلد گھر پہنچنا ہے۔وہاں میری بیوی

میراانتظار کررہی ہوگی "۔اس نے کہا اوراپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر کے تیزی سے روانہ ہوگیا۔اس کی واپسی کو بمشکل آدھ گھنٹہ ہواتھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔اس کی بیوی گھبرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی" آپ کے دوست کا...."اس نے کہا۔بظاہراس کا جملہ ادھوراتھا۔مگراس کے رونے کی آواز نے اس کو پورا کردیا۔میں ٹیلی فون بند کر کے فوراً اس کے گھر کی طرف بھاگا۔معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔مجھ سے رخصت ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا۔ابھی سیڑھیوں ہی پر تھا کہ لڑھک کر گر پڑا۔لوگ اٹھا کر اندر لے گئے۔فوراً ڈاکٹر بلایا گیامگر ڈاکٹر نے آکرصرف یہ خبردی کہ وہ اس دنیا سے جاچکا ہے۔

اسکوٹر پرسوار ہوکر وہ میرے یہاں سے روانہ ہواتو بظاہر وہ اپنے گھر جارہا تھا۔مگر حقیقتہً وہ موت کی طرف جارہا تھا۔یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔اس طرح کے واقعات ہرروز اورہر جگہ پیش آرہے ہیں۔26مئی 1979 کو امریکا کا ایک بڑاجیٹ جہاز جس میں 271مسافرسوار تھے ،اوہرے (O'Hare) ہوائی اڈے سے اڑا۔تھوڑی ہی دیر بعدوہ زمین پر گرگیا۔جہازسمیت سارے مسافرجل کرراکھ ہوگئے۔یہ معاملہ چندانسانوں کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام انسانوں کا ہے۔سارے انسان جوزمین پر چلتے اوردوڑتے ہوئے نظرآتے ہیں وہ سب موت کی منزل کی طرف جارہے ہیں۔ہرآدمی سب سےزیادہ جس چیزکےقریب ہےوہ موت ہے۔ہرآدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ہرآدمی ہرآن اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ اس کا آخری وقت آجائے اوروہ اچانک اس دنیا سے اٹھا کراگلی دنیامیں پہنچادیا جائے،جہاں سے کسی کوواپس نہیں آنا ہے۔جہاں آدمی کے لیے یا توجنت ہے یا جہنم۔

ایک اندھا آدمی چلتے چلتے کنویں کے کنارے پہنچ جائے تو ہرآدمی جانتا ہے کہ اس وقت سب سے بڑاکام یہ ہے کہ اس کوکنویں کے خطرہ سےآگاہ کیا جائے۔حتیٰ کہ ایسے نازک موقع پرآدمی قبلہ وکعبہ کی زبان اور نحووصرف کے قواعدتک بھول جاتا ہے

اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے "کنواں کنواں"۔مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ساری انسانیت اس سے بھی زیادہ خطرناک "کنویں" کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔مگر ہر آدمی دوسرے دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے۔کوئی شخص "کنواں کنواں" پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔حتیٰ کہ اگر کوئی دیوانہ اس قسم کی پکار بلند کرے تو لوگوں کی طرف سے جواب ملتا ہے — "یہ شخص قوم کو بزدلی کی نیند سلانا چاہتا ہے،وہ جہاد کے جذبہ کو ختم کررہا ہے،وہ حقیقی مسائل سے لوگوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے،وہ زندگی کا پیغام برنہیں بلکہ موت کا داعی ہے۔وہ مایوسی اور بے ہمتی کا سبق دے رہا ہے"۔

لوگ کنویں کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ محفوظ مکان میں ہیں۔لوگ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر خوش ہیں کہ وہ زندگی کا سفر طے کررہے ہیں۔

موت سے قریب

ہمارا اصل مسئلہ کیا ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم انسانوں کے درمیان اپنی جگہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ عنقریب ہم خدا سے دوچار ہونے والے ہیں۔ہم دنیا میں عزت اور کامیابی ڈھونڈ رہے ہیں۔ حالاں کہ بہت جلد ہم آخرت میں داخل ہونے والے ہیں۔ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے مگر ہر شخص زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہے ،موت کے مسائل کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔وہ اسلام جس نے اصحاب رسول کو سراسیمہ بنا دیا تھا وہ اسلام آج لوگوں کو صرف قناعت اور بے فکری کا تحفہ دے رہا ہے۔

ایسا کیوں ہے۔قرآن کے الفاظ میں اس کی وجہ تزئین (فاطر،35:8) ہے۔ہر آدمی کو کچھ ایسے الفاظ مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی غیر اسلامیت کی خوبصورت اسلامی توجیہ کرسکے۔ہر آدمی نے اپنے گرد خوش خیالیوں کا ایک گھروندا بنالیا ہے اور اس کے اندر وہ جی رہا ہے۔اس کو یہ احساس نہیں کہ موت کا دھماکہ اچانک اس کے گھروندے کو

توڑ دے گا اوراس کے بعد اس کے پاس ایک تنکا بھی نہ ہوگا جس سے وہ خدا کے غضب کے مقابلہ میں اپنا بچاؤ کر سکے۔

ایک قائد ملت ایک مسلمان کے اوپر ظلم کرتا ہے مگر اس کو اپنے ظالم ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جلسوں میں اور اخبارات کے صفحات میں اپنے کو اسلام کا چیمپئن بنا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے لیے ناقابل قیاس ہوجاتا ہے کہ ایک شخص جو دنیا میں ناخدائے ملّت بنا ہوا دکھائی دے رہا ہو وہ آخرت میں ظالمِ ملّت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ ایک لیڈر مسلمانوں کے درمیان ایسی سیاست چلاتا ہے جس سے مسلمان دو گرہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ ملک کی دینی اور تعمیری سرگرمیاں تہس نہس ہوجاتی ہیں۔ دنیا کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر قائم ہوتی ہے کہ اسلام وحشیوں کا مذہب ہے جو آپس میں لڑائی جھگڑے کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ اس کے باوجود لیڈر کی راتوں کی نیند نہیں اچٹتی۔ اس کا دن کا سکون غارت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ دیکھتا ہے کہ اپنی زبان وقلم کے ذریعہ اس نے جو اشاعتی کارنامے انجام دیے ہیں وہ اس کو لاکھوں معتقدین کے درمیان نجات دہندۂ اسلام بنائے ہوئے ہیں۔ اپنی علمی اور تقریری خدمات کی بدولت وہ ایک اسلامی ہیرو کی سی زندگی گزار رہا ہے۔ ایسی حالت میں اس کے لیے ناقابل فہم بن جاتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کو بے قیمت قرار دے دیا جائے، دنیا میں اعزازات پانے والا آخرت میں صرف محرومی کی خندق میں ڈال دیا جائے۔

اسی طرح ایک شخص وعدہ خلافی کرتا ہے، اپنے پڑوسی کو ستاتا ہے۔ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ لین دین میں اس کے معاملات لوگوں سے صاف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتا ہے کہ جنت اس کے لیے ضرور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ میں نماز روزہ کا اہتمام کر رہا ہوں۔ حج کی سعادت بھی میں نے حاصل کر لی ہے۔ مسجد اور مدرسہ کے چندہ دہندگان میں بھی میرا نام چھپا ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے ایک دین دار آدمی کا بھی یہ انجام ہوسکتا ہے کہ آخرت میں وہ بے دین قرار دے کر خدا کی رحمتوں سے دور پھینک دیا جائے۔

قبر نہیں دروازہ

"حافظ جی کے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازہ کی نماز تیار ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لیے آیا ہوں"۔ سنتے ہی میں نے کتاب بند کی اور وضو کرکے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

قبرستان پہنچا تو وہاں میرے سوا تھوڑے سے آدمی اور کھڑے تھے۔ گنا تو چھوٹے بڑے سترہ آدمی تھے جن میں میت کے گھر کے افراد بھی شامل تھے۔ مجھے ایک مہینہ پہلے کی بات یاد آئی جب کہ سیٹھ فضل علی کے ایک رشتہ دار کا جنازہ اسی قبرستان میں آیا تھا اور قبرستان کے خصوصی حصہ میں دفن ہوا تھا۔ اس دن آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بستی کی تمام مسلم آبادی نکل آئی ہے۔

میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد محلہ کے امام صاحب نماز جنازہ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں نے بھی صف میں شامل ہو کر نیت باندھ لی مگر امام صاحب نے اتنی تیزی سے نماز پڑھائی کہ میں کوئی دعا بھی پوری نہ پڑھ سکا۔ بس جلدی جلدی چار بار اللہ اکبر کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے سلام پھیر دیا۔ لوگ اپنے جوتے پہن کر اطمینان کے ساتھ اس طرح کھڑے ہو گئے گویا "نماز جنازہ" کے نام سے جو کام انہیں کرنا تھا اس کو انھوں نے پوری طرح انجام دے دیا ہے۔

قبر قریب ہی تھی۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی کھودی جا رہی ہے۔ لوگ دو دو چار چار کرکے اِدھر اُدھر کھڑے ہو گئے۔ کوئی فرقہ وارانہ مظالم کی داستان سنانے لگا۔ کسی نے موسم کی سختی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کوئی بازار بھاؤ کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے لگا۔ غرض اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔

میں قبر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ آیتیں اور حدیثیں گھوم رہی تھیں جن میں قیامت، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قبر ایک کھلا ہوا دروازہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں دوسری دنیا کے

مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل بے قرار ہو گیا۔ میری زبان سے نکلا "
زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں ہے جس میں لوگ الجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ وہ ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس واقعہ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شخص کی عارضی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف روانگی کی تقریب ہے۔ یہ قبر جو ہمارے سامنے کھودی جا رہی ہے، یہ قبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دروازہ ہے جو ایک شخص کو دوسری دنیا میں داخل کرنے کے لیے کھولا گیا ہے۔ جانے والا ابھی اس دروازہ میں داخل ہو کر اُس پار چلا جائے گا۔

جب بھی کوئی شخص مرتا ہے تو یہ ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس وقت گویا تھوڑی دیر کے لیے اس دنیا کا دروازہ کھولا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کھلے ہوئے دروازہ سے دوسری دنیا کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے جہاں ہم میں سے ہر شخص کو ایک روز جانا ہے۔ مگر آج کی دنیا کے مناظر نے لوگوں کی نگاہوں کو اس قدر الجھا رکھا ہے عین دروازہ پر کھڑے ہو کر بھی انہیں اس پار کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حقیقت کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے بے خبر رہ جاتے ہیں۔

موت کا سبق

ایک مجرم کو بتایا گیا کہ عدالت اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے اور کل صبح اس کو پھانسی دے دی جائے گی۔ پھانسی اگرچہ کل کے دن ہونے والی تھی مگر آج ہی اس کا یہ حال ہوا گویا اس کو پھانسی دی جا چکی ہو۔ زندگی اس کے لیے بے قیمت ہو گئی۔ اس کا ہنسنا اور بولنا ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھ جو دوسروں کے خلاف اٹھتے تھے، اب اس قابل نہ رہے کہ کسی کے خلاف اٹھیں۔ اس کے پاؤں جو ہر طرف دوڑنے کے لیے آزاد تھے، اب ان میں یہ طاقت بھی نہ رہی کہ وہ کہیں بھاگنے کی کوشش کریں۔

موت بتاتی ہے کہ یہی معاملہ ہر ایک کا ہے۔ ہر آدمی جو آج زندہ نظر آتا ہے، کل کے دن اسے "پھانسی" کے تختہ پر لٹکنا ہے۔ مگر ہر آدمی اس سے بے خبر ہے۔ ہر ایک اپنے آج میں گم ہے، کسی کو اپنے کل کا احساس نہیں۔ یہاں ہر آدمی "مجرم" ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مجرم ہونے کو جانتے ہوں۔

آدمی زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے مال اور اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ اس سے پوچھے بغیر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کی دیکھنے والی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر چیز سے جدا ہو کر قبر کی تنہائی میں چلا جاتا ہے۔

موت کا یہ واقعہ آدمی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی اختیار سے بے اختیاری کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ سے بے کچھ کی طرف جا رہا ہے۔ موت سے پہلے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ اپنے ارادہ کا آپ مالک ہے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔

آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ کسی پر قابو پا کر اسے ستانا اس کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص خود کل دوسرے کے قابو میں جانے والا ہے وہ کسی کو ستا کر کیا پائے گا۔ اپنے کو بڑا سمجھنے پر اسے شرم آئے گی۔ کیونکہ جو بڑائی بالآخر چھن جانے والی ہو اس کی کیا حقیقت۔

زندگی کا سفر

مصطفیٰ رشید شیروانی، مشہور مجاہد آزادی اور صنعت کار اور ممبر راجیہ سبھا، ٹرین کے ذریعہ الہ آباد سے دہلی جا رہے تھے۔ گورنر کشمیر مسٹر بی کے نہرو (1909-2001) بھی

انہیں کے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ٹرین غازی آباد پہنچی تھی کہ مصطفیٰ رشید شروانی پر دل کا سخت دورہ پڑا۔قبل اس کے کہ انہیں کوئی طبی امداد پہنچے،فوراً ہی ٹرین میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ 18اپریل 1981 کا واقعہ ہے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر 59 سال تھی۔

اس طرح کے واقعات مختلف شکلوں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ ہر دن بے شمار زندہ لوگ موت کے دروازہ میں داخل ہوجاتے ہیں۔ہر روز لاکھوں آدمیوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نکل کر کسی "دہلی" کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔مگر درمیان ہی میں ان کو خدا کے فرشتے پکڑ لیتے ہیں اور ان کو "دہلی" کے بجائے آخرت کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لیے ہوئے ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے "کل" کی طرف چلا جا رہا00 ہوں۔مگر بہت جلد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کے بجائے خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کی طرف نہیں بلکہ آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔آدمی کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے،مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لیے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔آدمی اپنے آرام کے لیے ایک شان دار مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے خوابوں کے مکان میں سکھ چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہوجاتی ہے۔آدمی اپنی معاش کو بڑھاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت وترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جا رہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لیے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت وترقی کی رونقیں۔

خدا ہر دن کسی "دہلی" کے مسافر کو "قبر" میں پہنچا رہا ہے۔مگر آدمی ان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔اس کے باوجود ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ "دہلی" کی طرف چلا جا رہا ہے ،قبر کی منزل اس کے لیے کبھی آنے والی نہیں۔

کیسا عجیب

ایئر انڈیا کا ایک جہاز 3 جون 1984 کو بینکاک سے بمبئی کے لیے اڑا۔ یہ بوئنگ 747 تھا۔ اس میں چار انجن نصب تھے اور عملہ کے علاوہ 152 مسافر سوار تھے۔ جہاز ابھی فضا میں پہنچا تھا کہ اس کے ایک انجن میں آگ لگ گئی۔ تاہم کیپٹن ورما نے ہوشیاری کی اور جہاز کو قریب کے ہوائی اڈہ ڈون موانگ (Don Muang) پر اتار لیا۔ اڑنے کے 20 منٹ بعد جہاز دوبارہ زمین پر تھا۔

پائلٹ کی ہوشیاری سے جہاز حفاظت کے ساتھ رن وے پر اتر گیا جہاں ریڈ یائی اطلاع پا کر پہلے سے آگ بجھانے والے انجن موجود تھے۔ تاہم بہت سے مسافر زخمی ہو گئے اور انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ اس کی وجہ جہاز کا حادثہ نہیں تھا۔ بلکہ اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، 4 جون 1984) کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی:

Most of the injuries were due to passengers rushing for the emergency exit from where they descended through a chute.

یعنی بیشتر زخمیوں کی وجہ مسافروں کا آپس کا ٹکراؤ تھا۔ کیوں کہ جب جہاز اترا تو مسافر تیزی سے دروازہ کی طرف دوڑ پڑے جہاں انہیں ایک ڈھلوان گاڑی سے نیچے اترنا تھا۔

جہاز کی آگ نے ابھی کسی کو پکڑا نہیں تھا۔ صرف یہ اندیشہ تھا کہ شاید پکڑ لے اور آدمی جل کر مر جائے۔ تاہم اس اندیشہ نے لوگوں کو اتنا بدحواس کر دیا کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سے ہر شخص یہ چاہنے لگا کہ سب سے پہلے وہ بھاگ کر آگے نکل جائے۔

مگر ایک اس سے زیادہ ہولناک خطرہ آدمی کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ موت اور اس کے بعد قیامت کا خطرہ ہے۔ لیکن کسی کو اس کے اندیشہ سے بدحواسی نہیں۔ کوئی اس سے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کس قدر سچ فرمایا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے جہنم کی آگ سے خوفناک چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والا بے خبر سو گیا ہو: مَا رَأَيْتُ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2601)۔

آدمی کو موجودہ دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز متحرک کرتی ہے وہ "خوف" ہے۔ خوف کی نفسیات عمل کا سب سے بڑا سر چشمہ ہے۔ آخرت کا خوف تمام خوفوں میں سب سے بڑا خوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آخرت کا خوف واقعی معنوں میں کسی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دے گا۔ وہ اس کی تمام قوتوں کو متحرک کر دے گا۔

جنازہ کو دیکھ کر

مرحوم کا جنازہ لوگ کاندھوں پر اٹھائے ہوئے قبرستان کی طرف جا رہے تھے۔ اور میرے ذہن میں ایک پوری تصویر جاگ رہی تھی۔ مرحوم کے اس آخری سفر میں مجھے انسان اپنے آغاز سے اپنے انجام کی طرف جاتا ہوا نظر آرہا تھا۔

آدمی پیدا ہو کر دنیا میں آتا ہے تو فوراً ہی اس کو ماں کی شفقت اور باپ کی سر پرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے درمیان پرورش پاتا ہے۔ پھر وہ بڑا ہو کر ایک بااختیار انسان کی حیثیت سے زمین پر اپنی زندگی بناتا ہے۔

آدمی کا یہ سفر جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اب اس کے وہی دوست اور رشتہ دار جو دنیا میں اس کے مددگار بنے ہوئے تھے، اس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور زمین کے ایک ایسے گڑھے میں ڈال کر بند کر دیتے ہیں جہاں آدمی بالکل اکیلا ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہوتا ہے اور اس کا خدا۔

آدمی اب تک اپنے جیسے انسانوں کے سامنے تھا، اب وہ برتر خدا کے سامنے ہوتا ہے۔ اب تک وہ اختیار کی دنیا میں تھا، اب وہ بے اختیاری کی دنیا میں اپنے آپ کو پاتا ہے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ لمحہ جب ایک عاجز مطلق ایک قادر مطلق کے سامنے کھڑا ہوگا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز زمین کے اوپر ہوتا ہے۔ ہر روز آدمی کسی نہ کسی کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، مگر اس کو کچھ احساس نہیں ہوتا۔

"احساس تو جب ہو جب کہ آدمی کے دماغ میں جنت اور جہنم ہو" میں نے سوچا۔ لوگوں کی سوچ بالکل دوسرے رخ پر چل رہی ہے۔ لوگوں کے ذہن میں دوستی، رشتہ داری، کمانا اور گھر بنانا، جیسے مسائل بھرے ہوئے ہیں۔ وہ کسی آدمی کو اسی حیثیت سے جانتے ہیں۔ جب کوئی آدمی مرتا ہے تو وہ اس کے متعلق بس اتنا سوچ پاتے ہیں کہ ایک ساتھی بچھڑ گیا۔ ایک کمانے والا فرد ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ صرف دنیا کے ساتھ انسان کے تعلقات کو جانتے ہیں۔ وہ آخرت کے ساتھ انسان کے تعلقات کو نہیں جانتے ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ وہ جنازہ میں انسان کی خدا کے سامنے حاضری کو دیکھیں۔ وہ موت کے سفر میں انسان کے آخرت کی طرف سفر کا مشاہدہ کریں۔

روپیہ سے راکھ تک

گھنشیام داس برلا (1983-1894) ہندستان کے مشہور ترین صنعت کار تھے۔ ان کی اعلیٰ کامیابی کا راز ان کی بے حد با اصول زندگی تھی۔ انھوں نے 12 سال کی عمر میں معمولی کاروبار سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ عظیم ترقی تک پہنچے آج ان کا خاندان ہندستان کا واحد سب سے بڑا کاروباری خاندان ہے۔

مسٹر برلا کا معمول تھا کہ صبح 5 بجے اٹھتے اور شام 9 بجے تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ شراب کے بجائے کافی پیتے تھے۔ دو کھانے کے درمیان پانی کے سوا اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ اکثر اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے۔

مسٹر برلا روزانہ صبح کو ٹہلنے کے لیے نکلتے تھے۔ اس معمول میں کوئی فرق نہیں تھا، خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان کے باہر۔ 11 جون 1983 کو وہ لندن میں تھے۔ وہ حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد ریجنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے کے لیے نکلے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انہیں تکلیف محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے مددگاروں کو بتایا جو اس وقت ان

کے ساتھ تھے۔ وہ انہیں فوراً گھر واپس لائے۔ گھر آتے ہی وہ بے ہوش گئے۔ اس کے بعد انہیں لندن کے مڈل سکس اسپتال (Middlesex Hospital) پہنچایا گیا۔ اسپتال میں انہیں تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا، وہاں انھوں نے کہا — ڈاکٹر، مجھے کیا تکلیف ہے۔

What is wrong with me, Doctor?

ڈاکٹروں نے کہا: ہم پانچ منٹ میں معائنہ کرکے بتاتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹروں کا معائنہ مکمل ہوان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مسٹر برلا کی وصیت تھی کہ جہاں میرا انتقال ہو وہیں میرے آخری مراسم ادا کیے جائیں۔ چنانچہ مسٹر برلا کی لاش کو لندن میں بجلی کے ذریعہ جلا دیا گیا، اور ان کی راکھ ہندستان لاکر یہاں کی ندیوں میں بہا دی گئی۔ مسٹر برلا کی اسکول میں تعلیم نہیں ہوئی، تاہم بعد کو انھوں نے ذاتی محنت سے اپنے اندر لیاقت پیدا کی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بنے۔ ان کی ایک کتاب کا ہندی نام ہے — روپیہ کی کہانی۔

مسٹر برلا نے "روپیہ کی کہانی" لکھی، حالانکہ بالآخر وہ خود "راکھ کی کہانی" بننے والے تھے۔ یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کی داستان لکھ رہا ہے۔ حالانکہ آخر کار وہ جہاں پہنچنے والا ہے وہ مکمل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جہنم کا خطرہ

خدا نے انسان کو اس کی بناوٹ کے اعتبار سے جنتی نفسیات کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کو موجودہ دنیا میں ڈال دیا جہاں ایسے حالات ہیں جو آدمی کے اندر جہنمی نفسیات کو ابھارتے ہیں۔ اب جو شخص اسفل سافلین میں رہتے ہوئے اپنے کو احسن تقویم کی سطح پر لے جائے، بالفاظ دیگر جہنمی نفسیات کو ابھارنے والے ماحول میں

دوبارہ اپنے اندر چھپی ہوئی جنتی نفسیات کو بیدار کرے تو وہی وہ شخص ہے جو مرنے کے بعد اللہ کے پڑوس میں اور اس کی نعمتوں میں جگہ پائے گا۔ باقی لوگ دھوئیں اور آگ کی دنیا میں عذاب سہنے کے لیے چھوڑ دئے جائیں گے(التین ، 95:1-5)۔

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔اس لیے اس کو اسی ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کے لیے آزمائشی حالات پیدا ہوں۔ یہاں نفع اور نقصان کے معاملات ہیں جو آدمی کے اندر حرص، طمع اور خود غرضی کے احساسات ابھارتے ہیں۔ یہاں سطحی دل چسپیاں ہیں جو آدمی کو شہوت پرستی ،نشہ بازی اور لذتیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا مقابلہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے آدمی کے اندر خود پرستی اور انانیت کا شیطان جاگتا ہے۔ یہاں مفادات کا ٹکراؤ ہے جس کی وجہ سے غصہ، نفرت اور کمینہ پن کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہی موجودہ دنیا کا "اسفل سافلین" ہونا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھائے اور اپنے کو "احسن تقویم" کی سطح پر لے جائے جو باعتبار پیدائش اس کی حقیقی سطح ہے۔

ایک پھل اندر سے اچھا ہے یا خراب ، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اسے توڑا جائے ۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کوئی انسان جنتی نفسیات میں جی رہا ہے یا جہنمی نفسیات میں، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اس کی ہستی کو توڑا جائے ۔ جب آدمی کے ساتھ کسی قسم کی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے تو اس وقت اس کی ہستی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر آدمی جو ردعمل ظاہر کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتی تقویم کی سطح پر تھا یا جہنمی تقویم کی سطح پر۔ جب دو آدمیوں کے درمیان روپیہ یا جائیدار کا جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔ جب دو صاحب معاملہ افراد کے درمیان کوئی کھٹ پٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دو الگ الگ خیال رکھنے والوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جب ایک منصب کے دو دعویداروں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے تو یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب کہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ایسے مواقع پر جو شخص نفرت

،خود غرضی، بے انصافی اور انانیت کا مظاہرہ کرے وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ جہنمی نفسیات میں جی رہا تھا، وہ ابلیس اور شیطان کا پڑوسی تھا۔ اس کے برعکس، جس شخص کا ردعمل ان مواقع پر محبت، بے غرضی، انصاف پسندی اور تواضع کی صورت میں ظاہر ہو وہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ جنتی نفسیات میں جی رہا ہے، اس کے روز وشب خدا اور اس کے فرشتوں کے پڑوس میں گزرتے ہیں۔ جو شخص دنیا میں شیطان کا پڑوسی ہے، آخرت میں بھی اس کو شیطان ہی کا پڑوس حاصل ہوگا اور جو شخص دنیا میں خدا اور فرشتوں کا پڑوسی ہے، وہ آخرت میں بھی خدا اور فرشتوں کے پڑوس میں رہے گا۔

گڑھے میں پاؤں

مسٹر پی، وی وینکٹیشورن ایک سرکاری ادارہ میں چیف مارکٹنگ منیجر تھے۔ 29 مئی 1982 کی شام کو انھوں نے دہلی کے گوپالا ٹاور میں ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ آٹھویں منزل پر اپنی میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ دفتر سے باہر نکلے تو بجلی فیل ہو چکی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لفٹ تک آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ سمجھے کہ لفٹ آئی ہے حالاں کہ لفٹ ابھی اوپر نویں منزل پر تھی۔ مسٹر وینکٹیشور لفٹ کے دروازے کی طرف لپکے۔ اس وقت وہ میٹنگ کے فیصلوں سے اتنا خوش تھے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنا ایک پاؤں لفٹ کے اندر ڈال دیا۔ مگر وہاں خالی تھا۔ وہ اچانک آٹھویں منزل سے زمین پر آ گئے۔ ان کا ذاتی ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا، مگر وہ صرف یہ خدمت انجام دے سکا کہ نیچے اتر کر ان کی لاش کو دیکھے اور ان کے مردہ ہونے کا اعلان کرے۔ موت کے وقت ان کی عمر 51 سال تھی (ہندستان ٹائمس، 30 مئی 1982)۔

مسٹر وینکٹیشور ایک نہایت کامیاب افسر تھے۔ حال میں ایک سرکاری جرنل میں ان کے بارے میں الفاظ چھپے تھے — ایک بہادر کارکن، ایک مستعد اور اختراعی منتظم جس کے

اندر میں آگ لگی ہوئی ہو اور جس کے دماغ میں نظریات کا خزانہ ہو، ایک ہوشیار جنرل:

A thoroughbred professional and a dashing innovative manager with fire in his belly and ideas in his mind, an astute general.

دنیا کے اعتبار سے مسٹر وینکٹیشور کا کیس ایک انوکھا کیس ہے۔ مگر آخرت کے اعتبار سے ہر آدمی یہ فعل انجام دے رہا ہے۔ ہر آدمی عقل مندی اور کامیابی کے جوش میں ایسی جگہ اپنا پاؤں رکھ رہا ہے جو اس کو سیدھے آخرت کے گڑھے میں گرا دینے والا ہے— کسی کو بے عزت کرنے والے الفاظ بولنا، کسی کو ستانے کے لیے اقدام کرنا، کسی کے خلاف ضد اور انتقام کے تحت کارروائی کرنا، کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی برتنا، کسی کو ناحق اپنے زور طاقت کا نشانہ بنانا، کسی کا بے دلیل مذاق اڑانا، یہ سب گویا "آٹھویں منزل" کے خالی مقام پر پاؤں رکھنا ہے۔ ایسا ہر اقدام آدمی کو تباہی کے نچلے گڑھے میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد نہ اس کے ساتھ اس کو بچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں نہ اس کی خوش فہمیاں —ہر آدمی گڑھے میں پاؤں رکھ رہا ہے۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ تختہ پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہے۔

کتنا سنگین

اخبار ایک اعتبار سے موت کا خبر نامہ ہے۔ ہر روز اخبار میں لوگوں کی موت کی خبریں ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے سامنے 24 فروری 1985 کا اخبار ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ چکردھر پور ناگپور کی دو بوگیوں میں آگ لگ گئی۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ آگ تیزی سے پھیلی۔ مگر بریک کام نہ کرنے کی وجہ سے مسافر ٹرین کو فوراً ٹھہرا نہ سکے۔ اگلے اسٹیشن پر ٹرین رکی تو بھرے ہوئے ڈبہ کے تقریباً ایک سو آدمی جل کر مر چکے تھے۔

دوسری خبروں میں صرف دہلی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ہندی ادیب چندر گپت ودیا لنکر 78 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اجیت سنگھ (14 سال) جیپ میں

سفر کرتے ہوئے ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا اور مرگیا۔ 25 سال کے ایک آدمی کی لاش بورے میں بند پائی گئی وغیرہ وغیرہ۔

اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آتے ہیں۔ وہ سادہ معنوں میں صرف موت کے واقعات نہیں ہیں۔ یہ مخلوق کی اپنے خالق ومالک کے سامنے حاضری ہے۔ یہ ایک انسان کا خدا کی عدالت میں پہنچایا جانا ہے۔ یہ امتحان کے مرحلہ کو پورا کرکے ابدی انجام کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔

موت کا یہ پہلو کتنا ہولناک ہے۔ یہ موت کے واقعہ کو انتہائی سنگین بنادیتا ہے۔ اتنا سنگین کہ اس سے زیادہ سنگین کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔

موت کے اس پہلو کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے۔ لکھنے اور بولنے والے سب سے زیادہ اس کے بارے میں لکھیں اور بولیں۔ انفرادی مجلسوں اور عوامی اجتماعات میں سب سے زیادہ اس کا چرچا ہو۔ مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس ہے۔ موت ہر آدمی کو صرف یہ بتاتی ہے کہ "فلاں شخص اس دنیا سے چلا گیا" وہ کسی کو یہ نہیں بتاتی کہ "میں بھی اس دنیا سے جانے والا ہوں" ہر آدمی موت کے سفر کو دوسروں کا سفر سمجھتا ہے۔ کسی کو موت کے واقعہ میں اپنا سفر دکھائی نہیں دیتا۔

آہ وہ انسان، جو اس وقت تک ہوش میں آنے کے لیے تیار نہیں جب تک اس کو ہوش میں آنے کے لیے مجبور نہ کردیا گیا ہو۔

الفاظ ختم نہیں ہوتے

الرسالہ اپریل 1984 (آخری سفر) کے بارے میں ہم کو کئی خطوط ملے ہیں جن میں شکایت کی گئی ہے کہ اس شمارہ میں "کچھ مضامین دوبارے چھاپ دیے گئے ہیں" ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ آپ نے ابھی اس شمارہ کو نہیں پڑھا۔ اگر آپ واقعتاً اس کو پڑھتے

تو آپ کے ہوش وحواس گم ہوجاتے۔ اس شمارہ میں زندگی کے جس انتہائی سنگین مسئلہ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ اگر انسان کی سمجھ میں آجائے تو اس کے اوپر ایسی سراسیمگی طاری ہو کہ اس کو یہ یاد ہی نہ رہے کہ کون سا مضمون پہلی بار چھپا ہے اور کون سا مضمون دوسری بار۔ کون سی بات پہلے کہی جا چکی تھی اور کون سی دوبارہ کہی جا رہی ہے۔

اگر آپ راستہ چل رہے ہوں اور اچانک کوئی شخص چیخ کر کہے "تمہارے آگے سانپ ہے سانپ" تو کیا اس وقت آپ کو یہ ہوش رہے گا کہ آپ اس شخص سے بحث کریں کہ تم نے سانپ کا لفظ دوبارہ کیوں کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگوں کی بے خبری ہے جس نے انھیں تکرار اور بے تکرار جیسی باتوں میں مشغول کر رکھا ہے۔ اگر انھیں خبر ہوجائے تو "تکرار" کا لفظ وہ اس طرح بھول جائیں جیسے کہ انھوں نے کبھی اس لفظ کو جانا ہی نہ تھا۔

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ الرسالہ کے قارئین میں ایسے لوگ بھی ہیں جو واقعتاً اس کو پڑھتے ہیں۔ اور اس سے وہ اثر لیتے ہیں جو انھیں لینا چاہیے۔ چنانچہ اگر ہم کو ایک طرف مذکورہ بالا قسم کے خطوط ملے تو اسی کے ساتھ ہم کو دوسری قسم کے خطوط بھی موصول ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر الرسالہ کے ایک پرانے خریدار اپنے خط مورخہ 16 پریل 1984 میں آکولہ سے لکھتے ہیں۔

"اپریل کا پرچہ (آخری سفر) ملا۔ پڑھ کر ہوش وحواس گم ہوگئے۔ واقعی اللہ نے آپ کے قلم میں جادو کا اثر رکھا ہے۔ رسالہ پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ الرسالہ کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صرف دعا کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سمجھ نصیب فرمائے اور آپ کے قلم میں دلوں کو پلٹ دینے کی تاثیر رکھ دیں"۔

آہ، لوگوں کو اپنے "آخری سفر" کی ہولناکی کا اندازہ نہیں۔ اگر انھیں اس کا اندازہ ہو تو ان کی زبان بند ہوجائے۔ حتی کہ ان کے پاس یہ کہنے کے لیے الفاظ نہ رہیں کہ — تم نے چھپے ہوئے مضمون کو دوبارہ چھاپ دیا ہے۔

آہ کس قلم سے لکھا جائے

کوئی جہاز مشکل میں پھنس جائے تو وہ ریڈیو کے ذریعہ خاص سگنل بھیجتا ہے۔اس کو اصطلاح میں ایس او ایس (SOS) کہتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم مصیبت میں ہیں، ہماری مدد کرو۔مگر اس قسم کے سگنل کی قیمت اسی وقت ہے جب کہ اس کو وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت دے۔اگر وصول کرنے والا اسٹیشن اسے اہمیت نہ دے تو وہ فضا میں بکھر کر رہ جائے گا۔وہ ایسا کلام بن جائے گا جس کو بولنے والے کے سوا کسی اور نے سنا ہی نہ ہو۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے لکھنے اور بولنے والے بھی خدا کے نام گویا "ایس او ایس" بھیج رہے ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں کہ خدایا ظالموں کے خلاف ہماری مدد کر۔مگر سو سالہ پکار کے باوجود ہماری مصیبت ختم نہیں ہوتی۔اس سے ظاہر ہے کہ ہم جس خدائی اسٹیشن کو اپنا ایس او ایس بھیج رہے ہیں اس کے نزدیک ہمارے ایس او ایس کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

ہم خدا سے دوسروں کی بربادی مانگ رہے ہیں مگر خدا اس کا منتظر ہے کہ ہم اس سے دوسروں کی ہدایت مانگیں۔ہم اپنے قومی مقاصد کے لیے خدا کو پکار رہے ہیں۔مگر خدا صرف اس پکار کو سنتا ہے جو دینی مقاصد کے لیے کی گئی ہو۔ہم لوگوں کو آگ میں ڈالنے کی دعا کر رہے ہیں حالانکہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم لوگوں کو آگ سے بچانے کی دعا کریں۔ایسی حالت میں ہمارا "ایس او ایس" خدا کے یہاں کیسے قابل لحاظ ہو سکتا ہے۔جو فائر بریگیڈ پانی لیے ہوئے بیٹھا ہو اس سے ہم کہیں کہ آگ برساؤ تو وہ کیسے ہماری بات کو سنے گا۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی جنتیں رزرو (reserve) ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھیں دوسروں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر نہیں۔اگر لوگوں کو اللہ کا ڈر ہو تو وہ جان لیں کہ قیامت میں

اللہ کی پکڑ سے وہی شخص بچے گا جس نے دوسروں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے کی فکر کی ہو۔

لوگوں کے پاس الفاظ ہیں، صرف اس لیے کہ وہ قیامت کی ہولنا کی کو دوسروں کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اگر وہ جانیں کہ وہ خود بھی قیامت کی ہولنا کی کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں تو ان کی زبانیں بند ہوجائیں۔ خدا کی پکڑ کا خوف ان کو اتنا ہلکان کردے کہ وہ ہنسنے سے زیادہ روئیں۔ وہ بولنے سے زیادہ خاموش دکھائی دینے لگیں۔

خدا کا قانون

قانون کی زد

ہمارے ملک میں قانون کی پکڑ سے بچنے کا یقینی ذریعہ رشوت ہے۔رشوت کے زور پر یہاں سب کچھ کیا سکتا ہے۔جس آدمی کی جیب میں کافی پیسہ موجود ہے اس کے لیے کوئی بھی غلط کام کرکے اس کے قانونی انجام سے دوچار ہونے کا اندیشہ نہیں۔

مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں اگرچہ اس قسم کی رشوت کا رواج نہیں۔مگر اصل برائی وہاں بھی پوری طرح موجود ہے۔ان ملکوں میں قانون کی پکڑ سے بچنے کے لیے ایک مستقل "کاروبار" قائم ہے جس کو لوپ ہول کاروبار (Loophole Business) کہا جاتا ہے۔

امریکا کے دارالسلطنت واشنگٹن میں ایک شخص نے دیکھا کہ شہر میں بہت سی نئی آفس بلڈنگیں کھڑی ہورہی ہیں۔اس کو تعجب ہوا۔کیوں کہ حال میں اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ صدر امریکا نے دفتری کارکنوں میں کمی کا اعلان کیا ہے۔اس نے ایک عمارتی ٹھیکیدار سے پوچھا کہ ان عمارتوں کو کس قسم کے لوگ کرایہ پر لے رہے ہیں۔ٹھیکیدار نے کہا کہ وہ لوگ جو لوپ ہول بزنس سے تعلق رکھتے ہیں۔آدمی نے حیران ہوکر پوچھا کہ یہ لوپ ہول بزنس کیا ہے۔ٹھیکیدار نے جواب دیا، کیا آپ نہیں جانتے۔واشنگٹن میں دنیا کی سب سے بڑی لوپ ہول انڈسٹری ہے:

Washington has the largrest loophole industry in the world.

اس نے مزید بتایا کہ امریکا کی مجلس قانون ساز قانون بناتی ہے۔اب کچھ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اوپر ان قوانین کی زد پڑ رہی ہے۔انھیں تلاش ہوتی ہے کہ ان میں ایسے قانونی شگاف (Legal loopholes) دریافت کریں جن کے ذریعے وہ ان کی پکڑ سے بچ سکیں۔ان دفاتر میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے اعلیٰ دماغ بیٹھے ہوئے ہیں جن کا کام یہی قانونی شگاف تلاش کرنا ہے۔چنانچہ لوپ ہول بزنس آج امریکا کا بہت بڑا اور منظم بزنس بن چکا ہے (دی ہندو 16 دسمبر 1984)۔

دنیا میں انسان کا مقابلہ انسان سے ہے۔ یہاں وہ جرم کرتا ہے اور پھر رشوت دے کر یا قانون میں لوپ ہول تلاش کر کے اس کی زد سے بچ جاتا ہے۔ پھر اس وقت انسان کا کیا حال ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے مقابلہ میں پائے گا جہاں نہ کوئی مال کسی کے کام آنے والا ہے اور نہ کسی قسم کی قانونی مہارت۔

خدا کی دنیا میں

ایک نومسلم انگریز نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے 1974 میں حج کا فریضہ ادا کیا۔ یہ سفر میں نے اپنے وطن انگلینڈ سے بذریعہ موٹر کار کیا تھا۔

دسمبر 1973 کی کوئی تاریخ تھی۔ میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا سوئزرلینڈ پہنچا۔ وہاں زیورک میں میری بہن تھی جس سے مجھے ملنا تھا۔ انگلینڈ میں بائیں چلو (Keep left) کا اصول ہے اور سوئزرلینڈ میں دائیں چلو (Keep right) کا اصول۔ میں جب زیورک میں داخل ہوا تو مجھے یاد نہ رہا کہ یہاں مجھ کو اپنی گاڑی سڑک کے دائیں طرف چلانا چاہیے۔ سابقہ عادت کے مطابق میں سڑک کے بائیں طرف اپنی گاڑی دوڑانے لگا۔

جلد ہی ایک مقام پر ٹریفک کانسٹیبل نے ویسل دے کر مجھے روکا۔ جب میں رکا تو وہ میرے قریب آیا۔ اس نے میری گاڑی کی پلیٹ دیکھی۔ میرا حلیہ دیکھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہ انگلش آدمی ہے اور انگلش ہونے کی وجہ سے بائیں طرف گاڑی دوڑا رہا ہے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا جناب، اس وقت آپ انگلینڈ میں نہیں ہیں:

Sir, yor are not in England now.

یہ واقعہ بظاہر ایک ٹریفک کا واقعہ ہے۔ مگر اس میں آخرت کا ایک بہت بڑا سبق چھپا ہوا ہے۔ موجودہ دنیا جس میں ہم ہیں وہ خدا کی دنیا ہے۔ مگر انسان اکثر اوقات اس کو اپنی دنیا سمجھ لیتا ہے۔ وہ خدا کی مرضی کی پیروی کرنے کے بجائے اپنی مرضی اور خواہش کی طرف دوڑنے لگتا ہے۔

جس طرح سڑک کے کنارے ٹریفک کانسٹیبل کھڑا ہوالوگوں کو بتاتا ہے کہ "تم اپنے ملک میں نہیں ہو بلکہ دوسرے کے ملک میں ہو" اسی طرح خدا کے پیغمبر لوگوں کو یہ وارننگ دے رہے ہیں کہ "تم انسان کی دنیا میں نہیں ہو بلکہ خدا کی دنیا میں ہو" کامیاب انسان وہ ہے جو اس وارننگ پر دھیان دے۔ وہ خودسری کو چھوڑ دے اور خدا کی دنیا میں خدا کے حکم کا پابند بن کر رہے۔ اس کے برعکس، ناکام انسان وہ ہے جو خدا کو بھول جائے اور خدا کی دنیا میں اپنی خواہش کے رخ پر دوڑنے لگے۔

دنیا میں ٹریفک کے قانون کے خلاف ورزی کا انجام فوراً سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے آدمی یہاں ٹریفک کانسٹیبل کی وارننگ پاتے ہی اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ مگر خدا کے قانون کی خلاف ورزی کا انجام آخرت میں سامنے آئے گا اس لیے اس معاملہ میں وہ وارننگ سن کر بھی اس کی پروا نہیں کرتا، مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دوروپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لیے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لیے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تا کہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منہ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لیے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان وشوکت دکھانے کے لیے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن وانصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لیے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرلے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لیے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج بونا کل کاٹنا

گھنشیام داس برلا (1983-1894) راجستھان کے ایک گاؤں پلانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ ایک معمولی آدمی تھے اور کلکتہ میں جوٹ کے دلال کے طور پر کام کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں مسٹر برلا بھی کلکتہ چلے گئے اور وہاں اپنے باپ کے کام میں مدد کرنے لگے۔

مسٹر برلا کو ایک روز کلکتہ کے کسی تجارتی دفتر کی عمارت میں اوپر جانا تھا۔ وہ جب

لفٹ میں سوار ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا۔ کیوں کہ یہ لفٹ صرف انگریز افسروں کے استعمال کے لیے تھی۔ جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں بھی ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ان کو ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جو چپراسیوں کے لیے مخصوص تھی۔ تاہم نوجوان برلا اس بنچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے۔

انگریزی دور میں مذکورہ بالا قسم کے تجربات نے مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات پیدا کردئے۔ وہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کے ساتھی بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرمایہ دار طبقہ کانگرس کے قریب آنے سے گھبراتا تھا۔ مگر مسٹر برلا نہایت دوربین اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے 1947 سے پہلے کی کانگرس میں 1947 کے بعد کی کانگرس کی جھلک دیکھ لی۔ انھوں نے قومی تحریک کے دور کے ہندستان میں آزادی کے دور کے ہندستان کا مشاہدہ کرلیا۔ انھوں نے اس راز کو پالیا کہ آج کے "لیڈر" کل کے "وزیر" ہوں گے، آج اگر وہ ان لیڈروں کی مدد کریں۔ تو کل وہ ان سے زبردست فائدے حاصل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کی تحریک کی باقاعدہ مالی مدد شروع کردی۔ کہا جاتا ہے کہ 1947 تک وہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اور کانگرس پارٹی کو تقریباً 20 کروڑ روپے دے چکے تھے۔

آزادی کے بعد مسٹر برلا کو اس کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ان کو ہر قسم کی غیر معمولی سہولتیں ملنا شروع ہوگئیں۔ انھوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ آزاد ہندستان کے سب سے بڑے صنعت کار بن گئے۔ آج برلا کا خاندان ہندستان کا سب سے زیادہ دولتمند خاندان سمجھا جاتا ہے۔

جو آدمی آج بوتا ہے وہی آدمی کل کاٹتا ہے۔ یہ بات آج کی دنیا کے لیے بھی صحیح ہے اور یہی کل کی دنیا کے لیے بھی۔

موجودہ دنیا ناکافی

گرسن ولوریا (Gerson Viloria) فلپائن کا ایک باشندہ ہے جس کی عمر 34 سال ہے۔ وہ ایک ٹریژری میں کلرک تھا۔ اس نے لوگوں کی طرف سے فرضی دستخط کر کے بہت سے لوگوں کی رقم وصول کر لی۔ اس کا مقدمہ فلپائن کی ایک عدالت میں پیش ہوا۔ جج کا نام رومیو اسکاریل (Romeo M. Excareal) تھا۔ جج نے تفصیلی سماعت کے بعد گرسن ویوریا کو 17 معاملات میں مجرم پایا۔ قانون کے مطابق اس طرح کے ایک جرم میں آدمی کو 10 سال قید بامشقت کی سزا ملنی چاہیے۔ اس کے مطابق جج نے مجرم کو 170 سال کی سزا دی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجرم پر 4625 ڈالر جرمانہ عائد کیا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سزائے قید میں اضافہ ہو جائے گا (ٹائمس آف انڈیا، 9 نومبر 1979)۔

مجرم کی عمر 34 سال ہو چکی ہے۔ اگر "قبل از وقت" اس کا خاتمہ نہ ہو بلکہ وہ اپنی عمر طبعی کو پورا کر کے مرے تب بھی اس کی موت کے وقت اس کی سزا کی مدت میں کم از کم سو سال باقی رہ جائیں گے۔

انسان کا ضمیر کسی عمل کا جو بدلہ یا کسی جرم کی جو سزا چاہتا ہے وہ موجودہ محدود دنیا میں ناممکن ہے۔ جو ہونا چاہیے اور جو ہو رہا ہے کے درمیان یہ تضاد بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لیے ایک اور دنیا ہونی چاہیے جہاں یہ تضاد ختم ہو جائے اور جو کچھ ہونا چاہیے وہی عملاً بھی ہونے لگے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ تھائی لینڈ میں ہوا۔ تھائی لینڈ کی ایک عدالت میں ایک خاتون پولیس کا مقدمہ پیش ہوا۔ اس کا نام مسز امساپ (Mrs. Phenphanchong Imsap) ہے۔ وہ سرحدی علاقہ پچابون (Petchabun) میں تعینات تھی۔ اس کا تعلق بیرونی افراد کے رجسٹریشن آفس سے تھا۔ اس نے رجسٹریشن کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا اور ان سے رشوت لینا شروع کیا۔ وہ سترہ سال تک حکومت کو اور اسی کے ساتھ لوگوں کو فریب

دیتی رہی۔اس مدت میں اس نے ناجائز طور پر تقریباً 25ہزار ڈالر کمایا۔عدالت نے خاتون پولیس کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس کو ایک ہزار ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دی۔جج نے اپنے فیصلہ میں مزید لکھا کہ مجرم کو پیرول پر رہائی یا رحم کی درخواست کی رعایت نہ دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو(ٹائمس آف انڈیا، 21مارچ 1981ء)۔

ظاہر ہے کہ خاتون پولیس عدالت کی سزا بھگتنے کے لیے مزید ایک ہزار سال تک زندہ نہیں رہے گی۔وہ یقینی طور پر اس سے بہت پہلے مر جائے گی۔پھر جج نے کیوں اس کو اتنی لمبی سزا دی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا جذبہ انصاف چاہتا ہے کہ جو شخص کوئی بڑا جرم کرے اس کو اس جرم کے بقدر لمبی سزا دی جائے۔مگر موجودہ دنیا میں کوئی جج عملاً ایسا کر نہیں پاتا۔وہ مجرم کو ''ایک ہزار سال'' کی سزا دینا چاہتا ہے مگر آدمی کی محدود عمر اس کو ایسا کرنے نہیں دیتی۔آدمی کے جرم کی عمر ''ایک ہزار سال'' ہے اس کے جینے کی عمر صرف ''پچاس سال'' آدمی کے عمل اور اس کی عمر دونوں میں یکسانیت نہیں۔یہ صورت حال ایک اور وسیع تر دنیا کا تقاضا کرتی ہے جہاں آدمی زیادہ لمبی عمر پائے تاکہ وہ پورے انصاف کے ساتھ اپنے عمل کا انجام پا سکے۔

عقیدۂ آخرت

جب بارش ہوتی ہے اس کا پانی دریاؤں میں بہہ نکلتا ہے۔یہ پانی اگر حد کے اندر ہو تو اس سے انسان کو مختلف قسم کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔اگر حد سے بڑھ جائے تو سیلاب آجاتا ہے اور نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔اس سے بچنے کے لیے دریاؤں پر بند بنائے جاتے ہیں۔

بند (Dam) کا مقصد یہ ہے کہ دریا کے اندر پانی کے بہاؤ پر روک قائم کی جائے اور جب بھی پانی حد سے بڑھتا ہوا نظر آئے تو اس کے رخ کو موڑ کر دوسری طرف کر دیا

جائے تا کہ وہ دریا میں بہنے کے بجائے علیحدہ بنے ہوئے عظیم گڑھے میں پہنچ جائے جس کو عام طور پر ذخیرۂ آب (Reservoir) کہا جاتا ہے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسان کا بھی ہے۔ مختلف انسان جب مل جل کر رہتے ہیں تو بار بار شکایت کی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں تلخیاں ابھرتی ہیں۔ اگر اس شکایت اور تلخی کو بڑھنے دیا جائے تو اختلاف، باہمی عناد اور جنگ ومقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔ انسانی معاشرہ یا انسانی جماعت کا درست طور پر کام کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

ان حالات میں انسان کے لیے بھی ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے جس کی طرف اس کے بڑھے ہوئے منفی جذبات کو موڑا جا سکے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ یہی کام کرتا ہے۔ وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والے جذبات کو انسان سے ہٹا کر خدا کی طرف موڑ دیتا ہے۔

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے آپ کو باپ سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد آپ کے دوسرے بھائی بنیامین کے ساتھ یہی حادثہ پیش آیا۔ ان واقعات کے بعد قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے اندر شدید جذبات پیدا ہوئے۔ آپ اپنے ان جذبات کا نشانہ اگر حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کو بناتے تو زبردست انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا۔ مگر آپ نے سارے جذبات کو خدا کی طرف موڑ دیا۔ آپ نے فرمایا: إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللهِ (12:86)۔ یعنی، میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کا شکوہ صرف اللہ سے کرتا ہوں۔

یہ کسی انسانی معاشرہ کے لیے عقیدۂ آخرت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ آخرت کا عقیدہ ہر آدمی کے پاس ڈائیورژن پول (Diversion pool) رکھ دیتا ہے جس کی طرف اپنے جذبات کے سیلاب کو پھیر سکے اس کو نقصان ہو تو خدا سے حسن تلافی کی امید قائم کرلے۔ اس کو غصہ آئے تو خدا کی خاطر وہ اپنے غصہ کو پی جائے اس کو کسی سے شکایت ہو تو اس کے معاملہ کو خدا کے حوالے کر دے۔

راکھ کی گواہی

دہلی کا ایک محلہ ہے جس کا نام نبی کریم ہے۔ یہاں ایک نوجوان مزدور اشوک نام کا رہتا تھا۔ 5 ستمبر 1980 کو وہ اپنے گھر کے پاس مرا ہوا پایا گیا۔ اچانک دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے اس کا انتقال ہوگیا۔ اس واقعہ کی کوئی رپورٹ پولیس میں درج نہ ہوسکی۔ اگلے دن اشوک کی لاش جمنا کے کنارے لے جائی گئی اور اس کو جلا کر دریا میں بہا دیا گیا۔

بظاہر معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اگر اس میں کوئی مجرمانہ سازش ہو تو اس کا پتہ لگانے کا کوئی امکان اب باقی نہیں رہا تھا۔ مگر جلائی ہوئی لاش کی راکھ نے وہ بات بتادی جو معروف ذرائع نہیں بتا سکے۔

اشوک کی ماں چمیلی دیوی کو بعض وجوہ سے یہ شبہ ہوا کہ اشوک طبعی موت نہیں مرا ہے بلکہ اس کے ایک دوست سریش (26 سال) نے اس کو شراب میں زہر دے کر مارا ہے۔ ماں نے 7 ستمبر کو پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولیس کے لیے اب واحد صورت یہ باقی تھی کہ وہ مردہ کی راکھ حاصل کرکے اس کی چھان بین کرے۔ رپورٹ کے بعد اسی دن ایک پولیس پارٹی لاش جلانے والے گھاٹ پر پہنچی۔ یہ ستمبر کی سات تاریخ تھی۔ مگر خوش قسمتی سے شمشان بھومی کے مذکورہ پلیٹ فارم پر ابھی تک کوئی دوسری لاش نہیں جلائی گئی تھی۔ پولیس نے راکھ جمع کی اور اس جلی ہوئی راکھ کو سنٹرل فارنسک سائنس لیبارٹری (آر کے پورم) میں جانچ کے لیے بھیج دیا۔ وہاں سے چھ ماہ بعد 13 مارچ 1981 کو رپورٹ نے تصدیق کردی کہ مرنے والا طبعی موت نہیں مرا بلکہ زہر کے سبب سے مرا ہے۔ 16 مارچ کو سریش کو قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا (ہندستان ٹائمس، 17 مارچ 1981)۔

اخباری رپورٹر نے اس واقعہ کی روداد درج کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہیں — مرے ہوئے آدمی کوئی بات نہیں بتاتے مگر ان کی جلی ہوئی راکھ بتا سکتی ہے:

Dead men tell no tales, but their ashes may.

انسان ظلم کرتا ہے اور ”ریکارڈ“ جلا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے عمل کا ثبوت مٹا دیا۔ وہ برائی کرتا ہے اور اپنی ہوشیاری اور طاقت سے اس پر پردہ ڈال کر یقین کر لیتا ہے کہ اس نے برائی کو ہمیشہ کے لیے چھپا دیا۔ مگر وہ بھول جاتا ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی دنیا میں نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا میں ہے۔ اور خدا نے اپنی دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہر عمل وجود میں آتے ہی کائناتی صفحہ پر اس طرح ثبت ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کو مٹانا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ ہر آدمی عمل کرنے کے لیے آزاد ہے، مگر وہ اپنے عمل کا نشان مٹانے کے لیے آزاد نہیں۔ آدمی اگر اپنی اس بےبسی کو جان لے تو وہ ظلم اور برائی کے قریب بھی نہ جائے۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹنے والی سورج کی ابتدائی شعائیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بےاختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بےمعنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بےحد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بےپناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بےنور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری

طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لیے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کامل زندگی ہونے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لیے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لیے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لیے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

موت کے آگے

فرانس کے لوئی یازدہم (1423-1483) نے ساٹھ سال تک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ آخر عمر میں وہ ایک بند قلعہ میں رہنے لگا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ قلعہ کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی تاکہ کوئی اس کے قریب نہ پہنچ سکے۔ قلعہ کی دیواروں پر ہر وقت چالیس تیر انداز بیٹھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چالیس گھڑسوار دن رات اس کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی بلا اجازت قلعہ کے اندر آنے کی کوشش کرے اس

کو پکڑ کر اسی وقت قتل کر دیا جائے۔قلعہ کے اندر بادشاہ کے لیے ہر قسم کا عیش و عشرت کا سامان کیا گیا تھا تا کہ بادشاہ کا دل کبھی غمگین نہ ہونے پائے۔

لوئی یازدہم کو زندہ رہنے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے ہرگز نہ بولا جائے۔ایک ماہر ڈاکٹر ہر آن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔اس ڈاکٹر کو دس ہزار سنہری کراون ماہوار دیے جاتے تھے۔اس وقت یورپ کے کسی میدان جنگ میں چالیس سال کام کر کے بھی ایک فوجی افسر اتنی تنخواہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

تاہم ان میں سے کوئی چیز بادشاہ کو بڑھاپے اور کمزوری سے نہ بچا سکی۔آخر عمر میں وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ مشکل سے وہ کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔اس کے باوجود اس کی جینے کی خواہش وہم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔اس کو کسی نے بتایا کہ کچھوے پانچ سو سال تک جیتے ہیں اور وہ زندگی بخش خواص کے مالک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو تین بحری جہاز دیکر جرمنی اور اٹلی روانہ کیا تا کہ وہاں سے اس کے لیے بحری کچھوے لے آئیں۔یہ کچھوے اس کے قریب ایک بڑے حوض میں رکھے گئے تا کہ اس کو زندگی کا فیضان عطا کر سکیں۔

آخر کار لوئی پر فالج کا حملہ ہوا اور 30 اگست 1483 کو موت نے اس پر قابو پا لیا۔اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو نہیں جیت سکتا۔اس کی زبان سے جو آخری الفاظ مرنے سے پہلے نکلے وہ یہ تھے:

"میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں"

تاہم اس کی تمام کوششیں بے کار ہو گئیں۔30 اگست 1483 کو وہ مر گیا۔آخر کار بادشاہ فرانس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔

عقل مند کون

انسان کو اس کے پیدا کرنے والے نے بہترین بناوٹ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر بڑھاپا آتا ہے اور اس کی بہترین بناوٹ کو کھا جاتا ہے۔ انسان کو اعلیٰ ترین لذتوں کا احساس دیا گیا ہے۔ مگر ہزار کوشش کے بعد جب وہ ان لذتوں کو پالیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی پیدائشی محدودیتوں (Limitations) کی وجہ سے وہ ان لذتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ انسان کو ایک ایسی زمین دی گئی ہے جو اپنی حسین فضاؤں اور قیمتی سازوسامان کے ساتھ ساری کائنات میں ایک انتہائی نادر استثناء ہے مگر آدمی اس دنیا کو استعمال نہیں کر پاتا کہ موت آتی ہے اور اس کو اس کی پسند کی دنیا سے جدا کر دیتی ہے۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا ہماری اصل دنیا نہیں۔ اصل دنیا وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے۔ موجودہ دنیا اس آئندہ آنے والی دنیا کا ابتدائی تعارف ہے۔ یہ لذتوں کے اصل خزانہ کا لمحاتی تجربہ ہے۔ یہ ابدی بہشت کا صرف ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ آدمی حال کے آئینہ میں مستقبل کے عظیم امکانات کو دیکھے۔ وہ ناقص فلاح میں کامل فلاح کا راز پالے۔

عقلمند انسان وہ ہے جس کو دنیا کا یہ وقتی تجربہ اس کو ابدی دنیا کی یاد دلائے۔ وہ اپنے آپ کو زندگی کے آنے والے دور کے لیے تیار کرے۔ وہ اپنی عمر کے موجودہ مرحلہ کو اس طرح استعمال کرے کہ وہ اس کے لیے عمر کے اگلے مرحلہ میں کامیابی کا زینہ بن جائے۔

اس کے برعکس، نادان وہ ہے جو وقتی اور فانی لذتوں میں گم ہو جائے۔ جو "آج" میں مشغول ہو کر "کل" کو بھول جائے۔ ایسا آدمی اس نادان مسافر کی طرح ہے جو ریلوے اسٹیشن کی بنچ خالی پا کر اس پر سو جائے۔ وہ اسی طرح بے خبر پڑا رہے۔ یہاں تک کہ اس کی ٹرین اپنے وقت پر آئے اور اس کو لیے بغیر آگے چلی جائے۔

موجودہ دنیا آخرت کے سفر کا راستہ ہے۔جس طرح ایک عام مسافر اس وقت اپنی منزل پر نہیں پہنچتا جب کہ وہ راستہ کی چیزوں میں کھو گیا ہو۔اسی طرح جو شخص دنیا کی دل فریبیوں میں گم ہوجائے وہ کبھی آخرت کے اعلیٰ مقامات تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔وہ دنیا میں بھٹک کر رہ جائے گا اور بالآخر اس کے حصہ میں حسرت کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔

ناکام موت

مسٹر بی ڈی کھوبر اگاڑ (پیدائش 1925) 9 اپریل 1984 کو دہلی کے پنت اسپتال میں مرگئے۔وہ ایک ہریجن لیڈر تھے۔انھوں نے اپنی قوم کے ساتھ اونچی ذات والوں کے امتیازی سلوک کو دیکھا۔ان کے اندر اس کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔جب انہیں معلوم ہوا کہ اس امتیاز کی بنیاد خود اس ہندستانی مذہب میں ہے جس سے وہ اب تک اپنے کو منسوب سمجھے ہوئے تھے تو انھوں نے مذہب کی تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ڈاکٹر امبیڈکر (1891-1956) اور لاکھوں دوسرے ہریجنوں کے ساتھ وہ بدھزم میں داخل ہوگئے۔مگر اس کے باوجود ہریجنوں کے ساتھ سماجی امتیاز ختم نہیں ہوا۔

اب کھوبر اگاڑ اور ان کے ساتھیوں نے دوسری تدبیر کی۔انھوں نے ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی۔انھوں نے چاہا کہ جو مسئلہ تبدیلیٔ مذہب سے حل نہیں ہوا،اس کو تبدیلی حکومت کے ذریعہ حل کیا جائے۔مگر یہ اقدام بھی کامیاب نہیں ہوا۔خود ری پبلکن پارٹی میں اندرونی اختلاف پیدا ہوگئے۔وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی۔مایوس کھوبر اگاڑ 59 سال کی عمر میں اس دنیا سے چلے گئے۔

مسٹر کھوبر اگاڑ اپنی زندگی کے مسئلہ کا حل تلاش کرتے رہے جو "59 سال" میں ختم ہوجانے والی تھی۔آج اگر کوئی شخص ان سے پوچھے تو یقیناً وہ کہیں گے —افسوس کہ میں

وقتی زندگی کے مسائل میں الجھا رہا اور اپنی اس زندگی کے لیے کچھ نہیں کیا جس سے ابدی سابقہ پیش آنے والا تھا۔

لوگ آج کے مسائل میں اتنا مشغول ہیں کہ انہیں کل کے مسائل پر سوچنے کی فرصت نہیں۔ وہ حال کے اندر اتنا گم ہیں کہ ان کو یہ پروا نہیں کہ وہ مستقبل کے بارے میں سوچیں۔ لوگ اسی طرح غفلت میں پڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی موت آجاتی ہے۔ انسانوں میں الجھا ہوا آدمی اچانک اپنے آپ کو خدا کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے۔ دنیا کے مسائل کو سب کچھ سمجھنے والا آدمی وہاں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں صرف آخرت کے مسائل کسی آدمی کے لیے سب کچھ ہوں گے۔ ظواہر کو اہمیت دینے والا آدمی اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں حقیقت کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

انسان کو دیکھیے تو وہ کتنا حیرت انگیز وجود معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی صلاحیتیں اتنی عجیب ہیں کہ ساری کائنات میں اس سے زیادہ عجیب کوئی چیز نہیں۔ مگر کیسا دردناک انجام انسان کے حصہ میں آیا ہے۔ کیسی قیمتی زندگی کیسے بے قیمت انجام پر ختم ہوجاتی ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس کو سوچے، کوئی نہیں جو زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے فکرمند ہو۔

کوئی بچا نہ سکے گا

مغربی ملکوں کے لوگ عام طور پر گائے کا گوشت کھانا بہت پسند کرتے ہیں۔ آج کل کے زمانہ میں مغرب کے لوگ کثرت سے ہندستان آتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہاں کسی "فائیو اسٹار ہوٹل" میں ٹھہرتے ہیں تو وہ توقع رکھتے ہیں کہ ہوٹل کی طرف سے ان کو ان کی تمام مطلوب چیزیں فراہم کی جائیں گی جن میں اپنی پسند کی غذا بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ چنانچہ ہوٹل والے اپنے بیرونی گاہکوں کے سامنے جو مینو کارڈ پیش کرتے ہیں ان کی

غذائی فہرست میں گائے کا گوشت (Beef steak) کالفظ شامل رہتا ہے۔

چوں کہ ہندستان میں گائے کا گوشت ممنوع ہے،اس کی خبر اخبار میں چھپی تو اس پر سخت تنقید ہوئی۔ ایک ایم پی نے پارلیمنٹ میں اس پر سوال کر دیا۔حکومت ہند نے اس سلسلے میں ہوٹل والوں سے باز پرس کی۔ ہوٹل والوں کا جواب یہ تھا کہ ہم اپنے گاہکوں کو "بیف" دیتے ہیں اور بیف انگریزی ڈکشنری کے مطابق گائے اور بھینس دونوں کے گوشت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اخباری رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، 5 مئی 1984) کے مطابق حکومت ہند کے وزیر سیاحت نے 4 مئی 1984 کو پارلیمنٹ میں بیان دیا۔انھوں نے آکسفورڈ ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی پڑھ کر سنائے جس میں بھینس کا گوشت بھی شامل تھا نہ کہ صرف گائے یا بیل کا گوشت:

The minister read out Oxford dictionary meaning of "beef" which included the flesh of buffalo as well , and not, merely that of cow or ox.

اس خبر پر اخبار نے یہ سرخی لگائی ہے: "ڈکشنری نے فائیو اسٹار ہوٹل کو بچالیا"

موجودہ دنیامیں اس قسم کے واقعات دیکھ کر آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ موت کے بعد کی دنیا بھی ویسی ہی ایک دنیا ہوگی جیسی موت سے پہلے کی دنیا۔جس طرح "ڈکشنری" موجودہ دنیا میں ہم کو بچالیتی ہے، اسی طرح وہاں بھی ہم کوئی نہ کوئی ڈکشنری پالیں گے جو ہم کو وہاں کی آفتوں سے بچالے۔ مگر اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔ موجودہ دنیامیں آدمی کا معاملہ اپنے جیسے انسان سے ہے اس لیے وہ لفظی کرتب دکھا کر اس سے بچ جاتا ہے۔مگر آخرت میں اس کا معاملہ مالک کائنات سے ہوگا۔اور مالک کائنات کے سامنے کسی قسم کا کوئی کرتب کام آنے والا نہیں۔

آخرت کی دنیامیں حقیقی تدبیر آدمی کو بچائے گی نہ کہ کوئی لفظی تدبیر۔

رات کے بعد دن

كَلَّا وَالْقَمَرِ ۔ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۔ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۔ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۔ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ۔ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (74:32-38)۔ یعنی، قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ جانے لگے اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جائے۔ وہ دوزخ بڑی بھاری چیز ہے جو انسان کے لیے بڑا ڈراوا ہے، تم میں سے ہر اس آدمی کے لیے جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے ہر آدمی اپنے کیے میں پھنسا ہوا ہے۔

زمین پر ہر روز ایسا ہوتا ہے کہ یہاں رات آتی ہے اور زمین گہری تاریکی میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے بعد دن نکلتا ہے اور ہر چیز دوبارہ سورج کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ واقعہ آخرت کے معاملہ کی تمثیل ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، آخرت میں ہر آدمی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ آج ہماری زندگی "رات" کے دور سے گزر رہی ہے، موت کے بعد ہم "دن" کے دور میں پہنچ جائیں گے۔

آج آدمی ایک قسم کے پردہ میں ہے۔ وہ دلیل پر قائم نہ ہونے کے باوجود خوش نما الفاظ بول کر لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں ڈالے ہوئے ہے۔ کسی کی دنیوی شہرت ومقبولیت اس کی مجرمانہ حیثیت کے لیے پردہ بن گئی ہے۔ کسی کے دولت واقتدار نے اس کو موقع دیا ہے کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے مفلس ہونے کے باوجود مادی رونقوں میں اپنے معنوی افلاس کو ڈھانک سکے۔ کوئی اندر سے بے دین ہے مگر کچھ رسمی اعمال کا اہتمام کر کے ظاہر کر رہا ہے کہ وہ خدا پرست اور دیندار ہے۔ لوگ ظلم اور بے انصافی میں جی رہے ہیں مگر اپنی نمائشی تدبیروں سے وہ عوام کو اس دھوکے میں ڈالے ہوئے ہیں کہ وہ عین حق وانصاف پر قائم ہیں۔

مگر جب آخرت کا سورج طلوع ہوگا تو وہ تاریکی کے ان تمام پردوں کو پھاڑ دے گا۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں دکھائی دینے لگے لگا۔ اس وقت صاف نظر آئے گا کہ کون شخص اندر سے جانور تھا اور بظاہر انسانی صورت میں چل رہا تھا۔ کون شخص ناحق پر تھا اگرچہ وہ خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو حق پرست ثابت کیے ہوئے تھا۔ کون شخص اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش میں مبتلا تھا اگرچہ زبان سے وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔

اس کے مقابلہ میں کچھ اور لوگ ہوں گے جن کی حقیقت آخرت کے دن لوگوں کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھیں گے کہ ایک شخص جس کو انھوں نے اس کے معمولی حالات کی بنا پر غیر اہم سمجھ لیا تھا وہ اپنے اندر اہمیت کا پہاڑ لیے ہوئے تھا۔ ایک شخص جس کو دنیا کی پررونق مجلسوں میں کہیں عزت کی جگہ نہیں ملتی تھی وہ فرشتوں کی زیادہ باعزت مجالس میں اپنے صبح وشام کے اوقات گزار رہا تھا۔ ایک شخص جس کو وقت کے بڑوں نے اپنے نزدیک رد کر دیا تھا وہی وہ شخص تھا جس کو خدا کی طرف سے مقبولیت کی سند ملی ہوئی تھی۔ ایک شخص جس کو دنیا کے لوگ بے دین قرار دے کر حقارت کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کا نام خدا کے یہاں دین داروں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔

سب سے بڑا فریب

ایک نوجوان نے سی اے کا کورس کیا۔ اس کے بعد امریکا سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ دونوں امتحانوں میں وہ فرسٹ آئے۔ اس کے بعد ان کے لیے ترقیات کے دروازے کھل گئے۔ وہ عرب امارات گئے۔ وہاں ان کو پانچ ہزار درہم ماہوار کی ملازمت مل گئی۔ جلد ہی بعد انہیں ایک سعودی وفد نے انٹرویو کے لیے بلایا۔ انٹرویو کامیاب رہا۔ فوراً ہی ان کو عرب میں ایک جگہ مل گئی جہاں ان کی تنخواہ 15 ہزار ریال ماہوار تھی۔ وہ اسی طرح ترقی کرتے

رہے یہاں تک کہ ان کی آمدنی ہندستانی سکہ میں ایک لاکھ روپیہ ماہوار تک پہنچ گئی۔

ترقی کے یہ مواقع جو موجودہ زمانہ میں کھلے ہیں وہ وقت کا سب سے بڑا فتنہ ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی جھوٹی بنیادوں پر اپنے کو "فرسٹ کلاس" سمجھتا ہے۔ حالاں کہ حقیقت کے اعتبار سے وہ "تھرڈ کلاس" ہوتا ہے۔وہ جھوٹی بنیادوں پر اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے، حالاں کہ وہ کامیابی کی منزل سے بہت دور ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ان امکانات نے بہت سے لوگوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پائیں جہاں ان کے رہنے کے لیے سجے ہوئے مکانات ہوں۔سفر کے لیے شاندار گاڑیاں ہوں۔بینک بیلنس ہو۔ان کی جیب میں کریڈٹ کارڈ ہو جس کے ذریعے وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اپنے لیے حسب منشاء رقم حاصل کرسکیں۔

یہ چیزیں جدید انسان کے لیے زبردست فتنہ بن گئی ہیں۔ہر آدمی اپنے آپ کو مادیت کے وقتی بازار میں فروخت کر رہا ہے۔ہر آدمی کامیابی کے جھوٹے فریب میں مبتلا ہے۔ہر آدمی فرضی خوش خیالیوں کا ایک محل اپنے گرد بنائے ہوئے ہے۔

مگر حقیقت کے اعتبار سے ان چیزوں کی کوئی قیمت نہیں۔امریکی وفاداری کا تمغہ روس میں بے قیمت ہوتا ہے۔اسی طرح موجودہ دنیا کی مہارتیں آخرت میں بالکل بے وزن قرار پائیں گی۔آہ وہ انسان جو جھوٹے فریب میں جی رہا ہے۔اس کے باوجود وہ سمجھتا ہے کہ وہ حقیقت کے پہاڑ پر اپنا محفوظ قلعہ بنائے ہوئے ہے۔

آخرت کے بغیر

ارنسٹ ہیمنگوے (1899-1961) ایک امریکی فوجی تھا۔وہ 1961 میں انتقال کر گیا۔وہ 1918 میں اٹلی کی جنگ میں شریک تھا۔اس نے اپنی فوجی زندگی کے درمیان جو خطوط لکھے تھے وہ کتابی صورت میں شائع کردیے گئے ہیں۔

اٹلی کی جنگ میں جب وہ زخمی ہو گیا تو اس نے اسپتال سے اپنے گھر والوں کے نام کچھ خطوط لکھے ان میں سے ایک خط میں حسب ذیل الفاظ درج تھے:

There are no heroes in this war. All the heroes are dead. And the real heroes are the parents. They suffer a thousand times more. And how much better to die in all the happy period of disillusioned youth, to go out in a blaze of light, than to have your body worn out and illusions shattered.

اس جنگ میں کوئی ہیرو نہیں۔ تمام ہیرو مر چکے ہیں اور اصل ہیرو ان کے والدین ہیں، ایک ہزار گنا زیادہ مصیبت اٹھاتے ہیں۔ اور یہ کتنا اچھا ہے کہ جوانی کے پر کیف زمانہ میں آدمی کی موت آجائے۔ روشن شعلہ میں داخل ہونا اس سے بہتر ہے کہ تمہارا جسم بوڑھا اور فرسودہ ہو جائے اور سارے فریب منتشر ہو چکے ہوں (لائف، جون 1981)۔

ان الفاظ کے پیچھے زندگی کا کتنا مایوس تصور چھپا ہوا ہے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ جو آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کا آخری انجام یہ ہے کہ سو سال یا اس سے کم مدت میں وہ بوڑھا اور ناکارہ ہو کر مر جائے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر زندگی بالآخر اسی کا نام ہے تو اس سے بہتر ہے کہ جوانی کے امید بھرے دور میں آدمی ہیروانہ اقدام کر کے اپنا خاتمہ کر لے۔

زندگی کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو بوڑھا ہو کر مرنا بھی بامعنی ہو جاتا ہے اور روشن شعلہ میں داخل ہونا بھی۔ مگر جب ایک شخص زندگی کو آخرت سے الگ کر کے دیکھتا ہے تو اس کو اپنے چاروں طرف مایوسی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کے تصور کو شامل نہ کیا جائے تو موجودہ زندگی اپنی تمام معنویت کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد اتنی ناقابل فہم ہو جاتی ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہنا بھی آدمی کو بے معنی نظر آنے لگے۔

جاننے کے بعد

پروفیسر مجیب (1902-1985) ہندستان کے چوٹی کے دانشوروں میں سے تھے۔ ان کی تعلیم خالص مغربی طرز کے اداروں میں ہوئی۔ انھیں شیکسپیئر کے ڈراموں کے بڑے بڑے حصے زبانی یاد تھے۔ ہندستان میں تعلیم کے بعد بیرونی ملکوں میں مزید تعلیم کے لیے گئے۔ وہ ایک خوش فکر آدمی تھے۔ وہ اپنے کسی ساتھی کو رنجیدہ دیکھتے تو کہتے کہ بھئی مسکرائیے اور دور تک دیکھیے۔ وہ اردو انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانیں یکساں طور پر جانتے تھے۔

دسمبر 1972 میں پروفیسر مجیب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق ان کے دماغ کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا مگر اس کے بعد ان کا حافظہ جاتا رہا۔ پروفیسر مجیب پانچ زبانوں کے ماہر تھے مگر آپریشن کے بعد وہ تمام زبانیں بھول گئے۔ حتی کہ اردو سمیت تمام زبانوں کے حروف تہجی تک انھیں یاد نہ رہے (جامعہ، دسمبر 1984)۔

دس سال سے زیادہ عرصہ تک وہ اسی حال میں اپنے اوکھلا (دہلی) کے مکان میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ 20 جنوری 1985 کو ان کا انتقال ہو گیا جب کہ ان کی عمر 82 سال ہو چکی تھی۔ وہ 1948 سے 1973 تک جامعہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔

قرآن میں انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — اللہ نے تم کو پیدا کیا۔ پھر وہ تم کو موت دیتا ہے۔ اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچ جاتے ہیں کہ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانیں۔ بے شک اللہ علیم و قدیر ہے (16:70)۔

جوانی کے بعد بڑھاپا آنے کا واقعہ آدمی کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ وہ اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی اصل حقیقت کو جانے۔ وہ جانے کہ اس کا علم ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے۔ وہ جب چاہے دے اور جب چاہے چھین لے۔ آدمی کی قوت اگر اس کی ذاتی ہو تو وہ کبھی اس سے نہ چھنے۔ مگر قوت کا ملنا اور پھر اس کا چھن جانا اس بات کی

علامت ہے کہ انسان دئے سے پاتا ہے۔ دینے والا اگر نہ دے تو وہ خود سے نہیں پا سکتا۔
یہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے مگر نہ "بوڑھے" اس سے نصیحت لیتے ہیں جن پر یہ واقعہ گزرتا ہے اور نہ "جوان" اس سے سبق حاصل کرتے ہیں جو اس کو اپنے سامنے ہوتا دیکھتے ہیں۔

آزمائش کا قانون

کوئی آدمی حقیقی معنوں میں مومن اور مسلم ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ فتنہ (آزمائش) کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اللہ کو اگرچہ ہر ایک کے دل کا حال معلوم ہے مگر اللہ کی سنت یہ ہے کہ آزمائش کے حالات پیدا کر کے ہر آدمی کے اندر کو باہر لایا جائے تاکہ اللہ آخرت میں اس کے بارے میں جو فیصلہ کرے اس سے انکار کی مجال کسی کو نہ ہو۔

آزمائش کا مطلب ایسی صورت حال آدمی کے سامنے لانا ہے جہاں حسن عمل کے تمام اضافی اسباب حذف ہو گئے ہوں، صرف ایک ہی سبب (اللہ کا ڈر) باقی رہ گیا ہو۔ اسی لیے معمول کے حالات یا روز مرہ کے عمل میں آدمی کی آزمائش نہیں ہو سکتی۔ آزمائش کے لیے ضروری ہے کہ غیر معمولی حالات سامنے لائے جائیں۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ آپ خوش اخلاق ہیں یا نہیں، تو اس کا تجربہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا جو آپ سے نیازمندی کی باتیں کر تا ہو۔ کیوں کہ نیازمندی دکھانے والے کے ساتھ تو ہر آدمی خوش اخلاقی ہی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اسی طرح اس کا تجربہ ایک طاقتور آدمی کے ذریعہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ طاقتور شخصیت کے سامنے ہر آدمی خوش اخلاق بن جاتا ہے۔ کسی کی خوش اخلاقی کو جانچنے کا ذریعہ ایک ایسا شخص ہی بن سکتا ہے جو کمزور اور معمولی آدمی ہو اور اسی کے ساتھ وہ ایسے انداز میں کلام کرے جو ناگواری پیدا کرنے والا ہو۔

اسی طرح کسی کی انسانیت دوستی کی جانچ اس طرح نہیں ہو سکتی کہ ایک شاندار اجلاس کیا جائے اور اس کے بعد اس آدمی سے کہا جائے کہ سجے ہوئے اسٹیج پر کھڑے ہو کر تم انسانیت کے موضوع پر ایک تقریر کرو۔ کسی کی انسانیت دوستی کی جانچ اس وقت ہوتی ہے

جب ایک بے قیمت آدمی اس کے دروازے پر پہنچتا ہے اوراس سے کہتا ہے کہ میں فلاں مصیبت میں پھنس گیا ہوں تم انسانیت کے ناتے میری مدد کرو۔ کوئی شخص فیاض ہے یا نہیں اس کا اندازہ اس وقت نہیں ہوتا جب ایک شان دار موقع سامنے آئے اوراس میں پیسہ دے کر لوگ آناً فاناً شہرت وعزت کی منزلیں طے کررہے ہوں۔ آدمی کی فیاضی کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس کو ایک ایسی خاموش مد میں پیسہ دینا ہو جس میں اخباری شہرت کا کوئی موقع نہیں۔ کسی شخص کے انصاف کا حال اس وقت معلوم نہیں ہوتا جب کہ متعلقہ فریق سے تعلقات خوش گوار ہوں بلکہ آدمی کی انصاف پسندی یا بے انصافی اس وقت کھلتی ہے جب کہ دونوں فریقوں کے درمیان تلخی پیدا ہوگئی اور انصاف کرنا بظاہر اپنے حریف کو فائدہ پہنچانے کے ہم معنی بن گیا ہو۔ آدمی اللہ سے ڈرتا ہے یا نہیں اس کا حقیقی اندازہ ان اعمال میں نہیں ہوتا جو آدمی انسانوں سے دور تسبیح ونوافل کی صورت میں کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کا سابقہ انسانوں سے پڑے اور ایک شخص کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنا اس قیمت پر ہو کر آدمی اپنی انا کو کچلے اور اپنی مصلحتوں کو برباد کرے — آدمی معمول کے حالات میں خدا پرستی والے عمل کرتا ہے۔ مگر خدا جب غیر معمولی مواقع پیدا کرکے اس کی خدا پرستی کو جانچنا چاہتا ہے تو عین اس وقت وہ خدا پرستی کا ثبوت دینے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

موت جب آتی ہے

جے۔ اے دیو 1923ء میں شملہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہایت محنت سے تعلیم حاصل کی۔ بالآخر انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس کا امتحان پاس کیا وہ مزید تعلیم کے لیے برطانیہ بھی گئے۔ اس کے بعد ان کو حکومت میں اچھی ملازمت مل گئی۔ جولائی 1979 میں وہ اپنی اعلیٰ ترین ترقی کے منصب پر پہنچ گئے جب کہ ان کو ڈیفنس سکریٹری کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ مگر اس ترقی پر ان کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ 10 اپریل 1980 کو

57 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ 11 اپریل کو مسٹر دیو کا جسم نگم بودھ گھاٹ پر اس وقت جلادیا گیا جب کہ ہندستانی فوج کے تینوں سپہ سالاران کے اظہار عقیدت کے لیے گھاٹ پر موجود تھے۔ بری اور بحری اور ہوائی فوجوں کے اعلیٰ ترین افسران جو ساٹھ کروڑ انسانوں کے اس ملک پر کسی بھی حملہ کو پسپا کرنے کی پوری طاقت رکھتے تھے وہ اپنے حاکم اعلیٰ کو موت کے حملہ کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے بے بس ہو گئے۔

1980 میں مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں اندرا گاندھی اور ان کے بیٹے سنجے گاندھی کی پارٹی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عام طور پر سمجھا جانے لگا کہ اب سنجے گاندھی ہندستان کے وزیر اعظم ہوں گے۔ مگر وزارت عظمیٰ کی عین چوکھٹ پر پہنچ کر اچانک 33 سال کی عمر میں ان کا خاتمہ ہو گیا۔ 23 جون 1980 کی صبح کو سنجے گاندھی ایک نئے امریکی ہوائی جہاز میں تفریحی سواری (Joy Ride) کے لیے نکلے۔ ان کا دوسٹیوں کا جہاز صفدر جنگ کے ہوائی اڈے سے اڑ کر ابھی فضا میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک اس کے انجن نے کام کرنا بند کر دیا اور دھماکہ کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ جہاز کے ملبہ سے اس کے دونوں مسافر (سنجے گاندھی اور کیپٹن سکسینہ) مردہ اور کچلی ہوئی حالت میں باہر نکالے گئے۔ سنجے گاندھی کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ حادثہ سے صرف ایک دن پہلے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر جگ موہن کے ساتھ کار پر سفر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کار ہو یا ہوائی جہاز، وھیل پر اگر میں ہوں تو کچھ نہیں ہوگا"۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ اگلے دن آنے والی صبح صرف اس لیے آرہی ہے کہ ان کے اس اعتماد کی ہمیشہ کے لیے تردید کردے۔

ٹائمس آف انڈیا (24 جون 1980) نے ان شاندار امکانات کا ذکر کیا ہے جن کے بالکل کنارے سنجے گاندھی پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

What an irony that he should die so soon afterwards.

عین اس وقت جب کہ آدمی اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے

اور اس کی کامیابیوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ گویا کہ وہ اس کامیابی کی نفی کر رہی ہو جس کو آدمی اپنے لیے کامیابی سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ بے قیمت انسان

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت ہے جو اس کا استقبال کرنے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ 24 جون کی شام کو ایک طرف شانتی ون میں سنجے گاندھی کا مردہ جسم جلایا جا رہا تھا، دوسری طرف وہاں کھڑے ہوئے ان کے ہزاروں معتقدین یہ نعرہ لگا رہے تھے:

جب تک سورج چاند رہے، سنجے تیرا نام رہے

انسان "سورج چاند کے رہنے تک" زندہ رہنا چاہتا ہے مگر موت اس قدر بے رحمی کے ساتھ اس کو اس دنیا سے اٹھا لیتی ہے جیسے اس کے نزدیک نہ انسان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ اس کی خواہشوں کی۔

انسان اپنی عظمت کا قلعہ تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کچل کر بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو مٹا کر یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لیے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمہاری آرزوؤں کی تکمیل نہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا سبق وہ ہے جو موت کے ذریعہ ملتا ہے۔ موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایسے سوال کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کرنے کی امید کر سکیں۔ موت دراصل زندگی

کا پیغام ہے۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ اپنی حقیقی زندگی کی تعمیر کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

موت انسانی زندگی کا سب زیادہ عبرت ناک واقعہ ہے۔ وہ آدمی کو آسمان میں اٹھا کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ آدمی کو زمین پر ختم کر کے اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ موت کے سامنے ہر آدمی بالکل بے بس ہے، موت کے سامنے کسی بھی شخص کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ واقعہ ہماری زمین پر روزانہ لاکھوں کی تعداد میں پیش آتا ہے۔ مگر انسان غفلت کی ایسی شراب پیے ہوئے ہے کہ اس کے باوجود اس کی مدہوشی ختم نہیں ہوتی۔ آدمی دوسرے کو مٹانے کا منصوبہ بناتا ہے حالاں کہ موت خود اس کو مٹانے کے لیے اس کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ آدمی دوسرے کو برباد کرنے کی سازش کرتا ہے حالاں کہ اپنی سازش کی تکمیل سے پہلے وہ خود موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ آدمی دوسرے کا اعتراف نہیں کرتا، وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی بڑائی کا تحفظ کر رہا ہے۔ حالاں کہ اگلے ہی لمحہ موت آ کر اس کی بڑائی کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ انسان "خدا" بننا چاہتا ہے مگر موت اس کو بتاتی ہے کہ وہ صرف ایک بے قیمت "آدمی" ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدائی منصوبہ

خدا کا منصوبہ

خدا نے اپنی پسند کی ایک دنیا بنائی اور اس کا نام جنت رکھا۔ یہ جنت ابدی خوشیوں اور راحتوں کی دنیا ہے۔ وہاں نہ دکھ ہے اور نہ شور وغل۔ نہ رنج ہے اور نہ حادثہ۔ وہ ہر قسم کی کلفتوں سے آزاد دنیا ہے ہر قسم کی نعمتیں وہاں بے حساب مقدار میں اکٹھا کی گئی ہیں۔ وہاں آدمی نہ مرے گا اور نہ کبھی اکتائے گا اور نہ کبھی کسی طرح کے غم سے دوچار ہوگا۔

یہی وہ دنیا ہے جس کی طلب ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے۔ ہر آدمی ایک نادیدہ جنت کی تلاش میں ہے۔ مگر یہ لامحدود جنت کوئی شخص موجودہ محدود دنیا میں نہیں پاسکتا ہے۔ خدا نے اس جنت کو موت کے بعد آنے والی دنیا میں رکھ دیا ہے۔

تاہم یہ جنت اپنے آپ کسی کو نہیں مل جائے گی۔ یہ صرف اس خوش نصیب آدمی کا حصہ ہے جو موجودہ زندگی میں جنت والے عمل کرے۔ خدا نے ہماری زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہماری زندگی کا مختصر حصہ موجودہ دنیا میں ہے اور اس کا بقیہ تمام حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں — موجودہ دنیا کو خدا نے عمل کی جگہ بنایا ہے اور بعد کی دنیا کو عمل کا بدلہ پانے کی جگہ۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر موجودہ دنیا میں آدمی کو اختیار دے دیا گیا ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی برائے آزمائش ہے نہ کہ برائے انعام۔ جو آدمی وقتی آزادی کی بنا پر غلط فہمی میں نہ پڑے اور اپنے آپ کو حقیقتِ حال کے مطابق بنائے وہ جنت میں بسایا جائے گا۔ اور جو شخص آزادی پا کر سرکشی کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اس کائنات میں سارا اختیار حقیقۃً صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر آدمی ہر لمحہ اس کی مٹھی میں ہے۔ جو آدمی اس حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دے وہ جنت کا مستحق بنا۔ اور جو

شخص حقیقت واقعہ سے انحراف کرکے خود ساختہ طریقوں پر چلے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ آخرت کی نعمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

مستقبل کا یقین

ڈارٹنگٹن ہال (Dartington Hall) انگلینڈ کا ایک ممتاز اسکول ہے۔ وہاں ایک طالب علم کو (1983 میں) سالانہ پانچ ہزار پونڈ تعلیمی فیس دینی پڑتی ہے۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر بلیکشا (Dr. Lyn Blackshaw) نے 11 جولائی 1983 کو اسکول اسٹاف کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں طلبہ کو اپنی ڈگری بے قیمت معلوم ہونے لگی ہے۔ ان کو یقین نہیں ہے کہ وہ تعلیم کے حصول کے بعد اپنی پسند کے مطابق کوئی روزگار حاصل کرلیں گے۔ اس بے یقینی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اندر جھنجھلاہٹ کی نفسیات پیدا ہو رہی ہے۔ اور وہ کثرت سے جرائم کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا:

The worst thing we can do for our children is to destroy their faith in the future.

سب سے بری چیز جو ہم اپنے بچوں کے لیے کرسکتے ہیں وہ یہ ہے کہ مستقبل کے بارے میں ان کے یقین کو برباد کردیں (سنڈے ٹائمس، لندن 4 ستمبر 1983)۔

پرنسپل کے اس جملہ پر ہم یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے بعد روزگار حاصل کرنے کا مسئلہ انسان کے "مستقبل" کا صرف ایک چھوٹا سا جزء ہے۔ مستقبل کا مسئلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے موجودہ مرحلہ سے لے کر موت کے بعد کی ابدی زندگی تک چلا گیا ہے۔

انسان کو کامل اطمینان اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کو اس کے پورے مستقبل کے بارے میں پر امید نقطہ نظر مل جائے۔ جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے جتنے غالب افکار ہیں سب نے موت کے بعد ابدی مستقبل کے بارے میں انسان کے

یقین کو برباد کر دیا ہے یہی جدید انسان کے عدم اطمینان کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ ہے۔

انسان کو جب تک ایک ایسا کامل نقطۂ نظر نہ دیا جائے جو اس کے حال اور مستقبل کو ابدی طور پر پُرامید بناتا ہو وہ کبھی حقیقی معنوں میں مطمئن نہیں کرسکتا۔ نوجوان کو اپنے دنیوی مستقبل کا مسئلہ پریشان کرتا ہے مگر جب وہ اپنا دینوی مستقبل تعمیر کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد مسئلہ ختم نہیں ہوتا۔ اب دوسرے سوالات اس کو پریشان کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پریشانیوں سے آدمی اسی وقت نجات پا سکتا ہے جب کہ وہ ابدی عمر تک کے لیے اپنے سوالات کا جواب پالے نہ کہ صرف وقتی عمر تک کے لیے۔

حقیقت انسانی

سب سے بڑی نیکی حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ اس دنیا میں سارا اختیار صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان بالکل عاجز اور بے بس ہے۔ مگر اس دنیا میں انسان کو بظاہر ایسے حالات میں رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح آزاد اور خودمختار محسوس کرے۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو آدمی حقیقی صورت حال کو سمجھے اور اس کا اعتراف کر کے خدا کے آگے جھک جائے، وہ قابل انعام ٹھہرا۔ اس کے برعکس، جو آدمی امتحانی پردے کو پھاڑنے میں کامیاب نہ ہو اور خدا کی بڑائی کے آگے اپنے کو نہ جھکائے وہ مجرم ہے۔ ایسا شخص عنقریب سخت ترین عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

دنیا میں وہ مسئلہ بہت بڑے پیمانے پر پایا گیا ہے جس کو خرابی کا مسئلہ (Problem of evil) کہا جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ موجود دنیا میں بے شمار قسم کے دکھ لگے ہوئے ہیں۔ ایک شخص تندرست وتوانا ہے اور اچانک موت آ کر اس کو دبوچ لیتی ہے۔ ایک شخص کے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے اور اس کے شاندار جسم کو کچل

کررکھ دیتا ہے۔اسی طرح بیماریاں، قحط، زلزلے اورطرح طرح کی آفتیں انسان کے منصوبوں کواس طرح تہس نہس کرتی رہتی ہے جیسےان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

بظاہر یہ بڑا بے رحمی کا معاملہ ہے۔مگر اس کے اندر زبردست حکمت چھپی ہوئی ہے۔یہ تمام ناخوشگوار واقعات اس لیے پیش آتے ہیں کہ انسان کی آنکھ کھولیں۔وہ انسان کو یاددلائیں کہ بظاہر بااختیار ہونے کے باوجود وہ کس قدر بے بس ہے۔سب کچھ کا مالک ہونے کے باوجود وہ کتنا زیادہ بے کچھ ہے۔یہ خرابیاں دراصل بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔اس طرح ظواہر کا پردہ پھاڑ کر انسان کو اصل حقیقت کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔قیامت میں جو پردہ مکمل طور پر پھاڑا جانے والا ہے وہ حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

دنیا کی مصیبتیں انسان کواس کی بے بسی کی یاددلاتی ہیں۔وہ اس کو ذہنی طور پراس قابل بناتی ہیں کہ وہ حقیقت واقعہ کو پالے اوراس کو مان کر خدا کے انعامات کا مستحق بنے۔آنے والی ابدی دنیا میں انسان حقیقی طور پرآزاد اورخود مختار ہوگا۔وہاں وہ ہرقسم کے دکھ اورغم سے مکمل طور پرمحفوظ رہے گا۔مگر یہ درجہ کسی کوبطورانعام ملے گا نہ کہ بطوراستحقاق۔جس نے اپنے عجز کوجان لیاوہی اس قابل ہے کہ اس کوآزادی کی نعمت عطا ہو۔جواپنی بےاختیاری پرراضی ہوگیااسی نے اس اہلیت کا ثبوت دیا کہ خدااس کواپنی معیاری دنیا میں بااختیار بنا کررکھے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔یہاں شاطرآدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے۔مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت

نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہو رہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرنا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لیے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں ،ایک نور کا اور دوسرے ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں ،مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہوگا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دئے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

کائناتی منصوبہ بندی

موجودہ زمانہ میں آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے ہوائی جہاز بنائے گئے ہیں۔ یہ جہاز بننے کے بعد جب امریکا میں اڑائے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ انسانی صحت کے لیے خطرہ ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے ہوا میں گیسوں کا قیمتی تناسب بدل جاتا ہے۔ چنانچہ امریکا میں اس قسم کے جہازوں کی پرواز پر پابندی لگادی گئی۔

یہی معاملہ انسان کے تمام منصوبوں کا ہے۔ آدمی ایک گھر بناتا ہے مگر جب وہ اس میں رہنا شروع کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں فلاں فلاں کمی رہ گئی۔ وہ سڑکیں اور لائنیں بچھاتا ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ضرورت کے مطابق کرنے کے لیے اس میں فلاں فلاں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اسی طرح انسانی تمدن کے ہر شعبہ میں ترمیم واصلاح کا کام مسلسل جاری رہتا ہے۔

یہ انسانی تعمیرات کا حال ہے مگر کائنات کے عظیم کارخانے کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہے۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں۔ ستارے، زمین، معدنیات، پہاڑ، عرقیات، گیسیں، درخت، جانور، روشنی، حرارت، کشش، انسان وغیرہ۔ یہ چیزیں بے شمار صورتوں میں وسیع کائنات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وہ اول روز سے انتہائی کامل صورت میں موجود ہیں۔ ان کے خالق کو انہیں پیدا کرنے کے بعد نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سورج اور زمین کا فاصلہ، معدنیات میں جواہر کی ترکیب، پانی اور ہوا میں گیسوں کا تناسب، درخت اور پودوں کی نشوونما کا اصول، حیوان اور انسان کا جسمانی ڈھانچہ، غرض ہر چیز اول روز سے کامل اور مکمل ہے۔ کسی چیز میں بھی ادنیٰ نظر ثانی کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز عین ویسی ہے جیسا کہ فی الواقع اسے ہونا چاہیے۔

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے جس ہستی نے کائنات کو بنایا ہے وہ قادر مطلق ہے اور اسی کے ساتھ عالم الغیب بھی۔ مکمل قدرت اور غیب سے کامل آگہی کے بغیر ایسا معیاری منصوبہ بنانا ممکن نہیں جس میں کبھی نظر ثانی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

تخلیق کی حکمت

ہندستان نے 1984 میں روس کے تعاون سے اپنے دو آدمی خلا میں بھیجے۔ ان کے نام ہیں: مسٹر رویش ملہوترا (پیدائش 1943) اور مسٹر راکیش شرما (پیدائش 1949)۔ ان دونوں ہوا بازوں نے 1983 میں دس مہینے روس کے خلائی سنٹر (Star City) میں گزارے۔ دس مہینہ کی ٹریننگ میں ان کو جو چیزیں سکھائی گئیں ان میں سے ایک روسی زبان بھی تھی۔

بنگلور کی ایک پریس کانفرس (ہندستان ٹائمس، 24 جولائی 1983) میں ان خلابازوں نے خلا کے بارے میں بعض دلچسپ چیزیں بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ خلائی پرواز کے دوران آدمی تقریباً چھ سنٹی میٹر لمبا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی اصل لمبائی اس وقت واپس آجاتی ہے جب کہ وہ دوبارہ زمین پر اترتا ہے۔ لمبائی کا یہ فرق جسم کے اوپر فضا کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے:

> One would gain about six centimetres in height during a space flight but would get back to one's normal height soon after returning to earth with the atmospheric pressure acting on the vertebrate.

خلا میں انسانی جسم کا لمبا ہو جانا بے وزنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ وزن یا بے وزنی دونوں قوت کشش کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری زمین بے حد صحیح اندازہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اس لیے یہاں ہر آدمی کا قد نہایت متناسب ہوتا ہے، نہ چھوٹا اور نہ بڑا۔ زمین کی جسامت اگر موجودہ جسامت کے مقابلہ میں نصف ہو جائے تو اس کی کشش گھٹ جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں انسان غیر متناسب طور پر لمبے قد کے ہونے لگیں گے۔ موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف لمبے لمبے انسان دکھائی دیں گے۔ ایک ایسی دنیا کا تصور کیجیے جہاں موجودہ معتدل قد کے انسانوں کے بجائے ہر طرف اونٹ جیسے انسان کھڑے ہوئے نظر آتے ہوں۔

اس کے برعکس، اگر ایسا ہو کہ زمین کی جسامت موجودہ جسامت کے مقابلہ میں دونا ہوجائے تو اس کی قوت کشش بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کا بڑھنا رک جائے گا۔ شیر کی جسامت گھٹ کر بلی جیسی ہوجائے گی اور انسان کا یہ حال ہوگا کہ وہ اپنے موجودہ خوب صورت قد کو کھودے گا اور زمین ان چھوٹے چھوٹے انسانوں کی بستی بن جائے گی جن کو ہم بونا کہہ کر مسکراتے ہیں۔

تخلیق خداوندی کی یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے:

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (13:8)۔ یعنی، اور ہر چیز اس کے یہاں ایک انداز پر ہے۔

زندگی کا اسٹیج

حیدرآباد کا واقعہ ہے 21 ستمبر 1981 کو مسٹر بی کے رامار یڈی (90 سال) اور ان کی 80 سالہ بیوی پھولا بائی رات کے وقت اپنے گھر واقع بنجارہ ہلز میں سو رہے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گھر میں اس وقت صرف ان کا ملازم رامیا (50 سال) تھا۔ رامیا نے عین نیند کی حالت میں کلہاڑی سے بوڑھے میاں بیوی پر حملہ کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد رامیا نے بکس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کے ہیرے اور زیورات نکالے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

راستہ چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پولیس کے دو آدمی رات کی ڈیوٹی میں پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو شبہ ہوا چنانچہ انھوں نے رامیا کو پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ اور ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا اور چرایا ہوا مال پولیس کے حوالے کردیا۔ دونوں پولیس کے آدمیوں نے رامیا کو اور اس سے برآمدہ شدہ مال کو لے جاکر تھانہ میں جمع کردیا۔ ان کا نام شیخ محبوب اور ایس ایم رشید بتایا گیا ہے۔

محکمہ پولیس کے افسران کے علم میں یہ واقعہ آیا تو وہ شیخ محبوب اور ایس ایم رشید کی کارکردگی اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد دونوں کو نقد انعامات دئے گئے اور اسی کے ساتھ دونوں کو ترقی بھی دے دی گئی۔ شیخ محبوب کو اسٹیشن آفیسر کے عہدہ پر متعین کردیا گیا اور ایس ایم رشید کو ہیڈ کانسٹیبل بنا دیا گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ بیک وقت دو آدمیوں کے لیے دو معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آتا ہے مگر اسی ایک واقعہ سے ایک شخص کو کریڈٹ دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ڈسکریڈٹ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو قاتل ثابت کرکے مجرم کے خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ایماندار اور فرض شناس ظاہر کرکے انعام کا مستحق بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ یہاں کوئی شخص کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ نہ کوئی کسی کو زندگی دے سکتا اور نہ موت۔ تاہم یہ سارے واقعات یہاں ایک یا دوسرے کے ہاتھ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا ایک قسم کا خدائی اسٹیج ہے۔ یہاں مختلف حالات پیدا کرکے خدا ہر ایک کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو وہ علی الاعلان ظاہر کر دے۔ جو شخص مجرمانہ ذہن لیے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات پا کر جرم کرے اور خدا کے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہو۔ جو شخص اپنے اندر حق پرستی کا ذہن لیے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات میں حق اور انصاف کا معاملہ کرے تاکہ وہ خدا کے یہاں انعام اور قدر افزائی کے لائق ٹھہرے۔

اندھیرا ختم ہوگا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے، اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کرکے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا، وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے الم ناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے درندگی کے واقعات آئے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارے میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔مگر یہ سوال صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔خالق کی اسکیم میں دنیا دارالامتحان ہے مگر ہم اس دارالجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیر اختم ہو۔ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کیے جائیں۔سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہوگا،مگر وہ موت کے بعد ہوگا نہ کہ موت سے پہلے۔

تاریکی میں سفر

لندن کے اخبار گارجین (13 مارچ 1983) کے ایک تین کالمی مضمون کی سرخی ہے — تاریکی میں ایک بہادرانہ سفر:

A brave journey through the dark.

یہ مضمون آرتھر کوئسلر (1905-1983) کے بارے میں ہے۔آرتھر کوئسلر انگلستان کا ایک مشہور ادیب اور مفکر تھا۔اس نے اور بیوی سنتھیا (Cynthia) نے مارچ 1983 میں اپنے لندن کے مکان میں خودکشی کرلی۔موت کے وقت آرتھر کوئسلر کی عمر 77 سال تھی۔

آرتھر کوئسلر بہت سی کتابوں کا مصنف تھا۔اس کی ایک کتاب کا نام ہے — دوپہر

میں تاریکی (Darkness at Noon)۔ یہ کتاب 32 زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، جو کہ کمیونزم کے خلاف ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ نام نہاد عوامی نظام میں بھی کس طرح انسان کے اوپر انسان کا ظلم جاری رہتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا استغلال کرتا ہے۔

آرتھر کوئسلر کو ذاتی طور پر وہ تمام دنیوی چیزیں حاصل تھیں جن کی ایک انسان تمنا کرتا ہے۔ وہ مشہور عالم تھا۔ اپنے پیچھے اس نے چار لاکھ پونڈ چھوڑے ہیں جن کے بارے میں اس نے وصیت کی کہ وہ ایک برطانی یونیورسٹی کو دے دئے جائیں جو اس رقم کو (Parapsychology) کی تحقیق میں لگائے۔

آرتھر کوئسلر نے کیوں خودکشی کرلی۔ اس کی وجہ اس کی مایوسی تھی۔ وہ دنیا میں برُائیاں دیکھ کر بے حد پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان برائیوں کی کیا توجیہ کرے۔ 1974 میں اس کے مقالات کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس میں اس نے کہا تھا تکنیکی ترقیوں اور اخلاقی سلوک کے درمیان بہت نمایاں قسم کی علامتی نابرابری پائی جاتی ہے:

There is a striking. symptomatic disparity between the growth-curves of technological achievement on the one hand and of ethical behaviour on the other.

اس کے بعد وہ جدید تہذیب سے اپنی مایوسی کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے کہ ہم دور سیاروں کے گرد گھومنے والے خلائی جہازوں کی حرکت کو کنٹرول کرسکتے ہیں مگر شمالی آئر لینڈ کے حالات کو کنٹرول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں:

We can Control the motions of satellities, orbiting the distant planets, but can not control the situation in Northern Ireland.

دونوں ایک سطح پر

جانور اپنی نوع کو ہلاک نہیں کرتے۔ مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس سوال کی تحقیق کرتے ہوئے آرتھر کوئسلر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہ

ہے کہ انسانی دماغ کے مختلف حصوں میں ارتقا کے دوران عدم توازن (Imbalance) پیدا ہو گیا ہے۔ یہی عدم توازن مردم کشی کے بڑے بڑے واقعات کا اصل سبب ہے۔

تاہم یہ تحقیقات اس کو سکون نہ دے سکیں۔ وہ بالآخر اس رائے پر پہنچا کہ انسان کے لیے موجودہ حالات میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ خودکشی کر لے۔ اس کا آخری فلسفہ یہ تھا کہ موت اس شخص کے لیے قابل استقبال اور قدرتی ریلیف ہوسکتی ہے جس کا واحد بدل غم اور مصیبت ہو:

Death could be a welcome and nutural relief for someone whose only alternative was pain and suffering.

The Guardian (London) March 13, 1983

آرتھر کوئسلر نے اپنے اس نظریہ پر خود عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس دنیا سے الگ کرلیا جو نہ اس کی مرضی کے مطابق تھی اور نہ وہ اس کو بدلنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ انسان ایک روشن فضا میں آنکھ کھولتا ہے۔ پھر وہ موت کی اندھیری دنیا میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان کی اخلاقی ترقی ممکن نہ ہوسکی۔ اس نے دیکھا کہ جانور تک اپنے ہم جنسوں کو ہلاک نہیں کرتے مگر انسان خود اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ انسان اپنے سارے وسائل کو استعمال کر کے فلاحی نظام بناتا ہے مگر وہ نظام روشنی میں تاریکی کے ہم معنی ہوجاتا ہے۔ ان حالات نے اس کو مایوس کر دیا اور اس نے خودکشی کرلی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے آخرت کا تصور نہ ہو تو اس کی زندگی کتنی بے معنی ہوجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجود دنیا کی معنویت اسی وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس کو آخرت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ آخرت کے بغیر یہ دنیا اتنی بے معنیٰ معلوم ہوتی ہے کہ ایک حساس مفکر یہی کر سکتا ہے کہ وہ خودکشی کر لے تاکہ اس کے خیال کے مطابق اس کو موجودہ ناقابل فہم دنیا سے چھٹی مل جائے۔

حادثات کیوں

ٹرین جب پلیٹ فارم سے روانہ ہونے والی ہوتی ہے تو سیٹی دیتی ہے۔اس سیٹی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ آگاہ ہوجائیں۔ اگر کچھ مسافر پلیٹ فارم پر ہوں تو وہ فوراً اپنے ڈبہ میں آکر بیٹھ جائیں۔تاہم اس سیٹی کو دوزاویے سے دیکھا جاسکتا ہے۔اگر آپ محض آواز کے معنی میں لے کر اس کو شور یا صوتی آلودگی (Noise pullution) کہیں تو وہ بالکل بے معنی معلوم ہوگی لیکن اگر آپ اس کو "الارم" کہیں تو وہی چیز آپ کی نظر میں بالکل درست اور بامعنی بن جائے گی۔

یہی معاملہ فطرت کے حادثات کا ہے۔فطرت کے حادثات کو دوزاویہ نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ہماری زمین پر قحط، زلزلے، طوفان آتے ہیں اور دوسری قسم کی آفتیں پیش آتی ہیں۔بعض فلسفیوں نے ان کو مطلق طور پر دیکھا تو ان کو ان واقعات میں کوئی معنویت نظر نہیں آئی۔ان کو انھوں نے مسئلہ فساد(Problem of evil) کا نام دے دیا۔

مگر پیغمبر ان واقعات کو ایک اور زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ دوسرا زاویہ نصیحت اور عبرت کا زاویہ ہے۔اس اعتبار سے دیکھنے میں اس قسم کے تمام واقعات فطرت کا الارم بن جاتے ہیں۔

پیغمبر کی تشریح کے مطابق یہ واقعات بڑی قیامت سے پہلے چھوٹی قیامت ہیں۔ وہ انسان کو یاد دلاتے ہیں کہ وہ ایک بڑے سخت دن کو طرف بڑھ رہا ہے جب کہ خدا اپنی عظیم طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔تمام انسان مجبور اور بے بس حالت میں اس کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔اس دن آدمی بھاگنا چاہے گا مگر کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں وہ بھاگ کر پناہ لے سکے۔اس دن آدمی مدد کے لیے پکارے گا مگر وہاں کوئی نہ ہوگا جو اس کی مدد کے لیے دوڑے۔

یہ واقعات جو زیادہ بڑی شکل میں قیامت میں پیش آئیں گے وہی بہت چھوٹی شکل میں موجودہ دنیا میں پیش آتے ہیں۔وہ قیامت سے پہلے قیامت کی یاد دہانی ہیں۔کل کے

دن جو پردہ کامل طور پر پھاڑا جانے والا ہے اس کو آج ان حادثات کے ذریعہ جزئی طور پر پھاڑ دیا جاتا ہے۔

عقلمند انسان وہ ہے جو اس قسم کے واقعات کو فطرت کا الارم سمجھے نہ کہ فطرت کا بگاڑ۔ ان کو الارم کی نظر سے دیکھا جائے تو تواضع اور اصلاح کا جذبہ ابھرے گا۔ اور اگر ان کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ یہ نظام فطرت کی خرابی ہے تو اس سے ذہنی انتشار اور بغاوت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ پہلا ذہن آدمی کو جنت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا ذہن جہنم کی طرف۔

حقیقت سے بے خبری

امتحان ہال میں ہر طالب علم کو یکساں طور پر داخل ہونے اور بیٹھنے کے مواقع دئے جاتے ہیں۔ مگر سند کی تقسیم کے وقت سند پانے کی خوشی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ یہ خوشی صرف اس طالب علم کا حصہ ہوتی ہے جو محنتی ہو۔ جس نے سال بھر کے وقت کو ضائع کرنے کے بجائے استعمال کیا ہو۔ ایسا طالب علم کامیابی کے ساتھ تمام سوالات کو حل کرتا ہے اور امتحان میں پاس ہو کر سند کا مستحق بنتا ہے۔

یہی حال وسیع تر معنوں میں زندگی کا بھی ہے۔ موجودہ دنیا بے شمار نعمتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور ہر آدمی اس سے متمتع ہو رہا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں ہر چیز جو آدمی کو مل رہی ہے وہ امتحان کی قیمت میں مل رہی ہے۔ اس کے برعکس، آخرت میں ہر چیز آدمی کو عمل کی قیمت میں ملے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر آدمی خدا کی نعمتوں میں سے کچھ اپنے لیے پالیتا ہے۔ مگر آخرت میں صرف وہی لوگ خدا کی نعمتوں کو پائیں گے جو اپنے عمل سے اس کا استحقاق ثابت کریں۔ باقی تمام لوگ اس سے محروم کر کے چھوڑ دئے جائیں گے۔

انسان زمین کے اوپر کس طرح اکڑ کر چلتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ زمین پر چلنا اس کا حق نہیں یہ صرف خدا کی طرف سے امتحان کی مہلت ہے۔ انسان یہاں دھوپ اور ہوا اور پانی اور غذا اور بے شمار دوسری چیزوں کو استعمال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب چیزیں اس کے لیے ہیں۔ حالانکہ یہ صرف وقفہ امتحان تک اس کے لیے ہیں۔ اس کے بعد وہ صرف اس شخص کے لیے ہوں گی جس نے ان کا حق ادا کیا ہو۔ باقی تمام لوگوں کے حصہ میں ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔ انسان اختیار و اقتدار پا کر گھمنڈ کرنے لگتا ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ یہ اختیار و اقتدار خدا کی امانت ہے۔ اور اس کو پا کر گھمنڈ کرنا خدا کی امانت میں خیانت کرنا ہے۔ جس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ اس کو دائمی طور پر ہر قسم کے عزت اور اقتدار سے محروم کر دیا جائے۔

یہ ایک بے حد نازک صورت حال ہے۔ ہر آدمی ایک انتہائی بھیانک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ اس دنیا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ لوگوں کو اس صورت حال سے باخبر کیا جائے۔

موجودہ دنیا کی چیزوں کو جو لوگ ذاتی چیز سمجھ کر اس میں بے روک ٹوک تصرف کر رہے ہیں ان کا حال آخرت میں وہی ہوگا جو کسی بینک کے اس اکاؤنٹنٹ کا ہوتا ہے جو بینک کی الماری میں بھرے ہوئے نوٹوں کو اپنی ذاتی چیز سمجھ لے۔

ظاہر فریبی

ایئر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ 25 اگست 1981 کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ 25 آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھا گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایئر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا، 26 اگست 1981)۔

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑان بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لیے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کر لے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے، یہاں کی ہر بڑائی کو جھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

تضاد فکری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: "اللہ نے کسی آدمی کے اندر دو دل نہیں بنائے اور نہ تمہاری بیویوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ تمہارے اپنے منہ کی بات ہے۔ اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ دکھاتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہی پورا انصاف ہے اللہ کے یہاں" (33:4)۔

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ اگر کوئی شخص نادانی میں اپنی بیوی کو ماں کہہ دیتا: أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي (مسند احمد، حدیث نمبر 27319) تو وہ اس کے لیے حقیقی ماں کی طرح حرام ہو جاتی۔ گویا اس لفظ کے بولنے سے وہ سچ مچ اس کی ماں بن گئی ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو منہ بولا بیٹا (تبنیٰ) بنالیتا تو وہ اس کو صُلبی بیٹے کی طرح سمجھنے لگتے اور اس پر وہی احکام صادر کرتے جو حقیقی بیٹے کے لیے ہوتے ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی رواج کے خاتمہ کا اعلان کیا۔

"ایک سینہ میں دو دل" کا مطلب کسی شخص کا بیک وقت دو متضاد نقطۂ نظر رکھنا ہے۔ خدا نے جب انسان کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے سوچنے کے انداز میں بھی دوئی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات خدائی اسکیم کے خلاف ہے کہ کوئی شخص بیک وقت دو مختلف اور متضاد نظریہ کو اپنے اندر جگہ دے۔ ایک طرف وہ حقیقی ماں اور بیٹے کو ماں اور بیٹا سمجھے اور دوسری طرف محض زبان سے کسی کو ماں یا بیٹا کہہ دینے کی بنا پر بھی اس کو ماں یا بیٹا ماننے لگے۔

جو شخص ایسا کرے اس نے گویا فکری دوئی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ایک طرف ایک حقیقی چیز کو حقیقت سمجھا اور دوسری طرف ایک بے حقیقت چیز کو بھی حقیقت قرار دیا۔ یہ متضاد خیالات کو ایک دل میں جگہ دینا ہے جو فطرت کے وحدانی نقشہ کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سچائی اور تعصب کو ایک ساتھ ماننا ہے۔ حقیقت پسندی اور توہم پرستی کو بیک وقت

اپنے ذہن میں جگہ دینا ہے۔ایک رواجی نقطۂ نظر کو بھی اسی طرح تسلیم کرنا ہے جس طرح خالص عقلی نقطۂ نظر کو تسلیم کرنا چاہیے۔اسی طرح توحید کے عقیدہ کے ساتھ مشرکانہ خیالات کو ماننا، حقیقت واقعہ اور توہمات کو ایک ساتھ اپنے ذہن میں جگہ دینا، اصولی صداقت کا اقرار کرنے ساتھ شخصیت پرستی کو اختیار کرنا، قرآن کی محکم آیتوں پر عقیدہ رکھتے ہوئے پُرعجوبہ قصے کہانیوں میں مشغول ہونا، سب ایک دل والے سینہ کو دو دل والا سینہ بنانا ہے جوسراسر تضاد ہے اور ایسا ہر تضاد خدا کی اس بے تضاد دنیا میں جگہ پانے کے قابل نہیں۔

کائنات کو پڑھیے

قرآن کتاب کائنات کی ڈکشنری ہے۔یہی بات قرآن مین ان لفظوں میں کہی گئی ہے يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ (13:2)۔یعنی، خدا کائنات کا انتظام کر رہا ہے اور قرآنی آیتوں کے ذریعہ اس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک شخص کائنات کو دیکھتا ہے۔وہ اپنی کم فہمی سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات ایک صاحب ارادہ کے ارادی منصوبہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔

ایک شخص دیکھتا ہے کہ کائنات بظاہر کچھ اسباب کے تحت چل رہی ہے۔وہ سمجھ لیتا ہے کہ کائنات ایک عظیم خود چالو مشین ہے۔یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ نہیں، کائنات کو خدا کے فرشتے خدا کے حکم سے چلا رہے ہیں۔

ایک شخص انواع حیات کے بعض ظاہری پہلوؤں کی بنا پر یہ رائے قائم کرلیتا ہے کہ زندگی کی تمام قسمیں سلسلۂ ارتقا کے تحت وجود میں آئی ہیں۔یہاں قرآن اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ نہیں۔زندگی کی مختلف قسمیں ایک خالق کی تخلیق سے ظہور میں آئی ہیں۔

کائنات کو دیکھیے تو یہاں آرٹ اور کمال کے حیرت انگیز نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

یہاں ایٹم رقص کر رہے ہیں۔ یہاں دو بے جان مادے باہم مل کر تیسری نئی چیز میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہاں بے شمار ستارے سفر کر رہے ہیں ان کی رفتار میں ایک سکنڈ کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ یہاں ایک بیج سرسبز درخت کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ یہاں زندگی کا سیلاب چاروں طرف نظر آتا ہے۔ اس قسم کے بے شمار عمل یہاں جاری ہیں مگر تمام عمل خاموشی کے ساتھ انجام پا رہے ہیں۔ کائنات کا کوئی کردار اپنا تعارف نہیں کراتا، وہ انسان سے ہم کلام ہو کر اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔

آدمی یہ دیکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ کائنات شاید گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ یہاں قرآن اس کو بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا کے ہنگامے بے مقصد نہیں۔ ایک وقت آنے والا ہے جب کہ دنیا کی معنویت پوری طرح ظاہر ہو۔ اس وقت تمام چیزیں بول پڑیں گی جس طرح خاموش ریکارڈ گراموفون کی سوئی کے نیچے آتے ہی بولنے لگتا ہے۔ اس دن تمام کمیوں کی تلافی ہوگی جو موجودہ دنیا میں نظر آتی ہیں۔ انسان اپنے تمام سوالات کا جواب پا لے گا۔ ہر انسان اپنے اس انجام کو پہنچ جائے گا جہاں باعتبار حقیقت اسے پہنچنا چاہیے۔

معیاری دنیا

آدمی پیدائشی طور پر معیار پسند (Idealist) ہے۔ ہر آدمی ایک معیاری دنیا (Ideal world) کی تلاش میں ہے۔ مگر اس دنیا میں معیاری دنیا کا بننا ممکن نہیں۔ اس دنیا میں آدمی کو صرف معیاری نظریہ دیا جاسکتا ہے نہ کہ معیاری دنیا۔

معیاری دنیا بننے کی جگہ صرف آخرت ہے۔ موجودہ دنیا امتحان کی حکمت کے تحت بنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہت سی محدودیتیں (Limitations) ہیں۔ یہ محدودیتیں خود خالق کی طرف سے ہیں اور ان کی موجودگی میں یہاں معیاری دنیا بننا ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ امتحان کی مصلحت کے تحت یہاں سے ہر شخص کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں

اگر نیک لوگوں کو عمل کی آزادی ہے تو یہاں برے لوگوں کو بھی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ نیک لوگ ایک نقشہ بناتے ہیں اور برے لوگ شرارتیں کرکے اس نقشہ کو توڑ ڈالتے ہیں۔

امتحان کا تصور موجودہ دنیا کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ فلاسفہ اور مفکرین اس کنجی کو نہ پا سکے۔ اس لیے دنیا کو سمجھنے میں بھی وہ ناکام رہے۔ انھوں نے موجودہ دنیا میں اپنی پسند کی دنیا بنانی چاہی۔ مگر "ناقص دنیا" میں "کامل دنیا" نہیں بن سکتی تھی، چنانچہ ان کے حصہ میں ذہنی انتشار کے سوا اور کچھ نہ آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں معیاری دنیا نہیں بن سکتی۔ معیاری بننے کی جگہ آخرت ہے۔ یہاں صرف یہ ممکن ہے کہ لوگوں کو خدا کی اسکیم سے آگاہ کیا جائے اور ان کو آخرت پسندی کی زندگی گزارنے کی طرف متوجہ کیا جائے اس دعوت کے نتیجہ میں اگر انسانوں کی بہت بڑی تعداد دین حق پر آجائے تو ان کے اجتماع سے یقینا ایک ایسا معاشرہ بن جائے گا جو نسبتاً بہتر معاشرہ ہوگا۔ نیز اگر حالات نے مساعدت کی تو یہ گروہ غیر دینی نظام کے اوپر غلبہ بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اور وہ چیز بھی قائم ہوسکتی ہے جس کو دینی حکومت کہا جاتا ہے۔

تاہم اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ معاشرہ یقینی طور پر "معیاری" معاشرہ ہوگا۔ اور نہ اس کی کوئی ضمانت ہے کہ وہ مستقل طور پر باقی رہے گا۔ یہ ساری چیزیں خدا نے آخرت کی دنیا میں رکھ دی ہیں اور جو چیزیں مالک کائنات نے اگلی دنیا میں رکھ دی ہوں ان کو ہم موجودہ دنیا میں کبھی نہیں پا سکتے۔

غلط استعمال

جون 1984 میں امرت سر کے سورن مندر (Golden Temple) کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔ ہندستانی فوج کی اس کارروائی کا خفیہ نام آپریشن بلیو اسٹار

(Operation Blue Star) تھا۔ سورن مندر سکھوں کا انتہائی متبرک مقام ہے۔ اس واقعہ کے بعد کچھ پر جوش سکھوں میں "شہید" ہونے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ چنانچہ 31 اکتوبر 1984 کو خود انہیں سکھ جوانوں نے گولی مار کر اندرا گاندھی کو قتل کر دیا جو حفاظت کی خاطر وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ میں متعین کیے گئے تھے۔

اس کے بعد مقدمہ چلا۔ 11 فروری 1985 کو چیف میٹرو پولٹین مجسٹریٹ مسٹر ایس ایل کھنّہ کی عدالت میں ملزمین کے خلاف 20 صفحات کی چارج شیٹ پیش کی گئی۔ اس سلسلہ میں اخبارات میں جو رپورٹ آئی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

> Satwant Sing has further been charged under section 27of the Arms Act for using a weapon lawfully supplied to him to commit murder.

قاتل ستونت سنگھ (1962-1989) پر اسلحہ ایکٹ کی دفعہ 27 کے تحت مزید یہ الزام ہے کہ ایک ہتھیار جو اس کو جائز طور پر دیا گیا تھا اس کو اس نے قتل کرنے کے لیے استعمال کیا (ٹائمس آف انڈیا، 12 فروری 1985)۔

ستونت سنگھ کو جو قیمتی آٹو میٹک ہتھیار دیا گیا تھا وہ وزیر اعظم کی حفاظت کے لیے تھا نہ کہ وزیر اعظم کو قتل کرنے کے لیے۔ یہ اگرچہ اس کے لیے جائز قانونی ہتھیار تھا مگر جب اس نے اس کا غلط استعمال کیا تو وہ قانون کی نظر میں مجرم قرار پایا۔ وہی ہتھیار جس کا صحیح استعمال اس کو انعام کا مستحق بناتا اس کے غلط استعمال نے اس کو سزا کا مستحق بنا دیا۔

اسی طرح خدا کی طرف جو چیزیں انسان کو دی گئی ہیں وہ اس کا جائز حق ہیں۔ مگر وہ صرف صحیح استعمال کے لیے ہیں۔ آدمی اگر ان چیزوں کا غلط راہ میں استعمال کرے تو وہ خدا کی نظر میں مجرم قرار پائے گا اور آخرت کی عدالت میں وہ ایسی سخت سزا کا مستحق ہوگا جس سے وہ کبھی نجات نہ پا سکے۔

کامیاب زندگی

اسٹوارٹ کیلی (Stuart Kelly) اونٹاریو کا ایک ٹرک ڈرائیور تھا اس نے لاٹری کا ایک ٹکٹ خریدا۔ جنوری 1984 میں اس کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو اس کو پہلا انعام ملا جو 13.9 ملین ڈالر تھا۔ یہ کناڈا میں ملنے والے اب تک کے تمام لاٹری انعامات میں سب سے زیادہ تھا۔

اسٹوارٹ کیلی کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کو اتنا بڑا انعام ملا تو اس نے کہا کہ یہ میری تمام ممکن ضرورتوں سے بھی زیادہ ہے مگر اس کو خوشیوں کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے غم میں مبتلا ہو گیا۔ انعام ملنے کے صرف تین ماہ بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو کینسر ہو چکا ہے۔ لاٹری انعام ملنے کے سات ماہ بعد وہ مر گیا۔ اس کی عمر 57 سال تھی۔ وہ 35 سال تک ٹرک ڈرائیور رہا اور انعام ملنے کے صرف سات ماہ بعد وہ اس دنیا سے چلا گیا۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی دولت چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے لیے ایک کامیاب زندگی کی تعمیر کرے۔ مگر موجودہ دنیا میں انسان کا اصل مسئلہ دولت نہیں بلکہ اس کا مسئلہ محدودیت ہے کوئی انسان خواہ کتنی ہی زیادہ دولت اپنے لیے حاصل کر لے وہ محدودیت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے کوئی شخص اس دنیا میں اپنی دل پسند زندگی بھی نہیں بنا سکتا۔

دولت کی کوئی مقدار آدمی کو اس سے نہیں بچاسکتی کہ وہ بیمار نہ ہو۔ اس کو حادثہ نہ پیش آئے۔ ایک مختصر مدت کے بعد وہ مر نہ جائے۔ اور جب بیماری اور حادثہ اور موت پر انسان کو قدرت نہیں تو اپنے لیے پسندیدہ زندگی بنانے پر وہ کیسے قادر ہوسکتا ہے۔

دولت زندگی نہیں ہے۔ دولت زندگی کا ایک وسیلہ ہے۔ وسیلہ کی اہمیت ہمیشہ دوسرے درجہ کی ہوتی ہے۔ زندگی ہے تو وسیلہ کی بھی اہمیت ہے۔ اور اگر زندگی نہیں

تو وسیلہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔مگر اکثر انسان اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔وہ دنیا کی دولت حاصل کرنے میں اتنا مشغول ہوتے ہیں جیسے کہ دنیا کی دولت بذات خود مقصود ہو، جیسے کہ دنیا کی دولت ہی کا دوسرا نام زندگی ہو۔

انسان کے لیے کامیاب زندگی کا کوئی نقشہ آخرت کو شامل کیے بغیر نہیں بن سکتا۔انسان کو دو میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔موجودہ دنیا کو سب کچھ سمجھ کر ناکامی کی موت مرنا یا موجودہ زندگی کو آخرت تک وسیع کر کے اپنے لیے کامیاب زندگی کا راز دریافت کرنا۔

امتحان

انسان کی آنکھ کیسی عجیب چیز ہے۔اگر آپ اپنی آنکھ بند کر لیں تو آپ کو کچھ دکھائی نہیں دے گا۔ساری دنیا آپ کے لیے ایک نامعلوم اندھیرا بن کر رہ جائے گی۔دنیا ہوگی مگر آپ اس کو نہیں دیکھیں گے۔چیزیں ہوں گی مگر آپ ان کو محسوس نہیں کریں گے۔

مگر جب آپ اپنی آنکھ کھولتے ہیں تو حیرت انگیز طور پر چیزوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔اب کالی چیز آپ کو سفید چیز سے الگ دکھائی دینے لگتی ہے۔اب متحرک چیز آپ کو متحرک دکھائی دیتی ہے اور جامد چیز جامد حالت میں نظر آتی ہے۔آپ انسان کو انسان کے روپ میں دیکھتے ہیں اور جانور کو جانور کے روپ میں۔

یہی انسان کا خصوصی امتیاز ہے۔وہ چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے پہچانتا ہے۔وہ خیر اور شر کا فرق کرنا جانتا ہے۔وہ روشنی کو تاریکی سے اور تاریکی کو روشنی سے جدا کر کے دیکھتا ہے۔وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ حق کو حق کے روپ میں دیکھے اور باطل کو باطل کے روپ میں پہچان لے۔وہ اس فرق سے آشنا ہے کہ کون سی چیز دلیل سے ثابت ہوئی اور کون سی چیز دلیل سے ثابت نہیں ہوئی۔

انسان کی یہی خصوصیت اس کے لیے اس کے امتحان کا پرچہ ہے۔یہی وہ خاص مقام

ہے جہاں اس کا خدا اس کا امتحان لے رہا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں یہ ثبوت دینا ہے کہ اس نے خیر کو شر سے الگ کر کے دیکھا۔ اس نے ظلم اور انصاف کے فرق کو پہچانا۔ اس کے سامنے جب کوئی بات آئی تو اس نے اس کو دلیل کی سطح پر جانچا۔ اگر وہ بے دلیل تھی تو اس نے اسے رد کر دیا اور اگر وہ دلیل سے ثابت ہو رہی تھی تو اس نے کھلے طور پر اس کا اعتراف کر لیا۔

یہ امتحان بظاہر بہت آسان ہے مگر اس کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہ قیمت اپنی نفی ہے۔ حق کسی آدمی کو اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ملتا ہے۔ آدمی یہ قیمت نہیں دے پاتا، اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ امتحان میں ناکام ہو جاتا ہے۔

آدمی کے سامنے حق ظاہر ہوتا ہے مگر وہ اس کو دیکھ نہیں پاتا۔ اس کے پاس حق کی آواز گونجتی ہے مگر وہ اس کو سن نہیں پاتا۔ حق خود چل کر اس کے پاس آتا ہے مگر اس سے اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ آہ، وہ انسان جو عین اس مقام پر سب سے زیادہ ناکام ہو جاتا ہے جہاں اس کو سب سے زیادہ کامیاب ہونا چاہیے۔

دو قسم کے بیج

زمین میں ایک سڑا ہوا بیج ڈالا جائے تو وہ مزید سڑ گل کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کو نہ کوئی ہرا لباس ملتا اور نہ اس پر کبھی بہار آتی۔ اس کے اجزاء اگرچہ زمین میں موجود رہتے ہیں مگر ان کے وجود کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ دنیا میں نہ ان کا کوئی مقام ہوتا اور نہ دنیا کی چیزوں میں ان کا کوئی حصہ ہوتا۔

اس کے برعکس، زمین میں اگر ایک اچھا بیج ڈالا جائے تو وہ دوبارہ ایک زندہ وجود کے طور پر باہر آتا ہے۔ وہ ایک ہرا بھرا درخت بن کر پہلے سے زیادہ بہتر صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہوتا ہے۔ ساری کائنات اس کے لیے غذائی دستر خوان بن جاتی ہے۔ وہ ایک انتہائی مکمل وجود کی صورت میں زمین کے اوپر اپنی جگہ حاصل کرتا ہے۔

یہ خدا کی ایک نشانی ہے جو آخرت کے معاملہ کو ہمیں واقعات کی زبان میں بتاتی ہے۔ وہ آخرت کے معاملہ کو ہماری آنکھوں کے سامنے مصوّر کرتی ہے۔

ایک انسان وہ ہے جو غیر صالح ہے۔ ایسے انسان کی مثال خراب بیج کی ہے۔ وہ مرنے کے بعد زمین میں دفن ہوگا، صرف اس لیے کہ مٹی میں مل کر مٹی ہوجائے۔ ایک سڑے ہوئے وجود کے سوا اس دنیا میں اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو صالح انسان ہے۔ اس کی مثال عمدہ بیج کی ہے۔ وہ بھی اگر چہ مرنے کے بعد زمین میں دفن ہوگا۔ مگر وہ اس لیے دفن ہوگا کہ پہلے سے زیادہ شاداب ہو کر ایک نئی زندگی کی صورت میں نمایاں ہو۔ وہ کائنات میں اپنے لیے دوبارہ بہترین مقام پا سکے۔ وہ خدا کے باغ میں سرسبز درخت کی طرح نشوونما پائے۔

اسی سے جہنم کا معاملہ اور جنت کا معاملہ سمجھا جاسکتا ہے۔ جہنم گویا ایک خراب زمین ہے جہاں تمام سڑے ہوئے بیج پھینک دئے جائیں گے۔ اس کے برعکس، جنت گویا بہترین زرخیز زمین ہے جہاں تمام بہترین بیج چھانٹ کر ڈالے جائیں گے تاکہ وہ سرسبز وشاداب فصل کی صورت میں اُگیں اور بہترین موافق ماحول میں لہلہائیں۔

اگلا پیرا گراف

ایک ناول نگار کا واقعہ ہے۔ اس نے ایک ناول لکھا۔ یہ ناول بہت زیادہ ضخیم تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کے ایک دوست نے کہا — "اف اتنا لمبا ناول، اس کو لکھتے لکھتے تم اکتا نہیں گئے" ناول نگار نے فوراً جواب دیا:

"ہرگز نہیں۔ میری توجہ ہمیشہ اگلے پیرا گراف پر لگی رہتی تھی"۔

انسانی زندگی بھی اسی قسم کی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے جو ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں کے واقعات کے ساتھ ہر آن لکھی جارہی ہے۔ اس لمبی اور خشک کہانی سے

مسلسل دل چسپی باقی رکھنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی کی توجہ، ہمیشہ کہانی کے اگلے پیرا گراف پر لگی رہے۔

یہی بات آخرت کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ایک شخص یہ فیصلہ کرے کہ وہ موجودہ دنیا میں حق کے مطابق زندگی گزارے گا۔ وہ وہی کرے گا جو کرنا چاہیے اور وہ نہیں کرے گا جو نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے شخص کو بہت جلد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے "پانے" کے بجائے "کھونے" کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کو موجودہ دنیا میں اپنی محنتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں ملتا۔

جن لوگوں کو اس نے ملانا چاہا تھا وہ شکایتیں لے کر الگ ہوجاتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس نے اپنا ساتھی سمجھا تھا وہ اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جن لوگوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی ویران کردی تھی ان سے اسے صرف الزامات کے تحفے حاصل ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ اس سے کم محنت کرکے اپنا "محل" کھڑا کرلیتے ہیں اور اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ محنت کرنے کے باوجود اس کا "جھونپڑا" بھی تیار نہیں ہوتا۔

ایسی حالت میں حق کے راستہ پر قائم رہنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی توجہ آخرت کی طرف لگالے۔ اس کی نظر کہانی کے "اگلے پیرا گراف" پر مرتکز رہے۔ کوئی بڑی کامیابی اسی شخص کے حصہ میں آتی ہے جو "آج" کی محرومی کے بجائے "کل" کی یافت پر نگاہ رکھے۔ جو کچھ کل ملنے والا ہے اس کی خاطر وہ آج کو نظر انداز کردے۔

خدا کی پکار

خدا کا داعی

ایک سائنس داں ایک بلڈنگ کے اندر ہے۔ اس کے آلات اس کو بتاتے ہیں کہ چند منٹ کے اندر یہاں بھونچال آنے والا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ بلڈنگ کے اندر بعض دوسرے انسانی مسائل بھی ہیں۔ ایسی حالت میں سائنس داں کیا کرے گا۔ اس وقت دوسرے مسائل اس کی نظر میں چھوٹے ہو جائیں گے۔ وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ صرف ایک ہی آواز دے گا — لوگو، چند لمحہ میں بھونچال اس بلڈنگ کو ڈھا دینے والا ہے۔ تم لوگ فوراً بلڈنگ سے نکل کر باہر آجاؤ۔ سائنس داں اس وقت بلڈنگ کے مسائل پر تقریر نہیں کرے گا بلکہ وہ بلڈنگ کو چھوڑنے کا مبلغ بن جائے گا۔

اب دوسری مثال لیجیے۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جو کائنات میں ایسے مقام پر کھڑا ہوا ہے جہاں سے وہ ایک طرف ہماری موجودہ دنیا کو دیکھ رہا ہے اور دوسری طرف جنت کا باغ اور جہنم کی آگ کے مناظر بھی اس کو بخوبی طور پر نظر آرہے ہیں۔ ایسا آدمی اس وقت کیا کرے گا۔ وہ کون سی بات ہوگی جس کے متعلق وہ چاہے گا کہ لوگوں کو اس کی خبر دے۔

یقینی طور پر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ دنیا کے مسائل پر تقریر شروع کر دے یا فلاح تمدن کا نسخہ لوگوں کو بتانے لگے۔ اس کے پاس کہنے کو جو سب سے بڑی بات ہوگی وہ صرف یہ ہوگی کہ لوگو، جہنم کی آگ سے بھاگو اور اپنے آپ کو جنت کا مستحق بناؤ۔

ایک شخص اگر اس سے بے خبر ہو کہ ایک سخت بھونچال اگلے لمحہ عمارت کو ڈھا دینے والا ہے تو وہ دوسری باتوں کو مسئلہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر جو شخص بھونچال کو آتے ہوئے دیکھ رہا ہو اس کو بھونچال کے سوا کوئی اور بات یاد نہیں رہے گی۔ حتیٰ کہ وہ ادبی تقاضے کے مطابق شاید جملہ کہنا بھی بھول جائے کہ لوگو، بھونچال آرہا ہے، تم لوگ اپنے آپ کو بھونچال سے بچاؤ۔ وہ سب کچھ بھول کر صرف یہ پکارتا ہوا بھاگے گا کہ — بھونچال، بھونچال۔

خدا کے داعی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ خدا کا داعی وہ ہے جس کو پردہ کے اس پار سے

جنت کی خوشبو آرہی ہواور وہ جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ایسا شخص یقینی طور پر صرف آخرت کی باتیں کرے گا۔ دوسری چیزیں اس کے ذہن سے اس طرح نکل جائیں گی۔ جیسے کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔

کرنے کا کام

زندگی میں سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔خوف کا جذبہ آدمی کے فکروعمل کی صلاحیتوں کو جتنا جگاتا ہے کوئی دوسری چیز اس کو اتنا نہیں جگاتی۔

دنیا کی تمام سرگرمیاں کسی نہ کسی خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں — معاشی بدحالی کا خوف، بےعزت ہونے کا خوف، برتر طاقت کا خوف، قوی دشمن کا خوف یا اور کوئی خوف۔ہر آدمی کسی دیکھے یا ان دیکھے خوف کے تحت عمل کرتا ہے۔خواہ وہ اس کو شعوری طور پر جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

مگر یہ تمام جھوٹے خوف ہیں۔اصلی خوف جس کے تحت آدمی کو متحرک ہونا چاہیے۔ وہ صرف ایک خدا کا خوف ہے۔خدا ہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے تمام اندیشے وابستہ کیے جائیں۔ وہ تمام سرگرمیاں باطل ہیں جو کسی دوسرے خوف کی بنیاد پر ابھری ہوں۔ اور صرف وہی سرگرمی سچی سرگرمی ہے جو اللہ کے خوف کی بنیاد پر قائم ہو۔

خدا نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔وہی ہر چیز کا مالک ہے۔اسی کے پاس ہر قسم کے اختیارات ہیں۔یہ واقعہ کافی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے۔مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔اس سے زیادہ سخت بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صرف پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے۔وہ ہر شخص کو بالآخر اپنے پاس بلائے گا۔اس دن وہ ہر ایک سے اس کے قول وعمل کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کارنامہ زندگی کے مطابق اچھا یا برا بدلہ دے گا۔

واقعہ کا یہ پہلو زندگی کے معاملہ کو بےحد سنگین بنا دیتا ہے۔اس کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی ماتحتی میں دے دے۔اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ سخت ترین سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔

کرنے کا کام کیا ہے، اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو اور دوسرے بندگان خدا کو آگ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ خدا کے پیغمبروں نے زندگی کی جو حقیقت بتائی ہے اس کے مطابق زندگی کا اصلی مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا، یہی موجودہ دنیا میں کرنے کا اصل کام ہے۔ اس کے سوا جو مطلوب چیزیں ہیں وہ سب اسی کام کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

مقبولیت کا راز

بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin) اپنے بچپن میں نااہلی (tactlessness) کے لیے مشہور تھا۔ مگر بعد کو اس نے اتنا مقام پیدا کیا کہ وہ امریکا کی طرف سے فرانس میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ اس کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ صرف یہ کہ تجربات سے اس نے جانا کہ لوگ اپنے خلاف تنقید سے بہت برہم ہوتے ہیں۔ اس نے طے کیا کہ میں کبھی کسی کی کوئی خرابی نہیں بیان کروں گا۔ میں ہر ایک کی صرف خوبیاں بیان کروں گا:

I will speak ill of no man, and speak all the good I know of everybody.

یہی وجہ ہے کہ بااصول آدمی ہمیشہ سب سے زیادہ مبغوض ہوتا ہے اور بے اصول آدمی کو لوگوں کی نظر میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ بااصول آدمی ہمیشہ حق کہتا ہے، خواہ وہ کسی کے موافق ہو یا کسی کے خلاف۔ جب کہ بے اصول آدمی ہر موقع کے لحاظ سے وہ بات کہتا ہے جس کو سن کر لوگ خوش ہو جائیں۔ سب کی پسند کی بات کہنے کی اسے یہ قیمت ملتی ہے کہ وہ سب کی نظر میں پسندیدہ شخص بن جاتا ہے۔

یہ طریقہ تاجر کے لیے یقیناً مفید ہے مگر وہ داعی اور مصلح کے لیے زہر کی حیثیت رکھتا

ہے۔اس طرح بولنے والے کے اندر وہ کردار ابھرتا ہے جس کو شریعت کی زبان میں منافق کہا گیا ہے۔وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو اندر سے کچھ ہوتا ہے اور باہر سے کچھ۔وہ دل میں ایک چیز کو حق سمجھتا ہے اور زبان سے اس کے خلاف بولتا ہے۔اس کی عقل اس کو ایک طریقہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے مگر محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کی خاطر وہ لوگوں کے سامنے دوسرے طریقہ کی وکالت کرتا ہے۔اس کی آنکھ اس کو جو چیز اندھیرے کی صورت میں دکھاتی ہے اس کو وہ اپنی زبان سے اجالا بنا کر پیش کرتا ہے۔ایسا انسان باعتبار حقیقت ایک مردہ انسان ہے۔اگرچہ بظاہر وہ زندہ اور خوش پوش دکھائی دیتا ہو۔

داعی خدا کا سفیر ہوتا ہے۔مگر دنیوی حکومتوں کے سفیر میں اور خدا کے سفیر میں بہت بڑا فرق ہے۔دنیوی حکومت کا سفیر وہ بات کہنے کے لیے بھیجا جاتا ہے جس سے لوگ خوش ہوں۔مگر خدا کا سفیر لوگوں کے سامنے اس لیے آتا ہے کہ انہیں وہ بات بتائے جس سے خدا خوش ہوتا ہے۔ایک مصلحت کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔دوسرا حق کے تقاضے کو سامنے رکھ کر بولتا ہے۔خواہ اس کی وجہ سے وہ لوگوں کے درمیان غیر مقبول ہو جائے۔

داعی کون

داعی پیغمبر نہیں ہوتا مگر وہ خدا کا پیغام دینے والا ہوتا ہے۔اس کو وہ بات کہنی پڑتی ہے۔جو خدا کی بات ہے۔اس کو وہ حق پیش کرنا ہوتا ہے جس میں غیر حق کی کوئی ملاوٹ شامل نہ ہو۔دعوت خدا کے بندوں کے سامنے خدا کی نمائندگی ہے اور خدا کی نمائندگی کبھی مصلحت اور ملاوٹ کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔

داعی وہ شخص بنتا ہے جس کے اوپر قرآن کے معانی اس طرح کھلیں جیسے کہ قرآن اس کے اوپر ازسرنو اتر رہا ہے۔داعی وہ شخص ہے جس کے لیے کائنات جبریل امین کی قائم مقام بن جائے۔وہ خدا کی دنیا میں اسی طرح خدا کا پیغام اخذ کرنے لگے جس طرح ریڈیو

سٹ نشرگاہ کے پیغام کو اخذ کرتا ہے۔سائنس داں کائنات میں قانون فطرت کو پڑھتا ہے۔داعی وہ ہے جو کائنات میں قانون ربانی کو پڑھنے لگے۔

دعوت خدا کے کلام کو انسانی کلام میں ڈھالنا ہے۔دعوت خدا کی اس تسبیح کو الفاظ کا روپ دینا ہے جو کائنات میں خاموش صورت میں بیان ہورہی ہے۔دعوت وہی دعوت ہے جس میں حق کو بالکل برہنہ صورت میں دکھادیا جائے۔ مگرحق کو برہنہ کرنے کے لیے داعی کوخود بھی "نذیر عریاں" بن جانا پڑتا ہے۔داعی بننا ہمیشہ اپنی ہلاکت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ انسان ہلاک ہوجاتا ہے اوراس کے اندر سے ایک نیا انسان ظہور میں آتا ہے اسی کا نام داعی ہوتا ہے۔داعی انسان کے روپ میں غیرانسان ہوتا ہے۔داعی لوگوں کے درمیان رہ کراپنے آپ کولوگوں سے جدا کرتا ہے،اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کا داعی بنے۔

داعی بننے کے لیے اپنے آپ کو حذف کرنا پڑتا ہے۔دین کو اپنا فخر بنانے کے بجائے دین کو اپنا درد بنانا پڑتا ہے۔اس کے بعد ہی کسی کو داعی کا مقام ملتا ہے۔دوسرے انسانوں کواس دین سے دلچسپی ہے جوآپ کا درد ہو۔ان کو اس دین سے دلچسپی نہیں ہوسکتی جوآپ کا فخر ہو۔دعوت اورفخر دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

داعیانہ اخلاق کی ضرورت

ایک شخص تاجر کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرے،دوسرا شخص دادا گیری کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہوتو دونوں کا اخلاق یکساں نہیں ہوسکتا۔تاجر کا اخلاق اورہوگا اور دادا گیری کرنے والے کا اور۔یہی معاملہ داعی کا ہے۔جوشخص یا گروہ حق کا داعی بنے ضروری ہے کہ اس کی اخلاقیات بھی اس کے مطابق ہوں۔اگر وہ زبان سے داعی ہونے کا

مدعی ہو مگر اس کا اخلاق غیر داعیانہ ہو تو وہ لوگوں کی نظر میں مسخرہ بن کر رہ جائے گا، وہ داعی کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

انتہائی لازمی طور پر ضروری ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان غیر دعوتی امور پر جھگڑے نہ کھڑے کیے جائیں۔ غیر دعوتی جھگڑے اس فضا ہی کو ختم کر دیتے ہیں جس میں داعی اپنی دعوت پیش کرے اور مدعو اس کو سنجیدگی اور ہمدردی کے ساتھ سنے۔

تاہم یہ دعوتی فضا داعی سے بہت بڑی قیمت مانگتی ہے۔ یہ قیمت صبر ہے۔ داعی کو ارادی اور شعوری طور پر یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ وہ نقصانات اور تکلیفوں پر صبر کرے گا۔ حضرت مسیح کے تمثیلی الفاظ میں مدعو اگر اس کا کرتا چھینے تو وہ اس کو اپنا چغہ بھی دینے کے لیے تیار رہے۔ مدعو اگر ایک کوس بیگار چلنے کو کہے تو وہ دو کوس بیگار چلا جائے۔ تاکہ کوئی غیر متعلق جھگڑا کھڑا ہو کر دونوں کے درمیان ایسی صورت نہ پیدا کر دے کہ سننے اور سنانے کا ماحول ہی ختم ہو جائے۔

ماں اپنے بچہ کو دوا کھلانا چاہتی ہو اور اس وقت بچہ کوئی دوسری ضد شروع کر دے تو ماں بچہ کی اس ضد کی راہ میں حائل نہیں ہوتی کیونکہ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دوا کھلانے کا کام رک جائے اور بچہ اور ماں کے درمیان ساری نزاع ایک غیر متعلق ضد پر ہونے لگے۔ اسی طرح داعی کو چاہیے کہ مدعو کے ہر وار کو اپنے اوپر سہتا رہے تاکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی فضا قائم رہے اور داعی اپنی اصل بات کو مدعو کے دل میں اتار سکے۔ مدعو گروہ سے دوسری دوسری شکایتوں پر کش مکش صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے ذہنوں میں اپنے داعی ہونے کا شعور ختم ہو گیا ہو۔ جنھوں نے اپنی داعیانہ حیثیت کھو دی ہو اور وہ دوسری قوموں کی طرح محض ایک قوم بن کر رہ گئے ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر سے داعیانہ شعور ختم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام سرگرمیاں بالکل قومی بن کر رہ گئی ہیں۔ اس روش نے مسلمانوں کو خدا کی نصرت

سے محروم کر دیا ہے۔ کیونکہ خدا کی نصرت دعوت الی اللہ کے لیے اٹھنے والوں کو ملتی ہے نہ کہ قومی جھگڑا کرنے والوں کو۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لیے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سچائی کا تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کررہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہیے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مرجاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مرکر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لامحدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لامحدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لامحدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کرسکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لیے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہوکر اپنے بارے میں ہمیں بتادے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لیے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنالے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لیے جنت اور جو لوگ آزادی پاکر سرکش بن جائیں ان کے لیے جہنم۔

داعی بننا

داعی بننا خدا کا پیغام بر بننا ہے۔ خدا کا پیغام بر وہی بن سکتا ہے جو خدا سے پاکر بولے اور خدا سے سن کر کلام کرے۔

خدا ملفوظ کلام میں بھی بولتا ہے اور غیر ملفوظ کلام میں بھی۔ خدا کا ملفوظ کلام رسولوں کے لیے خاص ہے اور وہ آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہوگیا۔ موجودہ دنیا میں اب خدا کسی سے ملفوظ زبان میں کلام کرنے والا نہیں۔

مگر خدا کا غیر ملفوظ کلام بدستور جاری ہے۔ جس طرح کسی شخص کے پیغمبر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو خدا کا ملفوظ کلام پہنچے۔ اسی طرح داعی وہی شخص بن سکتا ہے جو خدا کے غیر ملفوظ کلام کا آخذ (Recipient) ہو۔ جس کو خدا کا غیر ملفوظ کلام مسلسل مل رہا

ہو۔ کوئی شخص وحی کے بغیر پیغمبر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص خدا کا داعی نہیں بن سکتا جب تک اس کی رسائی خدا کے غیر ملفوظ کلام تک نہ ہو جائے۔

خدا ہواؤں کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتا ہے۔ خدا چڑیوں کی صورت میں اپنا نغمہ بکھیرتا ہے۔ خدا دریا کے تموج کے ذریعہ آواز دیتا ہے اور سورج کی روشنی کے ذریعہ اپنی مرضی سے مطلع کرتا ہے۔ وہی شخص داعی ہے جو خدا کے ان اعلانات کو سن کر اسے دوسروں کو سنانے کے لیے اٹھے۔ جو شخص اس کے بغیر خدا کا داعی بن کر کھڑا ہوا جائے وہ خدا کا مجرم ہے، نہ کہ خدا کا داعی۔

داعی حقیقتاً وہ ہے جس کے بارے میں خدا کے فرشتے گواہی دیں کہ خدایا تیرا یہ بندہ وہ ہے جو دوسروں کو وہ چیز دینے کے لیے اٹھا جس کو اس نے تجھ سے پایا تھا۔ تو آسمانوں کے ذریعہ جس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا اس کو اس نے سنا اور تیرے بندوں کو اسے سنایا۔ تو نے سورج اور چاند کے ذریعہ جس ہدایت کو کھولا اس کو تیرے بندے نے پڑھا اور لوگوں کو اسے پڑھوایا۔ تو درختوں اور پہاڑوں کے ذریعہ اپنی جس مرضی کو ممثل کر رہا تھا۔ اس کو اس نے پہچانا اور لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔

دعوت کا عمل ایک انتہائی زندہ عمل ہے۔ داعی کو ہر روز نئی چیز دریافت کرنا چاہیے۔ اس کو ہر روز خدا کا نیا فیضان ملنا چاہیے۔ ساری کائنات کو اس کے لیے نہ ختم ہونے والا دستر خوان بن جانا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو داعی جمود کا شکار ہو جائے گا۔ اور جو شخص جمود کا شکار ہو جائے وہ خود موت سے دو چار ہو چکا ہے۔ وہ دوسروں کو زندگی کا پیغام کیا دے گا۔

غلط فہمی

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے جب فرعون مصر کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو اس نے کہا کہ تم دونوں چاہتے ہو کہ زمین میں بڑائی تمھارے لیے ہو (یونس، 10:78)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی دعوتی تقریر میں صرف خدا کی بڑائی بیان کی تھی پھر فرعون نے اس کو اس معنی میں کیوں لے لیا کہ موسیٰؑ اور اس کے بھائی خود اپنی بڑائی چاہتے ہیں۔ اس نے خدا کی بڑائی کی بات کو خود متکلم کی بڑائی کے ہم معنی کیوں سمجھ لیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فرعون خدا کی بڑائی سے واقف نہ تھا۔ وہ صرف انسان کی بڑائی کو جانتا تھا۔ اس کو بس اتنی ہی خبر تھی کہ انسان بڑے ہوا کرتے ہیں۔ اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ خدا سب سے بڑا ہے۔

ایسے لوگوں کی طرف سے دعوت حق کا ردعمل ہمیشہ اسی شکل میں ہوتا ہے۔ وہ خدا کی بڑائی سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے داعی جب خدا کی بڑائی بیان کرتا ہے تو وہ اس کو اس کے سوا کسی اور معنی میں نہیں لے پاتے کہ داعی خود اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے۔

وہ بے آمیز سچائی کو نہیں جانتے۔ وہ صرف اس سچائی سے آشنا ہوتے ہیں جس کے اوپر ان کی محبوب شخصیتوں کی مہر لگی ہوئی ہو۔ اس لیے داعی جب ان کے سامنے بے آمیز سچائی بیان کرتا ہے جس کے اوپر خدا کی مہر لگی ہوئی ہو تو اس کو وہ پہچان نہیں پاتے۔ اس کو وہ داعی کے اپنے احساس برتری پر محمول کر کے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

وہ برتر صداقت سے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ صرف اس صداقت کو جانتے ہیں جو ان کے قومی تقاضوں کے ساتھ لپٹی ہوئی ہو۔ اس لیے داعی جب برتر صداقت کا اعلان کرتا ہے تو اس کو سن کر وہ متوحش ہو جاتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی بھی کوئی صداقت ہو سکتی ہے جو ان کے قومی عزائم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہو۔

ایسے لوگ اپنی بے خبری کا الزام داعی کے اوپر ڈال دیتے ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ کبر میں مبتلا ہے۔ وہ اپنا نام بلند کرنا چاہتا ہے۔ داعی خدا کی بڑائی کا اعلان کرتا ہے اور بے خبر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ داعی خود اپنی بڑائی کا اعلان کر رہا ہے۔ داعی خدا کی ذات کمال کی حمد بیان کرتا ہے مگر بے خبر لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنی خودستائی میں مشغول ہے۔ داعی حق کی یکتائی پر زور دیتا ہے اور بے بصیرت لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنی انانیت کا اظہار کر رہا ہے۔

حق کی دعوت

آج کل ہر آدمی دعوت حق کا نام لیتا ہے مگر دعوت حق ابھی تک وجود میں نہیں آئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کی قیمت ادا کرنا نہیں چاہتے۔ ہر چیز کی ایک کی قیمت ہوتی ہے اور دعوت حق کی بھی ایک قیمت ہے۔ جب تک وہ قیمت ادا نہ کی جائے دعوت حق کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔

حق کی دعوت دینے کی لازمی شرط یہ ہے کہ غیر حق کو چھوڑ دیا جائے — خدا کی بڑائی بیان کرنے کے لیے اٹھنا اور انسانوں کی بڑائی میں گم رہنا، آخرت کا داعی بننا اور دنیا کے مفادات کے لیے قوموں سے کش مکش کرنا، ابدی مسائل کی بات کرنا اور اسی کے ساتھ وقتی مسائل میں الجھے رہنا، یہ سب تضاد کی باتیں ہیں اور جو لوگ اپنے اندر تضاد لیے ہوں وہ کبھی حق کے داعی نہیں بن سکتے۔

اس قسم کا ہر واقعہ بتاتا ہے کہ لوگ "داعی حق" کا ٹائٹل لینے کے لیے تو دوڑ پڑے ہیں مگر وہ اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

لوگوں کو اپنی مفروضہ شخصیتیں اتنی زیادہ محبوب ہیں کہ ان پر ادنیٰ تنقید سننا بھی انہیں گوارانہیں۔لوگوں کو اپنے دنیا کے مفادات اور مصلحتوں سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ ان کوکسی حال میں چھوڑنا نہیں چاہتے۔جوقومیں اسلام کے پیغام رحمت کی مخاطب ہیں ان سے وہ قومی اورمادی لڑائی چھیڑ کر انہیں اسلام سے بدکائے ہوئے ہیں۔اس قسم کی چیزوں کے ساتھ حق کی دعوت کا نام لینا صرف یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی حق کی دعوت کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔

حق کی دعوت ابدی صداقتوں کی دعوت ہے۔حق کی پکار خدااورآخرت کی پکار ہے۔یہ ایک نہایت نازک کام ہے جس کے ساتھ کوئی دوسرا کام جمع نہیں ہوسکتا۔

حق کا داعی لوگوں کوموت اورقیامت کے بھیانک مسئلہ سے آگاہ کرتا ہے۔اس کوہر واقعہ میں آخرت کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔وہ گرمی کی شدت دیکھتا ہےتو اس میں اس کو نارجہنم کی شدت دکھائی دیتی ہے۔اس کو معاشی تکلیف کا سامنا ہوتا ہےتو وہ بھی اس کو آخرت کی تکلیف یاد دلانے والا بن جاتا ہے۔وہ لوگوں کو "ظلم" کے خلاف چیختے ہوئے دیکھتا ہےتو کہتا ہے کہ لوگو،اس دن کو یاد کروجب تمہارے پاس زبان بھی نہ ہوگی کہ تم بولواور پانی کاایک گلاس بھی نہ ہوگا جس سے تم اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کرو۔

آخرت کی پکار

ایک مسئلہ آدمی کے ذہن پر بہت زیادہ چھایا ہوا ہوتو دوسرے تمام مسائل سے اس کی نظریں ہٹ جاتی ہیں۔وہ اپنے مخصوص مسئلہ کا اس طرح مبلغ بن جاتا ہے جیسے کہ بس وہی سارا مسئلہ ہے۔اس کے سوا کسی اورمسئلہ کا کوئی وجود نہیں۔

کارل مارکس کے ذہن پر "معاش" کا مسئلہ چھا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب،

اخلاق،فلسفہ،ہر دوسری چیز کواس نے نظر انداز کردیا۔ ٹالسٹائی کے ذہن پر "انسانیت" کا غلبہ تھا۔اس نے انسانیت کی باتیں اس طرح بتکرار کہیں گویا دوسرے سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں۔ ہندستان میں بہت سے لیڈروں پر آزادی وطن کا خیال چھا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری تمام چیزیں ان کے یہاں غفلت کے خانہ میں چلی گئیں۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں حق کے داعی کا ہے۔حق کے داعی کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت آخرت کی ہوتی ہے۔وہ جہنم سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور جنت کا سب سے زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔اس کے قدرتی نتیجہ کے طور پر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام مسائل اس کی نظر میں ایسے بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کا کوئی وجود نہیں۔

مزدور اور صنعت کار کے معاملات کیا ہیں۔ملک پر کس شخص یا کس قوم کی حکومت ہے۔عہدوں کی تقسیم میں کس کو زیادہ حصہ مل رہا ہے اور کس کو کم۔ایک قوم نے دوسری قوم کے خلاف کیا جارحانہ منصوبے بنا رکھے ہیں۔اس طرح کی تمام چیزیں داعی حق کی نظر میں غیر اہم ہوتی ہیں۔دنیا کے مسائل اس کے لیے اسی طرح نا قابل ذکر بن جاتے ہیں جس طرح عام قائدین کے لیے موت اور آخرت کے مسائل نا قابل ذکر بنے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں صرف دو ہی پکاریں ہیں۔ایک دنیا کی پکار، دوسری آخرت کی پکار، آج تمام پکارنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ لوگوں کو دنیا کی طرف بلا رہے ہیں۔وہ لوگوں کو سیاسی اور معاشی اور سماجی خطرات سے آگاہ کررہے ہیں۔بظاہر ان میں سے کوئی سیکولر اصطلاحوں میں بول رہا ہے اور اور کوئی مذہب کی اصطلاحوں میں۔مگر حقیقت کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔کیوں کہ سب کے سب دنیا کے مسائل کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔

نازک سوال

آرتھر کوئسلر موت کی طرف سفر کو نامعلوم ملک (Unknown Country) کی طرف سفر کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا سب سے عجیب اور پراسرار واقعہ ہے۔ ہر آدمی متجسس ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ مر کر وہ کہاں پہنچنے والا ہے۔

امریکا کے مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گرہم (1918-2018) کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے مسرت کا راز (*The Secret of Happiness*) اس کتاب میں بلی گرہم نے لکھا ہے کہ ایک بار مجھے دنیا کے ایک بہت بڑے لیڈر کا ارجنٹ پیغام ملا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملاقات کرو۔

میں روانہ ہو کر مذکورہ لیڈر کے یہاں پہنچا۔ جب میں لیڈر سے اس کے دفتر میں ملا تو وہ فوراً مجھے الگ کمرہ میں لے گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں کہا:

> I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the Unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھودی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص، کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو۔

موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بہر حال جلد ہی مر جاؤں گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "موت کے بعد کیا ہونے والا ہے" اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی

کرن پالے جوموت کے بعد آنے والے حالات میں اس کی زندگی کو تابناک کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر اسی امید کی روشنی کو دینے کے لیے آئے۔ پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ موت کے بعد ایک اور دنیا ہے جو ابدی بھی ہے اور معیاری بھی۔موت کے بعد کی اس کامل دنیا میں اس کو داخلہ ملے گا جوموت سے پہلے کی دنیا میں صالح اعمال سے اس کا استحقاق ثابت کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں۔موت دوسری دنیا کی طرف ایک چھلانگ ہے۔موت ایک زندگی سے دوسری زندگی کی طرف سفر ہے۔کامیاب انسان وہ ہے جس کی موت اس کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔

داعی بننے کے لیے

مائیکل فیراڈے (1791-1867ء) اور لارنس براگ (1890-1971ء) عہد جدید کے بہت کامیاب معلم سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لندن کے رائل انسٹی ٹیوٹ میں لکچر دیا کرتے تھے۔

کامیاب لکچر کا راز کیا ہے،اس کے بارے میں دونوں کی یادداشتیں شائع ہوئی ہیں۔ہم بالترتیب دونوں کا ایک ایک فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں جو گویا ان کے تجربات کا خلاصہ ہے۔

I am sorry to say that the generality of mankind cannot accompany us one short hour unless the path is strewn with flowers.

میں افسوس کے ساتھ یہ کہوں گا کہ بیشتر انسان ایک گھنٹہ کے مختصر وقت میں بھی ہمارے ہم سفر نہیں بن سکتے الّا یہ کہ راستہ پھولوں سے سجا دیا گیا ہو۔

The essential feature for success of the lecture is the emotional contact between the lecturer and the students.

لکچر کی کامیابی کے لیے ضروری بات یہ ہے کہ استاد اور طالب علم کے درمیان جذباتی ربط قائم ہو جائے۔

فیراڈے اور براگ نے جو بات کامیاب معلم بننے کے لیے لکھی ہے، وہی زیادہ شدت کے ساتھ کامیاب داعی بننے کے لیے ضروری ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق بے حد نازک تعلق ہے۔ وہ اس وقت تک قائم نہیں ہوسکتا جب تک اس کی نزاکتوں کی پوری رعایت نہ کی جائے۔ اپنے مدعو کو اپنا ہم سفر بنانے کے لیے آپ کو اس کے راستہ میں پھول بکھیرنا ہوگا۔ راستہ میں کانٹے اور پتھر بچھا کر آپ مدعو کو اپنا ہم سفر نہیں بنا سکتے۔

اسی طرح اپنی بات کو اس کے لیے قابل سماعت بنانے کی خاطر آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس کو اتنے موثر انداز میں کہیں کہ آپ کی بات محض ایک خشک تلقین نہ معلوم ہو بلکہ وہ سننے والے کے لیے ایک ایسا تجربہ بن جائے جس میں وہ اپنے لیے ایک کیفیاتی کشش پاتا ہو۔

حق کی پکار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تم مرو گے۔ اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔ یہ سن کر ابو لہب نے کہا، تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہم کو اسی لیے بلایا تھا:

تَبًّا لَكَ أَمَا جَمَعْتَنَا إِلَّا لِهَذَا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 208)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ کے سردار بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے اسی قسم کی تقریر فرمائی۔ اس وقت بھی آپ کے پاس کہنے کی جو سب سے

بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ اے لوگو! اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو:

اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر1417)۔

ہمارا مقصد اسی پیغمبر انہ دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ لوگ مسائل زندگی کے لیے اٹھتے ہیں۔ ہم مسائل موت کے لیے اٹھے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے۔ لوگوں کو جنگ اور فساد کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ہوں تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے کر دنیا والوں کو جہنم کے شعلوں سے ڈرائے۔

لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم ان انسانوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کو قبرستان کے ویرانے دکھائی دیں۔ ایسے انسانوں سے دنیا پٹی، ہوئی ہے جن کو یہ محرومی بیتاب کیے ہوئے ہے کہ ان کو کسی ادارہ میں داخلہ نہیں ملا۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو یہ غم بدحواس کردے کہ کہیں وہ جنت کے داخلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ لوگ دنیا کی بربادی کا ماتم کررہے ہیں۔ ہم ان انسانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جو آخرت کی بربادی کے اندیشے میں دیوانے ہو چکے ہوں۔

خدا کی دنیا میں آج سب کچھ ہورہا ہے۔ مگر وہی ایک کام نہیں ہورہا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ اگر انسان اس پکار کے لیے نہ اٹھیں تو اسرافیل کا صور اسے اٹھائے گا۔ مگر آہ، وہ وقت جاگنے کا نہیں ہوگا۔ وہ ہلاکت کا اعلان ہوگا نہ کہ آگاہی کا الارم۔

یہ انسان

حضرت مسیح کے وعظوں میں سے ایک وعظ میں داعی اور مدعو کی تمثیل ہے۔ یہاں ہم اس تمثیل کا عربی اور اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

بِمَنْ أُشَبِّهُ هَذَا الْجِيلَ؟ إِنَّهُمْ يُشْبِهُونَ أَوْلاداً جَالِسِينَ فِي السَّاحَاتِ الْعَامَّةِ، يُنَادُونَ أَصْحَابَهُمْ قَائِلِينَ: زَمَّرْنَا لَكُمْ ،فَلَمْ تَرْقُصُوا! وَنَدَبْنَا لَكُمْ ،فَلَمْ تَبْكُوا (متی، 17-11:16)۔ترجمہ: پس اِس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں۔ہم نے تمہارے لیے بانسری بجائی اور تم نہ ناچے۔ہم نے ماتم کیا اور تم نہیں روئے۔

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔اس طرح اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن وکمال کی تجلیاں ہوتی ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے۔دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رلادیں۔داعی خدا کے جمال وجلال کا مظہر ہوتا ہے۔مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے،مگر اس وقت بھی وہ خدا کو نہیں پاتا۔اس میں نہ حمد خداوندی کی کیفیات جاگتیں اور نہ خوف خدا سے اس کی آنکھیں تر ہوتیں۔وہ نازک ترین پیغامات کو بھی پتھر کی طرح سنتا ہے نہ کہ اس انسان کی طرح جس کو خدا نے وہ عقل دی ہے جو باتوں کی گہرائی کو پالے اور وہ دل دیا ہے جو درد سے تڑپ اٹھے۔

خدا کی طرف سے پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں

آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہونا ہے جس کی شدت آتش فشاں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا شاید یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو متاثر نہیں کرتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے "نذیر عریاں" بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں، پھر بھی وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے، پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، پھر بھی وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔ انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی، مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی کوئی نہیں دیتا۔

کائنات اللہ کی تخلیق ہے۔ پوری کائنات
اللہ کی حمد کر رہی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ زبانِ
حال سے یہ اعلان کر رہا ہے کہ — اللہ سب
سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے۔ انسان
سے بھی یہی مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی بڑائی کا
اعتراف کرے۔ 'اللہ اکبر' پوری کائنات کا
کلمہ ہے اور 'اللہ اکبر' انسان کا کلمہ بھی۔

PDF

Buy

ISBN 978-81-7898-722-4

9 788178 987224

Goodword Books
CPS International